لسانی مسائل

ڈاکٹر شوکت سبزواری

لسانی مسائل

ڈاکٹر شوکت سبزواری

★

مکتبہ اسلوب

۵۲/۳ - مسلم لیگ کوارٹرز - ناظم آباد

کراچی

کتب خانہ انجمن ترقی اردو

سلسلہ مطبوعات مکتبہ اسلوب نمبر ۵

اشاعت اول
۱۹۶۲ء
تعداد
ایک ہزار
طابع
انجمن پریس کراچی
ناشر
عبدالسلام عارف - مہتمم مکتبہ اسلوب
قیمت
چھ روپے

جملہ حقوق محفوظ

پیشِ لفظ

کسی زبان کی ترقی کے لئے یہ بھی کچھ کم اہم نہیں کہ ہم اس کی معرفت حاصل کریں۔ اور یہ معرفت اس وقت حاصل ہوتی ہے جب زبان کا حسب ونسب معلوم ہو، اس کے تاریخی ارتقا کے مختلف دور ہم جانتے ہوں، اس کے مزاج داں اور فطرت شناس ہوں۔ زبان سے پوری پوری واقفیت کے بعد ہی ہم اس کی ترقی کے مسائل سے آگاہ ہو سکتے اور اس کو آگے بڑھانے کے لئے کچھ کر سکتے ہیں۔

میں نے اولاً "اُردو زبان کا ارتقا" لکھا جس میں اُردو کی تاریخ کے ارتقائی دوروں کی نشاندہی کر کے اس کے حسب ونسب کا کھوج لگایا گیا تھا۔ اس کے بعد "داستان زبان اردو" میں اس امر کی کوشش کی کہ اردو کے مزاج ومنہاج اور اس کی فطرت بتاؤں اور اس کے آغاز ارتقا کے ان گوشوں کو جو ہنوز تاریکی میں ہیں روشن کروں۔ ان کتابوں کی تالیف وتسوید کے دوران میں اردو کی سرشت، ساخت اور تاریخ سے متعلق کچھ اور مسائل میرے سامنے آئے جو ان کتابوں میں جگہ نہیں پا سکے تھے یا اچھی طرح واضح نہیں ہوئے تھے یا اپنی نوعیت اور انداز بحث کے اعتبار سے ان میں جگہ نہیں پا سکتے تھے۔ ان پر میں وقتاً فوقتاً لکھتا رہا اور انھیں ملک کے معیاری علمی وادبی رسالوں میں شائع کراتا رہا۔ ان میں سے بعض مقالات

کے حوالے قارئین کرام کو ارتقا اور داستان کے متن یا ذیل میں ملیں گے۔

ان مقالات کی اہمیت کا تقاضا تھا کہ انھیں یکجا کر کے شائع کر دیا جائے تاکہ ان تک قارئین کی رسائی ہو سکے۔ بعض مقالات ان میں ایسے بھی ہیں جو کہیں شائع نہیں ہوئے۔ "لسانی مسائل" کا خلا پر کرنے کے لئے لکھے گئے ہیں۔ ان مقالات کی وجہ سے اس مجموعے کو ایک مستقل اور آزاد تصنیف کی حیثیت حاصل ہو گئی ہے یا کم سے کم ان میں وہ ترتیب پیدا ہو گئی ہے جو مستقل تصنیف کے ابواب میں ہوتی ہے

اس مجموعے میں جو مقالات شامل ہیں ان کی دوگونہ اہمیت ہے اپنی جگہ وہ اہم ہیں اس لئے کہ اردو زبان کے بہت سے اہم مسائل کو روشنی میں لاتے اور اس کی زندگی اور تاریخ کے بعض گوشوں کو بے نقاب کرتے ہیں جن پر دبیز پردے پڑے ہوئے تھے۔ 'ارتقا' اور 'داستان' کے اعتبار سے بھی وہ اہم ہیں کہ جہاں ان کتابوں کے خلا کو پر کرتے ہیں وہاں ان کے اجمال کی تفصیل اور ابہام کی توضیح بھی ان مقالات سے ہو جاتی ہے۔

میں اپنی علمی نارسائی اور کوتاہی کے اعتراف کے ساتھ اس مجموعے کو پیش کر رہا ہوں۔ اگر اس سے اُردو کی کوئی خدمت ہوئی تو میں اپنے کو خوش قسمت سمجھوں گا۔

شوکت سبزواری

ترقی اُردو بورڈ، کراچی

فہرست

پیش لفظ	
قواعد و لسانیات	
لسانی مسائل	۷
اردو قواعد کی ترتیب نو	۱۶
اردو الفاظ عامہ کی آپ بیتی	۳۲
اردو کی صرفی نحوی استواری	۴۹
"نے" کی سرگزشت	۶۱
"جیسا" کی سرگزشت	۸۹
"کی" کی جگہ "کے" کیوں	۹۶
اردو کی مفعولی ضمیریں	۱۱۰
احوال اسم	۱۱۸
اردو زبان کا ایک صوتی رجحان	۱۲۹
زبان اور رسم الخط	
اصلاح زبان اردو	۱۴۹
لکھنؤ کی زبان (۱)	۱۶۴
لکھنؤ کی زبان (۲)	۱۷۸
لکھنؤ کی زبان (۳)	۲۰۵
پاکستان کی قومی زبان	۲۳۱
اردو کے پچاس سال	۲۵۵
اردو کا رسم الخط	۲۶۹
لفظی تحقیق	
"باورچی" یعنی چہ ؟	۲۸۰
خودی میں خدائی	۲۸۴
روداد میز و میزبانی	۲۹۵

لسانی مسائل

لسانیات بالکل نیا لفظ ہے جیسے طبعیات و الٰہیات کی وضع پر لسان (زبان) سے اس طرح ڈھالا گیا کہ آخر میں نسبت کی ی، (مشدد) بڑھا کر عربی کی علامت جمع (ات) اضافہ کر دی گئی۔ لسانی کے معنی تھے زبان سے منسوب لسانیات کے معنی ہوئے زبان سے متعلق مسائل و مباحث۔ لسانیات ہر چند نیا لفظ ہے لیکن زبان سے متعلق بحثیں نئی نہیں۔ جب انسان کا شعور بیدار ہوا اور اس نے گرد و پیش پر ہوشمندانہ نظر ڈال کر ان کے بارے میں سوچنا شروع کیا تو اس کے دل میں زبان سے متعلق بے شمار سوالات پیدا ہوئے جن میں سے کچھ ایسے ہیں جن کا اس نے اپنی بساط اور ذہنی سطح کے مطابق جواب بھی دیا۔ یہ اور بات ہے کہ یہ جواب خود اس کے لئے اطمینان بخش نہ تھا سوالات پیدا ہوتے رہے جوابات دئے جاتے رہے۔ الجھنوں کے ساتھ سلجھاؤ۔ یہ اور دقتوں کے ساتھ ان کے حل نکلتے رہے۔ یہ سلسلہ قدیم سے ہے اس لئے لسانیات کو نیا نہیں کہا جا سکتا۔

قدیم زمانے میں لسانیات کو گرامر (صرف نحو) یا علم اللغتہ یعنی علم اللسان

کہا جاتا تھا۔ اس وقت یہ علم سادہ اور اپنی عمر کی ابتدائی منزلوں میں تھا۔ اس کے مسائل گرامر اور لغت کے مسائل و مباحث سے گڈمڈ تھے حدِ فاصل نہ ہونے کی وجہ سے ان کے درمیان امتیازی خط نہیں کھینچا جاسکتا تھا لسانیات نے ایک قدم آگے رکھا اور گرامر کی چہار دیواری توڑ کر باہر آئی تو اس کا نام علم اللغۃ (زبان کا علم) کی جگہ فقہ اللغۃ (زبان کا فلسفہ) قرار پایا۔ آج ہم گرامر کے اس اگلے قدم کو لسانیات کہتے ہیں۔ لسانی مسائل کا پہلا قدم گرامر تھا۔ دوسرا قدم قدیم زبان میں فقہ اللغۃ اور جدید زبان میں لسانیات ہے۔

لسانیات کا تعلق انسان کی زبان سے ہے اس لئے زبان لسانیات کا موضوع ہے۔ لسانیات میں زبان کے بارے میں ہر قسم کے سوالات کئے جا سکتے ہیں۔ اس میں اتنی ہی وسعت ہے جتنی انسان کی زبان میں ہے۔ زبان کی دو بڑی شاخیں ہیں۔ بسیط آوازیں جن سے زبان کے با معنی الفاظ بنتے ہیں اور ان آوازوں کی گوناگوں ترکیبیں۔ بسیط آوازوں کا علم صوتیات ہے اور آوازوں کی ترکیب و ترتیب کا فن اشتقاقیات (صوریات)۔ لفظ و معنی کے تعلق کی بھی بڑی اہمیت ہے۔ جس شعبہ لسانیات میں اس تعلق سے بحث کی جائے اسے معنویات کہتے ہیں۔ لسانیات کی یہ تقسیم اجزائے زبان کے لحاظ سے ہے مسائل و مباحث کے لحاظ سے اس کی اور بھی کئی قسمیں ہیں۔ اس فرصت میں مجھے لسانیات کی فن کی حیثیت سے وضاحت کرنی ہے اس لئے اس کی انہی قسموں پر اکتفا کروں گا۔

زبان کی بسیط آوازوں سے گرامر میں بحث کی جاتی ہے۔ اسے علم الہجا کہتے ہیں۔ اشتقاق علم صرف کا موضوع ہے جہاں یہ بتایا گیا ہے کہ کسی لفظ یا مادے سے الفاظ اور صیغے کس طرح وضع کئے جائیں اور "کر" سے کرنا، کرتا، کیا، کریگا،

کرنے والا یہ تمام صیغے کیسے اور کیوں کر ڈھلیں۔ اسی طرح لفظ و معنی کا تعلق لغت یعنی فرہنگ و قاموس سے بھی ہے۔ پھر ان میں اور لسانیات کی مذکورہ بالا تین قسموں میں کیا فرق ہوا؟ اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ موضوع کی حد تک تو ان میں اور لسانیات میں کوئی فرق نہیں۔ ان کے مباحث بھی وہی ہیں جو لسانیات کے ہیں۔ لیکن لسانیات چونکہ گرامر کا اگلا قدم ہے اس لئے اس میں گرامر سے زیادہ وسعت ہے اور ساتھ ہی گہرائی بھی۔ وسعت اس لحاظ سے ہے کہ لسانیات کے مسائل و مباحث نامحدود ہیں۔ ان میں زندگی کا سا تنوع ہے۔ اور گہرائی یہ ہے کہ گرامر میں موضوع سے سرسری بحث ہوتی ہے۔ لسانیات میں بال کی کھال نکالتے اور دقت نظر سے کام لے کر حقیقت تک رسائی حاصل کرتے ہیں۔ جب تک حقیقت دریافت نہ ہو لسانی ذوق جستجو آسودہ نہیں ہوتا۔

علم ہجا میں صرف یہ بتا دینا کافی ہے کہ مثلاً عربی میں انتیس [۲۹] حروف (یا آوازیں ہیں) اور وہ یہ ہیں۔ ان میں سے اتنے شمسی ہیں اور اتنے قمری۔ ان حروف کے نام بھی ہیں جن کا پہلا حرف اس کی آواز کو ظاہر کرتا ہے۔ مثلاً سین کہ س، اس کا پہلا حرف ہے۔ حروف کے مخارج اور ان کی صفات مختصر طور سے بیان کر دی جاتی ہیں اور بس۔

لسانیات کے شعبہ علم الاصوات (صوتیات) میں بسیط آوازوں سے بڑی جامع اور عمیق اور عام طور سے تین طرف سے بحث ہوتی ہے۔ تشریحی، تاریخی اور تقابلی۔ جب تک یہ تینوں گوشے بحث میں نہ آئیں حقیقت آئینہ نہیں ہوتی۔ تشریحی بحث میں آوازوں کے مخارج، تلفظ، ادا اور صفات کی وضاحت کی جاتی ہے۔ اور ہر آواز کی تاریخ دی جاتی ہے اور دوسری

متعلقہ زبانوں سے مقابلے کے بعد اس کے مختلف ارتقائی دوروں کو روشنی میں لایا جاتا ہے۔

یہی کیفیت اخذ و اشتقاق کی ہے۔ گرامر میں صرف یہ بتا دیا جاتا ہے کہ 'پڑھا'، مثلاً ماضی ہے اور صیغۂ واحد غائب جو مادۂ 'پڑھ' سے الف بڑھا کر وضع ہوا ہے۔ پڑھنا اس کا مصدر ہے۔ علم صرف کی حدیں ختم ہوئیں اس سے آگے وہ آپ کا ساتھ نہ دے گا۔ لسانیات آپ کو بتائے گی کہ 'پڑھ' کے اصلی معنی کیا ہیں؟ وہ کیسے بنا، کہاں بنا، اس کے معنی پڑھنا کیوں کر ہوئے اور پڑھا کس لئے ماضی کا صیغہ واحد غائب ہے؟ ان تمام سوالوں کا جواب دینے کے لئے لسانیات کو 'پڑھا' کی تشریح کے ساتھ اس کی تاریخ کا کھوج لگانا پڑے گا اور تاریخ کے لئے تقابل ضروری ہے اس لئے اردو کی ہمرشتہ قدیم و جدید سرمایہ کو کھنگال کر لسانیات یہ دیکھتی ہے کہ ان زبانوں میں ماضی کے صیغے کس طرح وضع ہوئے اور ان کے مختلف روپ کیا ہیں۔

اس سے ظاہر ہوا کہ لسانیات کے تشریحی، تاریخی، اور تقابلی تین بڑے شعبے ہیں جن پر وہ مشتمل ہے۔ یہ تینوں شعبے ایک دوسرے کے ہم عناں ہیں۔ لفظ کی تحقیق اور دریافت کے لئے بیک وقت لسانیات کے ان تینوں شعبوں سے کام لینا پڑتا ہے۔ ممکن نہیں کہ ان میں سے کسی ایک کو بھی نظرانداز کر دیا جائے۔

میں نے عرض کیا تھا کہ لسانیات کے مسائل و مباحث میں بڑی وسعت ہے۔ وہ زبان کے ہر پہلو کو لے کر اس پر بحث کرتی ہے۔ گرامر عام طور سے زبان کے وہی پہلو لیتی ہے جن کی کوئی عملی اہمیت ہے۔ یعنی جن کے جاننے اور سمجھنے سے زبان پر قدرت حاصل ہوتی ہے اور اس کو صحیح طور سے استعمال

کر کے خیالات کے اظہار کا موثر اور کسی قدر واضح آلہ بنایا جا سکتا یا ذریعہ اظہار کی حیثیت سے اس کی اہمیت اور افادیت کو روشن تر کیا جا سکتا ہے۔ لسانیات ایک طرح کی سائنس ہے۔ زبان اس کے نزدیک فطری مظاہر میں سے ہے۔ اسے زبان کے ہر پہلو سے دلچسپی ہے۔ وہ یہ بھی جاننا چاہتی ہے کہ زبان کب وجود میں آئی اور کیسے؟ وہ قدرت کی پیداوار ہے یا ضرورت کی یعنی عام فطری مناظر و مظاہر کی طرح فطرت نے اسے پیدا کیا یا انسان نے بقول شخصے ضرورت ایجاد کی ماں ہے اپنی گوناگوں سماجی ضرورتوں کے پیش نظر وضع کر لیا اور اگر انسان نے وضع کیا تو کسی ایک فرد واحد نے یا پورے سماج نے۔ بالارادہ وضع کیا یا بلا ارادہ، شعوری طور پر یا غیر شعوری طور پر۔ یہ اور اسی قسم کے متعدد اہم سوالات لسانیات کے سامنے ہیں جن کا اسے جواب دینا ہے۔ اور ان میں سے بعض کا اس نے جواب دیا بھی ہے۔ یہ زبان کی تاریخ کا صرف ایک پہلو ہے۔ اس کا ایک پہلو اور بھی ہے مثلاً یہ کہ زبان جامد ہے یا نامی یعنی جب سے وہ وجود میں آئی برابر ایک حالت پر قائم رہی یا نت نئے روپ بدل رہی ہے۔ اور اگر روپ بدل رہی ہے تو اس کا یہ روپ بدلنا تاریخی ارتقا ہے یا فطری نشو و نما اور اگر تاریخی ارتقا ہے تو فرد واحد کے اختیار و ارادے کا اس میں کس حد تک عمل دخل ہے۔

اس کے بعد زبان کے تغیرات کا سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ تغیرات کتنے ہیں اور کیوں ہیں۔ نحت یا تخریب صوتی کے مثلاً کیا اسباب ہیں۔ ان اسباب سے تفصیل کے ساتھ بحث ہوتی ہے۔ لسانی تغیرات کے سلسلے میں زبان کی ارتقائی تاریخ اور مختلف زبانوں کے رشتے سامنے آتے ہیں جن کی بنا پر لسانیات ایک طرف زبان کی تاریخ کے مختلف دور بناتی ہے۔ دوسری

طرف ملتی جلتی متعدد زبانوں کے خاندان خانوادے گروہ اور زمرے قرار دیتی ہے۔ مثلاً بیس ۲۰ ایک لفظ ہے۔ اس کی اصلیت کا کھوج لگاتے لگاتے لسانیات، اس کی ایک قدیم شکل 'بیسی' تک پہنچی جو اردو کی ایک کہاوت "وہی تین بیسی وہی ساٹھ" میں ہے۔ سنسکرت "وِن شتِ" اور لاطینی "وگنتِ" سے ہو کر جو بیس کی قدیم ترین شکلیں ہیں جب اس کی نظر جدید فارسی بست اور انگریزی 'ٹوئنٹی' پر پڑی تو اس حقیقت کا انکشاف ہوا کہ بیس اصل میں دُوشتِ تھا (دُو = دو + شَتِ = دس یعنی دو دس یا بیس) کہیں شروع کی دال تخریب صوتی کی نذر ہوئی اور کہیں آخر کی 'ت۔ اس سے لسانیات نے نتیجہ نکالا کہ جن زبانوں میں یہ لفظ مختلف شکلوں میں موجود ہے ان کے درمیان قریب کی قرابت ہے۔ لیکن لسانیات زبانوں کے رشتوں اور قرابتوں کو دریافت کرنے کے لئے مفرد الفاظ کا کھوج نہیں لگاتی زبان کے صرفی وصوتی سرمایہ کی تحقیق کرتی ہے جو لسانی پیکر کے لئے گویا ریڑھ کی ہڈی ہے۔ اس کے بعد لسانی رشتوں کا سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ کتنی قسم کے ہیں۔ اور یہ سوالات برابر اسی طرح پیدا ہوتے رہتے ہیں۔

لسانیات کے ان متنوع اور رنگا رنگ مسائل کو دیکھ کر یہ رائے قائم کرنا دشوار نہیں کہ لسانیات فن نہیں سائنس ہے۔ کس قسم کی سائنس ہے؟ نفسیات وحیاتیات کی طرح طبعی سائنس ہے یا معاشیات واجتماعیات کے انداز کی تاریخی۔ ہنوز یہ طے نہیں ہوا۔ مشہور ماہر لسانیات میکس مولر اسے طبعی سائنس بتاتا ہے اور اس کا خواجہ تاش وہیٹنے اس پر مصر ہے کہ وہ تاریخی سائنس کا ایک شعبہ ہے۔ میں میکس مولر اور وہیٹنے کے اس اختلاف سے زیادہ زبان، وادب کے رشتے کو اہمیت دیتا ہوں۔ زبان اظہار خیال

کا ایک ترقی یافتہ ذریعہ ہے۔ سائنس داں کے نزدیک فطری مظہر کی حیثیت سے وہ اہم ہے۔ ادیب کے نزدیک ذریعۂ اظہار و بیان کے لحاظ سے۔ ادیب کا تعلق ادب سے ہے اور ادب زبان کے ذریعے وجود میں آتا ہے۔ اس لئے ادیب زبان سے بھی دلچسپی رکھتا ہے۔ لیکن اس کی دلچسپی ادب و زبان دونوں سے ایک عام قاری کی دلچسپی سے مختلف ہے۔ ادیب کی دلچسپی ایک طرح کی ہوشمندانہ اور بصیرت افروز دلچسپی ہے۔ ایک عام قاری بقول شخصے آم کھاتا ہے پیڑ نہیں گنتا۔ بات کرتا ہے تو اس پر غور نہیں کرتا کہ جس زبان میں بات کر رہا ہے وہ کب اور کہاں پیدا ہوئی۔ ادب پڑھتا ہے اور کوئی نثر پارہ یا شعر اسے پسند آتا ہے تو بار بار پڑھنے کے باوجود یہ نہیں سوچتا کہ نثر پارے یا شعر میں کیا خوبی ہے جس نے اس کے دامن دل کو کھینچا۔ بقول ایک نقاد کے وہ یہ نہیں دیکھتا کہ نقاد کی اس نثر پارے یا شعر کے بارے میں کیا رائے ہے اور وہ بھی اسے پسند کرتا ہے یا نہیں۔ اس کی پسند زیادہ تر ذاتی قسم کی ہوتی ہے۔ سماج سے زیادہ شخصی تاثر اس میں دخیل ہوتا ہے۔ اس کے مقابلے میں ادیب بات کے ہر پہلو پر نظر رکھتا ہے، ہر جملے کو پرکھتا اور ہر لفظ کی جانچ پرتال کے بعد قیمت متعین کرتا ہے۔ وہ آم ہی نہیں کھاتا پیڑ بھی گنتا ہے۔

ادیب کا یہ انداز نظر تنقید ہے۔ لسانیات بھی تنقید ہے۔ عام طور سے ادب کی تنقید کو تنقید کہتے ہیں۔ لسانیات زبان کی تنقید ہے۔ ادبی تنقید میں اسالیب بیان کو پرکھا جاتا ہے۔ لسانی تنقید میں زبان کے تعمیری عناصر کے اظہار و بیان پر اثرات دکھائے جاتے ہیں۔ اس کو ادب کی تنقید کی طرح عام تنقید میں جگہ ملنی چاہیے۔ تنقید تخلیق ہونے کے باوجود

سائنس ہے اور سائنس کی سی باقاعدگی، نظم و ضبط، ترتیب و تسلسل اس میں پایا جاتا ہے۔ لسانیات سائنس ہونے کے باوجود تخلیق ہے۔ اس میں تخلیق کی سی جدت، جودت، ندرت اور بداعت کے کرشمے نظر آتے ہیں۔ یہ خیال محال ایک برافگندہ نقاب حقیقت ہے جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ تنقید تجزیہ ہے۔ جب تک ادب کا تجزیہ نہ کیا جائے حسن کاری اور تخلیقی منزلوں کی وضاحت نہیں ہوتی۔ لسانیات کا دار و مدار ہی تجزیے پر ہے۔ وہ زبان، اس کے اجزا اور ضابطوں کا پوسٹ مارٹم کرتی ہے۔ تجزیے میں دونوں شریک ہیں۔ ادبی تنقید کا مقصد حسن کی دریافت اور اس کی باز آفرینی ہے۔ لسانی تنقید کی غایت حقیقت نفس الامری کا انکشاف اور اس کی بازیابی ہے۔ خالص تخلیق میں ذوق نظر سے کام لیا جاتا ہے اور تنقیدی تخلیق میں دقت نظر سے۔ اور یہی دقت نظر لسانی تحقیق و تنقید میں کارفرما نظر آتی ہے جدید تنقیدی نظریات کے مطابق دقت نظر کی بھی اتنی ہی اہمیت ہے جتنی ذوق نظر کی ہے۔ بلکہ شاعر مشرق علامہ اقبال کے نزدیک دقت نظر کے بغیر ذوق نظر نظر نہیں خبر ہے۔

اے اہل نظر ذوق نظر خوب ہے لیکن
جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا

بہرحال اس میں شبہ نہیں کہ لسانیات زبان کی تنقید ہے۔ اور اگر تنقید تخلیق ہے تو لسانیات کو بھی تخلیق کی ایک صنف قرار دینا ہوگا۔

مشہور ماہر لسانیات میکس مولر نے گرامر اور لسانیات پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ان میں "کیا" اور "کیوں" کا فرق ہے۔ گرامر کیا ہے اور لسانیات کیوں۔ گرامر لفظ اور کلمے کی شناخت کر کے بتاتی ہے کہ وہ کیا ہے۔ اسم ہے یا فعل

اسم ہے تو اسم ذات ہے یا اسم صفت۔ فعل ہے تو ماضی ہے یا مضارع ماضی ہے تو غائب کا صیغہ ہے یا حاضر کا۔ لسانیات یہ بتاتی ہے کہ اسم کیوں ہے۔ فعل ماضی کس لئے ہے۔ وہ الفاظ و کلمات کی شناخت نہیں کرتی ان کی حقیقت اور اصلیت کے چہرے سے نقاب اٹھاتی ہے۔ ان کی زندگی کے مختلف دوروں کی نشان دہی کرتی ہے۔ گرامر کی شناخت ناقص اور نامکمل تھی لسانیات اسے مکمل بناتی ہے۔ اس میں بھی وہ ادبی تنقید کے ہمدوش اور ہم عناں ہے۔ ادبی تنقید کا کام بھی یہی ہے کہ وہ ادب پارے کی نقاب کشائی کرے اور اس کے جمال جہاں نما کے جلوے اہل نظر کو دکھائے۔

اردو قواعد کی ترتیب نو

زبان اظہار خیالات کا ایک آلہ ہے اور محض اظہار خیال کے لئے اس کا حکمیاتی مطالعہ ضروری نہیں۔ بس اس قدر کافی ہے کہ الفاظ کے معنی مفردات کا جوڑ، جملوں کی ترکیب، اور ان کا باہمی تعلق اچھی طرح سمجھ لیا جائے۔ یہ زبان کا سرسری مطالعہ ہے۔ زبان کا دقیق اور عمیق مطالعہ بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ زبان کے ڈھانچے کو اچھی طرح دیکھا جائے۔ اور اس کے ترکیبی اجزا پر نظر ڈالی جائے۔ لفظ کا معنی سے تعلق، ایک لفظ کا دوسرے سے رشتہ، ترکیب الفاظ و تالیف جُمل سے متعلق تمام ضروری اصول اور قاعدے، وہ مخصوص ضابطے جو زبان کو حرکت و حیات عطا کرتے ہیں، ان ضابطوں اور قاعدوں کی ارتقائی تاریخ اور دوسری ہم رشتہ زبانوں کے مخصوص قاعدوں سے ان کا تقابل ان تمام چیزوں سے بحث کی جائے۔ حکمیاتی مطالعہ ایک طرح کا تجزیاتی مطالعہ ہے جس میں منطقی اصول

کے مطابق جو چیز زیر مطالعہ ہوتی ہے تحلیل کے بعد اس کے ترکیبی اجزا نکال لئے جاتے ہیں اور ان اصول کو دریافت کیا جاتا ہے جو ان اجزا کی ترکیب میں حصہ لیتے ہیں اور ان اسرار و رموز تک رسائی حاصل کی جاتی ہے جو اس مرکب کی حیات و بقا کے لئے ذمہ دار ہیں۔

زبان بھی ایک مرکب ہے۔ اس کے بھی ترکیبی اجزا د عناصر ہیں۔ کچھ اصول اور قاعدے ہیں جو ترکیبی اجزا کے میل ملاپ میں ان کی مدد کرتے ہیں۔ زبان کی زندگی اور نمو کا دار مدار اساسی اور بنیادی قاعدوں پر ہے۔ ان قاعدوں کو دریافت کرنا اور ان کا ٹھیک ٹھیک کھوج لگانا گرامر ہے۔ کسی زبان کا حکمیاتی مطالعہ، جیسے سطور بالا میں دقیق و عمیق مطالعہ کہا گیا ہے، گرامر یعنی صرف و نحو کے بغیر ممکن نہیں، خصوصیت کے ساتھ اس علم و حکمت کے زمانے میں جب ہر چیز پر علمی اصول کی روشنی میں نظر ڈالی جا رہی ہے یہ ناممکن ہے کہ زبان کی گرامر کو نظر انداز کر دیا جائے اور اردو کا تحقیقی مطالعہ نہ کیا جائے۔

گرامر کا زبان سے وہی تعلق ہے جو لفظ کا معنی سے ہے۔ لفظ معنی کے ساتھ وجود میں آتا ہے۔ گرامر بھی زبان کے ساتھ ساتھ وجود میں آتی ہے۔ لفظ کی زندگی معنی سے ہے۔ زبان بھی صرفی و نحوی قاعدوں سے زندہ رہتی ہے اس لئے گرامر کو زبان کے پیکر لفظی اور اس کی ہیئت ترکیبی سے ہم الگ نہیں کر سکتے۔ زبان کا نمو اور ارتقا گرامر کے اصول و قواعد کے ماتحت ہوتا ہے جس طرح زبان کے بارے میں ہم کسی منزل پر پہنچ کر یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ تکمیل کو پہنچ گئی اور آئندہ اس کا ارتقا نہیں ہو سکتا۔ گرامر کے متعلق بھی جب تک زبان ارتقا کی راہ پر گامزن ہے ہم تکمیل اور قطعیت کا دعویٰ نہیں کر سکتے۔

زبان جب ارتقا کی اولین منازل میں ہوتی ہے تو اس کی کوئی ترشی

ترشائی گرامر نہیں ہوتی۔ زبان کے خام اور نا تمام حالت میں ہونے کی وجہ سے اس میں ایک سیال مادے کی سی کیفیت پائی جاتی ہے۔ جب تک اس میں پختگی نہیں آتی استقرار اور قیام پیدا نہیں ہوتا۔ اس منزل میں چونکہ زبان کا کوئی قرار وقیام نہیں ہوتا۔ الفاظ اور ان کی ترکیب میں کوئی ٹھہراؤ نہیں دیکھا جاتا اس لئے زبان کے بندھے ٹکے اصول بھی نہیں ہوتے۔ جب زبان کسی منزل پر پہنچ جاتی ہے اور اس میں ایک طرح کا ٹھہراؤ آجاتا ہے اور کثرت استعمال یا کسی ادبی شاہکار کی تصنیف کی وجہ سے اس کے کچھ اصول بن کر کٹ جاتے اور کٹ کر خشک ہو جاتے ہیں تو یہ اصول زبان کے مستقل اور باقی رہنے والے سرمایہ میں شامل ہو جاتے ہیں۔ اس وقت زبان کی مستقل حیثیت قائم ہوتی ہے اور وہ ایک خام حالت سے ترقی کر کے پختہ اور تمام حالت کو پہنچتی ہے۔ یہی زمانہ گرامر کی پیدائش کا روز اول ہوتا ہے۔ اس کے بعد زبان منزلوں پر منزلیں طے کرتی چلی جاتی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اس کے قاعدے بنتے، کٹتے، ترشتے اور خشک ہوتے چلے جاتے ہیں۔ جب زبان ارتقاء کے اتنے مراحل طے کر لیتی ہے جتنے ایک ترقی یافتہ اور شائستہ زبان کے لئے ناگزیر ہیں تو زبان کی ایک مستقل گرامر اور اس کے صرفی و نحوی اصول کا ایک قابل اہتمام مجموعہ تیار ہوتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ قواعد کے باوا آدم ڈنی سیس تھریکس نے گرامر کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے "گرامر نام ہے کسی زبان کے مسلمہ انشا پردازوں کی زبان سے عملی خبر و آگاہی کا۔ اس تعریف میں انشا پردازوں کی زبان" یہ الفاظ زبان کے کسی منزل پر ٹھہراؤ کا پتا دیتے ہیں اور یہ بتاتے ہیں کہ اس منزل پر پہنچنے سے پہلے زبان کے بندھے ٹکے اصول نہ تھے۔

اس سلسلے میں زبان کی ارتقائی تاریخ بھی بہت اہم ہے جس میں ان تمام

مراحل و منازل کا ذکر ہوتا ہے جن سے زبان کو گزرنا پڑتا ہے اور راہ ارتقار کے آثار اور مٹے ہوئے نقوش کو ابھار کر اور اجاگر کر کے ان کی نشان دہی کی جاتی ہے۔ یہ کام تاریخی گرامر کا ہے جو علمی گرامر کی ایک اہم شاخ ہے۔ تاریخی گرامر علمار لسانیات کے نزدیک یہ ہے کہ زبان کے ارتقار کے مختلف دوروں کا اس طرح مطالعہ کیا جائے کہ زبان کی پوری تاریخ، اس کا آغاز، درمیانی کڑیاں اور اس کا عروج و زوال یہ سب منزلیں آئینہ ہو جائیں۔ یہ ساری بحثیں جہاں تک زبان کی غرض و غایت کا تعلق ہے بے سود سی ہیں یعنی ان کے جاننے سے اظہار خیال میں کوئی قوت نہیں آتی اور نہ وضاحت میں کوئی اضافہ ہوتا ہے۔ اگر کوئی شخص اردو زبان کے آغاز، ارتقار اور اس کی ساخت سے باخبر نہیں لیکن الفاظ کے معنی اور ان کی ترکیب کے طریقوں کو جانتا ہے تو اس کی یہ بے خبری اس کے اظہار و بیان پر اثر انداز نہیں ہوتی۔ وہ اس بے خبری کے باوجود وضاحت کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار کر سکتا ہے اور شاید اسی طرح کر سکتا ہے جس طرح زبان کی تاریخ سے آگاہ ہونے کی صورت میں کر سکتا۔ عملی طور پر یہ لسانی بحثیں اور صرفی و نحوی نکتہ آفرینیاں بے کار ہیں اور کسی اجنبی زبان کے حاصل کرنے میں ہماری کوئی خاص مدد نہیں کرتیں۔ اس کے لئے عملی گرامر کافی ہے۔ یعنی زبان کے ان ابتدائی اور ضروری قاعدوں کو جاننا جو زبان کے روزانہ استعمالات اور لفظی تغیرات میں کارفرما ہوتے ہیں۔ مادری زبان کے لئے سرے سے گرامر جاننے کی ضرورت نہیں۔ علمی گرامر ہو کہ عملی۔

تاریخی گرامر کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ مطالعہ کرتے وقت زبان کے اپنے اصول اور محض اپنا سرمایہ الفاظ پیش نظر رہے۔ دوسرے یہ کہ دوسری متعلق یا غیر متعلق زبانوں کے اصول، الفاظ اور ان کی ارتقائی کڑیاں بھی ملحوظ رکھی

جائیں۔ دوسری صورت زیادہ عام، زیادہ ہمہ گیر اور علمی طور سے زیادہ مفید ہے اس کو دو حصّوں میں بانٹا گیا ہے۔ پہلا حصّہ جس میں متعلق یا ہم رشتہ زبانوں کا مطالعہ شامل ہے تقابلی گرامر کے نام سے موسوم ہے۔ دوسرے حصّہ میں چونکہ متعلق اور غیر متعلق سبھی زبانیں زیر بحث آجاتی ہیں اور اس طرح اس میں عمومیت کا رنگ پیدا ہو جاتا ہے اس لئے اہل علم اس کو عام یا آفاقی گرامر کہتے ہیں۔ یہاں گرامر اور لسانیات کی حدیں مل جاتی ہیں۔ دونوں کے مسائل و مباحث خلط ملط ہو جاتے ہیں اور بظاہر ان میں جو امتیاز نظر آتا ہے وہ رفع ہو جاتا ہے۔

یہ حقیقت بھی ہے کہ علمی گرامر اور لسانیات میں محض اعتباری فرق ہے ویسے دونوں ایک ہیں۔ گرامر نام ہے زبان کے عام اور مستقل اصول کا جو زبان کی تعمیر اور اس کے نشو و نما میں حصہ لیتے ہیں اور ان اصول و قواعد کا تاریخی، تقابلی اور تحقیقی مطالعہ لسانیات یا فقہ اللغۃ ہے۔ مباحث دونوں کے ایک ہیں۔ مطالعے کی نوعیت اور اس کی حیثیت کسی قدر مختلف ہے۔ اس اختلاف کی وجہ سے گرامر اور لسانیات جدا جدا دو صنف قرار دے دی گئی ہیں۔ جن کے ماتحت زبان کے حقائق تک رسائی حاصل کی جاتی ہے۔ الفاظ کا تاریخی ارتقا عام فطری اصول کے ماتحت ہوتا ہے۔ یہ اصول فطری ہونے کی وجہ سے ایک بڑی حد تک عام اور ہمہ گیر ہوتے ہیں۔ ان اصول کا مطالعہ لسانیات ہے۔ یہ اصول جب ذرا زیادہ عام کر دئے جاتے ہیں اور ہر چھوٹے سے چھوٹے اصول کو بھی ان میں شامل کر لیا جاتا ہے چاہے ان کی تاریخی اور علمی اہمیت ہو یا نہ ہو تو یہی اصول گرامر یعنی قواعد صرف و نحو کہلاتے ہیں۔

علمی گرامر لسانیات سے الگ نہیں اس لئے لسانیات کی بحثوں کو چھوڑ کر اور ان سے کترا کر علمی بنیادوں پر اردو کی جامع اور مکمل تحقیقی گرامر مرتب کرنا

ناممکن ہے۔ اردو جیسا کہ سب جانتے ہیں، ہند یورپی خاندان کی زبان ہے۔ اور اس بڑے خاندان میں سے۔ ہند ایرانی گھرانے سے اس کا تعلق ہے۔ ضرورت ہے کہ اس گھرانے کی قدیم وجدید زبانوں کے ذخیروں کو اچھی طرح کھنگالا جائے اور ان کی گرام اور لسانیات کا تقابلی مطالعہ کرکے دیکھا جائے کہ ان زبانوں میں گرام اور لسانیات کے اصولوں کو ارتقا کے کن کن منازل سے گذرنا پڑا ۔ اس کے بعد اردو گرام ان اصول کی روشنی میں ترتیب دی جائے۔

اب تک اردو گرام پر جو کچھ لکھا گیا ہے وہ بہت کم علمی اصولوں کے مطابق ہے۔ اس کی حیثیت علمی سے زیادہ عملی ہے۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ اُردو گرام نے اولاً پر نکالی۔ فرانسیسی اور انگریز مستشرقین کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ سب سے پہلے غیروں نے اردو زبان کی گرام لکھی۔ وہ اہل زبان نہ تھے۔ اس لئے انھوں نے زبان کے وہی اصول، قاعدے اور ضابطے پیش نظر رکھے جو زبان کے حاصل کرنے میں ان کے معاون تھے اور جن کو جانے بغیر ممکن نہ تھا کہ اُردو میں اظہار خیال کیا جاسکتا۔ ہمارے ملک کے اہل علم نے جو کتابیں تالیف فرمائیں ان میں بھی زیادہ تر ان اجنبی عالموں کی تقلید میں انھی اصولوں کو پرکھا گیا اور انہی قاعدوں کو جانچا گیا جو ایک اجنبی زبان کی حیثیت سے اردو کی تحصیل میں مددگار تھے۔ باقی کو نظر انداز کر دیا گیا۔ کچھ کتابیں عربی گرام کی تقلید میں لکھی گئیں۔ عربی سامی خاندان سے ہے۔ سامی زبانوں کا مزاج آریائی زبانوں کے مزاج سے مختلف ہے۔ اس لئے دوسری کوتاہیوں کے ساتھ ساتھ ان کتابوں میں ایک بدعنوانی یہ ہوئی کہ اردو کو سامی زبان کے قالب میں ڈھالنے کی کوشش کی گئی اور اس کے جسم پر وہ لباس قطع کیا گیا جو کسی طرح بھی اس کے لئے موزوں نہ تھا۔

سنسکرت گرامر کا تاریخی ارتقار تاریکی میں ہے۔ پانینی سنسکرت کا اولین قواعد نویس ہے اور شاید آخری بھی پانینی کی مشہور سنسکرت گرامر اشٹادھیائی (آٹھ اب والی کتاب) سب سے پہلی اور سب سے آخری قواعد کی کتاب ہے۔ اس کتاب کی تصنیف کے زمانے سے لے کر آج تک پانینی کے سوتر (مختصر اصول یا فارمولے) زیر بحث رہے ہیں اور ان پر حاشیے، شرحیں، اور ذیلی نوٹ لکھے جاتے رہے ہیں پانینی کا طریق بحث زیادہ تر تشریحی اور تعمیری ہے جس میں الفاظ کی ابتدائی حالت سے اجزار کلام کی صورت میں لانے کے اصول اور قاعدے بتلائے گئے ہیں لفظ اپنی ابتدائی حالت میں دھاتو (مادہ) کہلاتا ہے جو کبھی اس حالت میں استعمال نہیں ہوتا۔ ارسطو کے ہیولی کی طرح وہ ایک بسیط ترین آواز ہے استعمال سے اس میں کچھ آوازیں اضافہ ہوجاتی ہیں۔ یہ آوازیں کثرت استعمال اور زمانے کی الٹ پھیر کے زیر اثر صورت اختیار کرلیتی ہیں۔ اور مادے کو جزء کلام بنانے میں اس کا ہاتھ بٹاتی ہیں۔

پانینی نے تالیف کلام، ترکیب جمل اور اسما و افعال کے مختلف احوال پر جو کچھ لکھا ہے اس کی حیثیت علمی سے زیادہ عملی ہے اس کی مدد سے سنسکرت بولنے سمجھنے اور لکھنے کی لیاقت تو حاصل ہوجاتی ہے لیکن زبان کے ہمہ گیر اصولوں اور اس کے ارتقار کی درمیانی کڑیوں کا علم نہیں ہوتا۔ پانینی اجزار کلام کی علمی طور پر تقسیم بھی نہ کرسکا۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ وہ اس سے بے خبر تھا۔ بلکہ وہ زبان کی ان دشواریوں کو حل کرنا چاہتا تھا جو آلہ اظہار و بیان کی حیثیت سے اس کی راہ میں بولنے والے کو پیش آتی ہیں۔ شاید اسی لئے الفاظ کی اولین تقسیم میں تصریف و تعریب کا خیال رکھتے ہوئے ان الفاظ کو اس نے الگ کرلیا تھا جن میں تغیر نہیں ہوتا اور جو عربی میں مبنی اسما کی طرح ہر حالت میں ایک جیسے رہتے ہیں۔ یہ الفاظ سنسکرت گرامر میں "نپات" کہلاتے ہیں۔

سنسکرت میں اسمار کی اعرابی حالتیں اور مرکبات ناقص کی بحثیں بہت

اہم ہیں وان کی اہمیت اپنی جگہ بھی ہے اور اردو گرامر میں بھی۔ اپنی جگہ اس لئے کہ یہ بحثیں زبان کی ساخت اور اس کے مزاج و منہاج کے سمجھنے میں ہماری مدد کرتی ہیں۔ اردو گرامر میں اس لئے کہ اردو کے مرکبات زیادہ تر انہی اصولوں کے مطابق ڈھالے گئے ہیں جو سنسکرت میں کارفرما ہیں۔ اگر سنسکرت سماس (مرکب) کی قسمیں، ہر قسم کے اصول بنانے کے طریقے ان کے مختلف استعمالات پر ناقدانہ نظر ڈالی جائے اور اردو زبان کے مرکبات سے ان کا مقابلہ کیا جائے تو بہت سے ایسے مشترک اصول دریافت ہو سکتے ہیں جو اردو گرامر کی ترتیب نو میں مفید ہوں۔ مثلاً "ندی کنارے" اور "لکڑی کے سہارے" اُردو میں اس طرح کے بہت سے استعمالات ہیں۔ یہ استعمالات سنسکرت کی ظرفی حالت سے اردو میں آئے ہیں۔ ان میں سنسکرت کی علامت ظرفیت "ے" جوں کی توں موجود ہے۔

تھریکس کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ یہ اشارکس کا شاگرد تھا۔ پومپے کے عہد میں اس نے اپنی مشہور گرامر لکھی جو ذیل کے سات ابواب پر مشتمل ہے۔ (۱) حکایت صوت (۲) علم الاصوات (۳) شرح صنائع وبدائع (۴) تعریفات (۵) صرف و اشتقاق (۶) اصول عامہ (۷) تنقیدی اصول۔ تھریکس کے بعد یونان اور روم میں گرامر کی جتنی کتابیں تالیف ہوئیں وہ تھریکس کے اصولوں کو سامنے رکھ کر لکھی گئیں۔ تھریکس سے پہلے خود یونان میں گرامر ارتقا کی بہت سی منزلیں طے کر چکی تھی۔ ضرورت ہے کہ آریائی زبانوں کی ارتقائی منزلوں کا کھوج لگایا جائے۔ اس سے جہاں اور فائدے ہوں گے وہاں یہ اُمید بھی ہے کہ اس طرح اُردو زبان کی علمی گرامر کے بہت سے گوشے روشن ہو جائیں اور لسانی ارتقا کے کچھ گمشدہ حلقے بھی مل جائیں۔

ارسطو نرا فلسفی ہی نہ تھا وہ ایک فاضل لغوی اور عالم لسانیات بھی تھا۔ ارسطو سے پہلے علماء ایک بے معنی سی بات میں الجھے ہوئے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ لفظ اور معنی میں ایک طرح کا فطری تعلق ہوتا ہے اور جس طرح وزنی اور بھاری چیزیں طبعی طور سے بلندی سے پستی کی طرف کھنچی چلی آتی ہیں اسی طرح الفاظ بھی اپنی طبیعت اور فطرت سے خود بخود معنی ادا کرتے ہیں۔ ارسطو سے پہلے دیمقراطیس اس خیال کو غلط ثابت کر چکا تھا لیکن ارسطو نے کسی قدر وضاحت اور قوت کے ساتھ اس کے خلاف لکھا۔ اسم، فعل اور حرف یہ تین قسمیں کلمے کی سب سے پہلے ارسطو نے کیں۔ عربوں نے بھی یہی تین قسمیں بتائی ہیں۔ ارسطو نے بتایا کہ اسم کی دو قسمیں ہیں۔ مفرد اور مرکب۔ اسم کی اعرابی حالت کی دریافت کا سہرا بھی اسی حکیم کے سر ہے۔ ارسطو کا پیش رو پروطوغراس جنس اور اس کی تین قسمیں۔ فعل اور اس کی چار صورتیں دریافت کر چکا تھا۔ گرامر کے سلسلے میں ہم معنی الفاظ کا اختلاف ایک بے معنی سی چیز ہے لیکن یونانی اس میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ پروڈیکس نے اس پر بہت کچھ لکھا ہے اور بڑی کنج کاوی کی ہے۔ ارسطو کے بعد رواقیین کا دور آتا ہے۔ کہتے ہیں متعلق فعل (تمیز) کو رواقیین نے دریافت کیا اور زمانے، معنی اور فاعل کے اعتبار سے اس کی مختلف قسمیں بھی انہی کی سعی و کوشش کا نتیجہ ہیں۔

یہ بحثیں اُردو گرامر کے لئے کس قدر مفید ہیں اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے ان کی افادیت اس بنا پر نہیں کہ اُردو گرامر بھی انہی لائنوں پر لکھی جائے اور اس کی ترتیب و تبویب بھی انہی اصولوں پر ہو۔ بلکہ اس لئے ہے کہ ان کی مدد سے اردو زبان کی فطرت اور اس کی گوناگوں صلاحیتوں کا علم حاصل کیا جا سکتا ہے اور اس کے بعد اُردو گرامر کی دقتوں کا حل نکالا جا سکتا ہے۔ زبان اس وقت جس حالت

میں ہے اس سے پہلے اس کی یہ حالت نہ تھی۔ وہ بڑی منزلیں مار کر یہاں پہنچی ہے اور اب بھی برابر رواں دواں ہے۔ ہمیں اردو گرامر کچھ اس نہج سے ترتیب دینی چاہیے کہ اس کی یہ تمام منزلیں روشن ہو جائیں۔ اس کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ اول ہم یہ فرض کر لیں کہ اردو نے دوسری زبانوں کی طرح حروف اور مفرد الفاظ کے نامرتب مجموعے سے اپنے طویل ترین سفر ارتقا کا آغاز کیا ہے۔ اس کے بعد آہستہ آہستہ ہم درمیان کی تمام منزلوں پر انگلی رکھتے اور نشان کرتے چلے جائیں۔ اب تک یہی طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔ میرے نزدیک یہ طریقہ الٹا ہے۔ اس میں جس نقطے سے ابتدا کی گئی ہے وہاں اختتام ہونا چاہیے تھا۔ منزلِ مقصود کو مبدأ سفر قرار دے کر پشت بہ منزل راہ طے کی گئی ہے۔ اس وقت زبان کی حیثیت ایک مرتب اور منتظم لڑی کی سی ہے جس میں الفاظ، مرکبات اور جملے چھوٹے بڑے موتیوں کی طرح جمے جمائے نظر آتے ہیں۔ کوئی وجہ نہیں کہ ہم اس کو اسی طرح مرتب و منظم سمجھ کر اپنی تحقیق کا آغاز یہیں سے نہ کریں۔ پہلے ایک مسلسل اور مرتب خیال کو مختلف جملوں میں یا چھوٹے بڑے خیالوں میں جو اپنی جگہ پورے ہوں تحلیل کر لیں۔ اس کے بعد یونہی تحلیل کرتے چلے جائیں اور ساتھ ساتھ ان اصولوں، ضابطوں اور قاعدوں کو بھی دیکھتے اور متعین کرتے رہیں جو ترکیب کی جان ہیں اور جنھوں نے جملوں کو نمو اور زبان کو حیات عطا کی ہے۔

اردو گرامر میں جملوں کی تقسیم عربی نحو کی تقلید میں کی گئی ہے۔ اردو میں فعلیہ اسمیہ، شرطیہ، ظرفیہ، خبریہ، انشائیہ جملے کی یہ قسمیں بے معنی ہیں بلکہ بعض حیثیتوں سے غلط بھی ہیں۔ مثلاً جملہ اسمیہ اردو میں نہیں اور نہ اس کے ہونے کی کوئی صورت ہے۔ عربی میں البتہ ایسے جملے ہوتے ہیں جن میں سرے سے فعل نہیں ہوتا جیسے زیدٌ قائمٌ (زید کھڑا ہے) ایک مکمل خیال ہے۔ جس کے دو ترکیبی جز ہیں اول

دونوں اسم ہیں۔ یہ جملہ اسمیہ ہے۔ بعض سنسکرت گراموں میں "سنگیا واچک" جملے کی ایک قسم بتائی گئی ہے اور یہ وہ جملہ ہے جو دو یا اس سے زیادہ اسموں سے مرکب ہو لیکن اردو میں ایسا کوئی جملہ نہیں جو صرف دو اسموں سے بنے اور اس میں فعل نہ ہو۔ جملے کی دوسری قسمیں بھی جہاں تک زبان کی ترکیبی خصوصیات کا تعلق ہے قریب قریب بے نتیجہ ہیں اور تقاضائے تحقیق یہ ہے کہ یہ قسمیں ترک کر دی جائیں اور ان کی جگہ انگریزی کی طرح فعل کی صورتیں بیان کرتے وقت ان کا ذکر کر دیا جائے۔ شرط۔ ظرفیت الشائیت یہ سب قیدیں ہیں جو فعل کے معنی میں خصوصیت پیدا کرتی ہیں۔ ان کی حیثیت متعلق فعل کی سی ہے۔ اس لئے فعل کے ساتھ ہی ان کا ذکر ہونا چاہیے

اردو میں جملے کی صرف تین قسمیں ہیں۔ جملہ ایک پورا اور مکمل خیال ہوتا ہے مسلسل گفتگو میں بہت سے مکمل خیال کسی جوڑنے والے لفظ سے جوڑ دئے جاتے ہیں کبھی یہ خیال ایک حیثیت کے ہوتے ہیں اور کبھی ان میں سے ایک خیال اہم ہوتا ہے اور باقی دوسرے خیالات اس کے تابع ہوتے ہیں۔ پہلی صورت میں وہ سب خیالات مل ملا کر ایک جملہ مرکب کہلاتے ہیں۔ دوسری صورت میں خیالات کے اس مجموعے کو جملہ ملتف کہتے ہیں۔ بس جملے کی یہی تین قسمیں ہیں اور مناسب ہے کہ اردو گرامر میں یہی قسمیں بتائی جائیں۔

اردو میں مرکبات کی بڑی اہمیت ہے۔ ان کی متعدد قسمیں ہیں۔ ان کی وضع میں خاص خاص قاعدے برتے گئے ہیں۔ اردو قواعد نویسوں نے ان مرکبات کے ساتھ بھی وہی سلوک روا رکھا جو زبان کے دوسرے اجزا و عناصر کے ساتھ رکھا گیا تھا۔ عربی میں مرکب کی دو قسمیں ہیں امتزاجی اور غیر امتزاجی یا ارتباطی۔ امتزاجی کے اجزا میں قواعد کا کوئی رشتہ نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس ارتباطی کے اجزا میں قواعدی رشتے ہوتے ہیں عربی گرامر پر قیاس کر کے موجودہ قواعد کی کتابوں میں مرکبات کی مذکورہ بالا

دو قسمیں کر دی گئیں۔ ذیل کے مرکبات پہلی قسم میں شامل ہوئے۔

بن کریلا۔ جنم پترا۔ چاند گہن۔ جیب گھڑی۔ سفر خرچ۔ گھڑ دوڑ۔ ڈاک گاڑی۔ تار گھر۔ جگت گرو۔

اور حسب ذیل مرکبات دوسری قسم میں :-

پتھر پھوڑ۔ منھ توڑ۔ کفن کھسوٹ۔ چلتا منتر۔ چڑی مار۔ نیبو نچوڑ۔ اندھیر نگری۔ جیب کترا۔ مکھی چوس۔ لم ٹنگو۔

مرکبات کی یہ تقسیم ادھوری اور ناقص ہے۔ اس سے اجزائے مرکب کے باہمی رشتے کی وضاحت تو ہو جاتی ہے خود مرکب کی فطرت اور اس کی حقیقت روشن نہیں ہوتی۔ مثلاً جیب گھڑی اسم ذات ہے اور جیب کترا اسم صفت یعنی فاعل (جیب کترنے والا)۔ جگت گرو" مرکب اضافی ہے (جگت کا گرو) اور چلتا منتر مرکب وصفی (چلتا ہوا منتر) نیبو نچوڑ اور لم ٹنگو اسم صفت ہیں (نیبو نچوڑنے والا۔ اور لمبی ٹانگ والا) پہلا مرکب نحوی ہے اس کا جزو اول (نیبو) جزو ثانی (نچوڑ) کا مفعول ہے۔ دوسرا مرکب توصیفی ہے۔ اس کا جزو اول (لم = لمبا) جزو ثانی (ٹنگ = ٹانگ) کی صفت ہے۔ (لمبی ٹانگ والا) مرکبات کی حقیقت اور فطرت کا یہ فرق موجودہ تقسیم سے واضح نہیں ہوتا۔

یہ تقسیم غلط بھی ہے۔ اس لئے کہ اردو میں کوئی مرکب ایسا نہیں جس کے اجزار قواعدی رشتے میں منسلک نہ ہوں۔ مرکب کے اجزار میں رشتہ ضروری ہے۔ رشتہ نہ ہونے کی صورت میں دو لفظ ایک دوسرے سے کیسے جوڑے جائیں۔ ایک دوسرے کے پہلو میں جگہ کیونکر پائیں۔ یہ الگ بات ہے کہ لفظوں کو لیئی سے جوڑا جا سکتا ہے نہ سریش سے۔ وہ قواعدی رشتے سے ہی جڑ سکتے ہیں۔ دو لفظ ایک دوسرے کے پہلو میں ہوں تو ان میں اضافت کا رشتہ ہوگا جیسے بن کریلا (بن کا کریلا) جنم پترا۔ (جنم کا پترا)

چاند گہن (چاند کا گہن) جیب گھڑی (جیب کی گھڑی) سفر خرچ (سفر کا خرچ) گھڑ دوڑ (گھوڑے کی دوڑ) یا وصفیت کا رشتہ ہوگا جیسے چلتا منتر (چلتا ہوا منتر) لم ٹنگو (لمبی ٹانگوں والا) بھلا مانس، مہاجن، نیک چلن، رتالو (رکت + آلو، سرخ آلو) یا فعل اور مفعول کا رشتہ ہوگا جیسے پتھر پھوڑ (پتھر کو پھوڑنے والا) نیبو نچوڑ (نیبو کو نچوڑنے والا) چڑی مار (چڑیا کو مارنے والا) یا ظرف و مظروف کا جیسے کپڑ چھن (کپڑے میں چھاننا) یا جار و مجرور کا جیسے دیس نکالا (دیس سے نکالا) رس بھری (رس سے بھری) قدموں لگی (قدم سے لگی) آنکھوں دیکھا (آنکھ سے دیکھا)

اس کے بعد جزو کلام یعنی کلمے کو لے کر اس کی تقسیم کی جائے۔ اجزاء کلام دو طرح کے ہیں۔ ایک وہ جنھیں عربی میں الفاظ عامہ یا الفاظ مطلقہ کہتے ہیں۔ یہ وہ الفاظ ہیں جو کسی معین یا مخصوص ذات پر دلالت نہیں کرتے بلکہ ہر مفہوم کے لئے بے شرط اور بے قید استعمال ہوتے ہیں۔ ویسے تو یہ تین قسم کے ہیں۔ ضمیر۔ اسم اشارہ۔ اسم موصول لیکن سنسکرت زبان کے نحویوں نے اسماء، اعداد۔ ظروف، حروف استفہام اور آلہ تعریف کو بھی ان میں شامل کر لیا ہے۔ الفاظ عامہ کی آپ بیتی بہت دلچسپ ہے جس میں فلسفۂ لسان اور فقہ اللغۃ کے بہت سے حقائق ملتے ہیں۔ ایک علمی گرامر میں ان حقائق کے لئے بھی جگہ ہونی چاہیئے۔ ضمائر، اشارات، موصولات، اور آلہ تعریف کی بابت آریائی اور سامی لسانیات میں ثابت ہو چکا ہے کہ وہ ایک حرف یا ایک لفظ کے مختلف تنوعات ہیں۔ مصر کے مشہور عالم جرجی زیدان صاحب "الہلال" نے "الفلسفۃ اللغویہ" کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے۔ اس میں اس نے ثابت کیا ہے کہ سامی اور آریائی زبانوں کے الفاظ عامہ ایک اصل کی مختلف شاخیں ہیں۔ میں سمجھتا ہوں اردو گرامر کے سلسلے میں یہ کام انجام دینا چاہیئے اس سے ایک فائدہ یہ ہوگا کہ اردو کے الفاظ عامہ کی پوری تاریخ جس کا آغاز سنسکرت

سر و نام (الفاظ عامہ) سے ہوا ہے روشنی میں آجائے گی۔ اور ہندوستانی لسانیات کے کئی باب مکمل ہو جائیں گے۔

الفاظ مانعہ کے ماتحت فعل، اسم، حرف وغیرہ اجزار کلام آتے ہیں۔ صفت کوئی الگ جزء کلام نہیں۔ اسے عربی گرامر کی طرح اسم ہی میں شامل کیا جاسکتا ہے۔ متعلق فعل کی بھی اپنی جگہ کوئی حیثیت نہیں۔ وہ ایک طرح کا مرکب ناقص ہے جس کی ترکیب اکثر حالات میں ایک اسم اور ایک حرف سے ہوتی ہے۔ جو اسمار جملے میں صرفی تحلیل کے وقت متعلق فعل بتائے جاتے ہیں وہ اسم ہوتے ہیں۔ لیکن فعل کی توصیف یا تقیید کی وجہ سے یا فعل کے ساتھ ایک رشتہ قائم ہو جانے کے باعث متعلق فعل سمجھے جاتے ہیں۔ ان کی اپنی حیثیت کچھ نہیں اس لئے اجزار کلام کے ساتھ ان کا ذکر نہ ہونا چاہیئے۔

حروف صلہ، حروف واصلہ یا عاطفہ اور حروف ندا یا فجائیہ یہ سب حرف کے مختلف تنوعات ہیں۔ کوئی وجہ نہیں کہ خواہ مخواہ انگریزی گرامر کی تقلید میں ان کو اجزار کلام کے ساتھ شمار کرایا جائے۔ اجزائے کلام کے بعد ان کی قسموں کا سوال آتا ہے۔ اسم کی دو قسمیں مفرد اور مرکب گرامر میں بہت اہم ہیں۔ سنسکرت میں سماس (مرکب) کی چھ قسمیں ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ وہی قسمیں اُردو میں لے لی جائیں لیکن ان کی مدد سے اردو مرکبات کی پیچیدگیاں بڑی حد تک حل کی جاسکتی ہیں۔ اُردو ہند آریائی خاندان سے ہے اس لئے یقین ہے کہ اردو اسما کی ترکیب ان اصول کے مطابق ہوگی جو سنسکرت اور دوسری اہم قدیم و جدید ہند آریائی زبانوں میں کارفرما ہیں۔ فعل اور اس کی گردان۔ اسمائے مشتقات اور ان کے صیغے۔ اسما کی اعرابی حالتیں۔ وضع الفاظ یعنی سابقون اور لاحقوں کی تحقیق تاریخ اور ان کے مختلف استعمالات یہ سب بحثیں اہم بھی ہیں اور مفید بھی۔

اخذ و اشتقاق گرامر کی جان ہے ۔ اردو زبانوں کے جس گھرانے سے ہے اس میں خصوصیت کے ساتھ اس کی بڑی اہمیت ہے۔ اشتقاق یعنی ایک لفظ سے دوسرا لفظ وضع کرنا دو طرح کا ہے۔ ایک یہ کہ لفظ کی حرکت میں کوئی ادنیٰ سا تغیر کر لیا جائے یا وسط کلمے میں کسی حرف کے حذف و اضافے سے لفظ میں کوئی تبدیلی کر دی جائے۔ اس نوع کا اشتقاق سامی خاندان کی زبانوں کے ساتھ خاص ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ لفظ کے اول یا آخر کوئی حرف یا کلمہ اضافہ کر دیا جائے ۔ ابتدا میں اضافہ کئے جانے والے کلمے سابقے اور آخر میں اضافہ کئے جانے والے لاحقے کہلاتے ہیں۔ آریائی زبانوں میں عام طور سے اشتقاق کی یہی صورت ہے۔ اردو گرامر میں سابقوں اور لاحقوں پر ایک سیر حاصل بحث ہونی چاہئے۔ جس میں ان کی لغوی اور لسانی تحقیق بھی شامل ہو۔

اردو نحو سراسر عربی نحو کی نقل اور اس کا چربہ ہے۔ حالانکہ عربی میں اعرابی تغیرات کی وجہ سے نحو کی حیثیت آریائی زبانوں سے ذرا مختلف ہے۔ اردو میں (مغیرہ حالت کو چھوڑ کر) اسم کی کوئی ظاہری اعرابی علامت نہیں اور جو ہے جیسے نے، سے، کو وغیرہ وہ کلمے سے الگ ہے۔ اُردو کی تمام اعرابی علامتیں حروف معنوی ہیں۔ اس لئے اُردو میں عربی کی طرح کسی پیچیدہ نحوی نظام کا ٹھاٹ بے سود ہے۔ بس اتنا کافی ہے کہ فعل کو اصل و بنیاد ٹھہرا کر باقی الفاظ، فقرات اور مرکبات کے جو جملے میں استعمال ہوئے ہیں فعل سے رشتے بنا دئے جائیں اور مختلف استعمالات کے مواقع ظاہر کر دئے جائیں۔

میں نے اس مقالے میں اختصار سے کام لیا ہے اور اردو گرامر کی ترتیب نو سے متعلق مشورے دئے ہیں اور نئی راہوں اور ان کی بعض منزلوں کی طرف محض اشارے کئے ہیں۔ تفصیل کی چنداں ضرورت نہ تھی اور اگر تفصیل کی جاتی

تو وہ خود ایک نقطۂ نگاہ کا انتخاب نہ ہوتا جس سے میں بچنا چاہتا ہوں۔ میرا مقصد یہ ہے کہ میں اُردو گرامر کے سلسلے میں ہندوستانی لسانیات کی اہمیت پر زور دوں اور بتاؤں کہ اردو کی ترقی کے لئے ضروری ہے کہ اس کی گرامر کو ازسرِ نو علمی بنیادوں پر مستحکم کیا جائے اور لسانیات کے جدید اصولوں سے بقدرِ امکان مدد لی جائے۔ لسانیات اور گرامر کے امتزاج ہی سے اُردو کی کوئی اچھی اور مفید خدمت انجام دی جاسکتی ہے۔

اُردو الفاظِ عامہ کی آپ بیتی

ہر زبان کے الفاظ و اسما کو دو حصّوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ کچھ اسمار مخصوص معانی کے لئے وضع ہوئے ہیں اور خاص خاص چیزوں کے لئے بولے جاتے ہیں، جدید ماہرین لسانیات نے اس قسم کے تمام الفاظ کو الفاظ مانعہ کے نام سے موسوم کیا ہے۔ عام الفاظ و اسمار اسی قسم کے ہیں مثلاً سنگ، خشت، محبت، عداوت وغیرہ۔ گرامر میں یہ سب اسم ہیں جو اپنے اپنے مخصوص معنی میں استعمال ہوتے ہیں۔ جو سنگ ہے وہ خشت نہیں اور جو محبت ہے وہ عداوت نہیں، کبھی کوئی زبان دان ایسی غلطی نہ کرے گا کہ وہ زبان سے تو خشت کہے اور اس کی مراد اس سے سنگ ہو یا عداوت کو اس جذبہ کے لئے استعمال کرے جو عرف عام میں محبت ہے۔ اجزائے کلام میں سے تمام افعال و حروف الفاظ مانعہ میں داخل ہیں اس لئے کہ وہ سب خاص خاص معنی و مفہوم کے لئے وضع ہوئے ہیں۔

اسماکی دوسری قسم میں وہ اسما شامل ہیں جو کسی خاص مفہوم و معنی کے لئے

وضع نہیں ہوئے۔ ان کا اطلاق ہر موجود پر کیا جاسکتا ہے۔ خواہ وہ محسوس ہو یا معقول۔ جان دار ہو یا بے جان۔ حیوان ہو یا انسان۔ اس قسم کے تمام اسما کو الفاظ مطلقہ یا عامہ کہتے ہیں اس لئے کہ وہ ہر موجود کے لئے استعمال ہوتے ہیں اور ان سے تقریباً ہر مفہوم مراد لیا جاسکتا ہے۔ مثلاً "یہ" اسم اشارہ قریب ہے۔ اس سے ہر قریب کی چیز مراد لی جاسکتی ہے۔ خشت ہو یا سنگ۔ کپڑا ہو یا اس کا رنگ۔

یہ کوئی جدید اصطلاح نہیں یا اگر اصطلاح جدید ہے تو اس کا مفہوم جدید نہیں۔ سنسکرت گرامر میں یہ تقسیم قدیم سے ہے۔ جہاں الفاظ مطلقہ کو سب سے الگ بیان کیا گیا ہے اور اس کے احکام دوسرے الفاظ و اسما سے جدا اور مختلف بتائے گئے ہیں۔ سنسکرت میں یہ "سرونام" کے نام سے موسوم ہیں۔ جس کا لفظی ترجمہ ہے وہ الفاظ جو سب کے لئے ہیں (سرو = سب) الفاظ عامہ شاید سنسکرت "سرونام" ہی کا ترجمہ ہے۔ قدیم عربی گرامر میں الفاظ مطلقہ مبہمات کے نام سے مشہور تھے یعنی وہ اسما جن کے معنی متعین نہیں اور جن کو بے تکلف ہر چیز پر بولا جاسکتا ہے۔

سنسکرت میں سرونام کی حسب ذیل چھ قسمیں ہیں:۔

(۱) پُرش واچک (ضمیرین)	(۲) سنکھیا واچک (اسماء اعداد)
(۳) ستھان واچک (ظروف)	(۴) ورشک (اسماء اشارہ)
(۵) سمبندھی (موصولات)	(۶) پرشن واچک (حروف استفہام)

لیکن عربی زبان کے لغویوں نے ان کی صرف تین قسمیں بتائی ہیں۔ ضمیرین، اشارے اور موصولات۔ سنسکرت قواعد دانوں کی تقسیم زیادہ جامع معلوم ہوتی ہے۔

اردو ہند آریائی خاندان کی زبان ہے۔ ہر چند عربی اور اس کے وسیع ذخیرہ الفاظ سے بھی اس نے استفادہ کیا ہے لیکن اس کی عام ساخت آریائی ہے۔ اس کا خمیر مایہ اسی خاندان سے تیار ہوا اور اسی سے اس نے غذا حاصل کی۔ اردو

زبان کا طالب علم ہند آریائی خاندان کے لسانی سرمایہ سے کبھی بے نیاز نہیں ہو سکتا۔

الفاظ عامہ میں سے اول ضمیروں کو لیجئے۔ اردو میں ضمیریں چھ ہیں۔ دو ان کی اعرابی حالتیں ہیں۔ فاعلی۔ مغیرہ یا غیر فاعلی۔ فاعلی حالت میں ان ضمیروں کی شکلیں یہ ہیں۔ وہ۔ وے (متروک) تو۔ تم۔ میں۔ ہم غیر فاعلی حالت میں بدل کر ان کی شکلیں یہ ہو جاتی ہیں۔

اُس۔ اُن۔ تجھ یا تے۔ مجھ مے۔

ان ضمیروں کے آخر میں اگر کو بڑھا دیا جائے تو یہ مفعولی ہوتی ہیں۔ اور اگر کا۔ کی۔ کے یا را۔ ری۔ رے کا الحاق کر دیا جائے تو اضافی ہو جاتی ہیں اسی طرح ان ضمیروں پر اور حروف معنوی بھی داخل کئے جا سکتے ہیں۔ تے اور مے خاص اضافی حالتیں ہیں۔

وہ غالباً اُس کا بگاڑ ہے۔ اُس اصل میں اوش تھا جیسا کہ پہلوی میں ہے۔ فارسی "او" اوش ہی سے بنا ہے۔ اوش کی جمع اوشان فارسی میں آج بھی ہے۔ تخت یعنی تخریب صوتی زبان کا ایک عام قانون ہے۔ تخت کے معنی ہیں کاٹ تراش۔ عام طور سے لفظ کے آگے پیچھے سے کچھ حروف گر جاتے ہیں یا یوں کہیے کہ گرا دئے جاتے ہیں تاکہ لفظ ہلکا ہو جائے اور تلفظ کے وقت زبان پر گراں نہ ہو۔ یہ تخت ہے۔ الفاظ کی تاریخ میں قانون تخت کو بڑا دخل ہے۔ اوشان پر یہ عمل ہوا تو وہ کٹ کٹا کر صرف شان رہا۔ اوش کو تراش کر "ش" کی صورت میں اب بھی باقی رکھا گیا ہے۔ جو فارسی میں ضمیر متصل کے طور پر استعمال ہو رہا ہے۔

اُس کا پیش واؤ کا قائم مقام ہے جو اوش میں تھا لیکن اُس سے گر گیا ہے۔ رہا "س" سو وہ "ش" کی تخفیفی صورت ہے۔ دلیسی زبانوں کی یہ

عام خصوصیت ہے کہ ان میں جہاں کہیں "ش" ہے وہ "س" سے بدل گیا ہے سین اور شین دونوں صفیری حروف ہیں لیکن شین ان میں زیادہ ثقیل یا گاڑھا ہے۔ سنسکرت کا دیش اردو کا دیس ہے۔ اردو دیس اصل میں شلاً تھا۔ سر دعام طور سے بولتے ہیں لیکن اس کا خیال تک نہیں ہوتا کہ یہ سنسکرت کا شرد ہے۔ کھنڈسال اور گھڑسال کا سال جب تک سنسکرت میں رہا شالا ہی کہلایا۔

میرا خیال ہے کہ ضمیر واحد غائب کی اصل "س" یا "ہ" ہے۔ سنسکرت کا "سہ" (وہ) مجھے اصل سے بہت قریب نظر آتا ہے۔ تمام ضمیریں کسی زمانے میں بسیط حروف کی شکل میں تھیں لیکن کہیں تلفظ کی آسانی کے خیال سے اور کہیں دوسری مصلحتوں کی بنا پر ان میں کچھ اور حروف بھی اضافہ کر دیئے گئے۔ ضمیر حاضر کے لئے آریائی اور سامی خاندان کی زبانوں میں ایک ہی حرف "ت" ہے۔ لاطینی میں اس کی شکل "ٹو" انگریزی میں "دَوُ" جرمن میں "ڈو" سنسکرت میں "توم" اور فارسی میں "تو" ہے۔ یونانی میں یہ ضمیر "سو" ہے۔ لیکن اس کا "س" غالباً "ت" کا بدل ہے۔ سین اور تا میں اکثر تبادلہ ہوا ہے۔ سنسکرت "سہ" کا "س" بھی شاید "ت" کا بدل ہے.... اس لئے کہ سنسکرت گرامر میں ضمیر غائب کی گردان اور اس کے صرفی تغیرات جس مادے کے تحت دیئے گئے ہیں وہ "تد" ہے۔ "ت" جمع میں لوٹ کر آگئی ہے۔ سنسکرت 'تے' اور انگریزی "دے" (دے) ہم وزن بھی ہیں اور ہم معنی بھی اگر "تے" کا واحد "سہ" اور "دے" کا "ہی" نہ ہوتا تو یہ خیال کرنا بجا تھا کہ انگریزی اور سنسکرت دونوں زبانوں میں ضمیر واحد غائب "ہ" اور "س" نہیں بلکہ "ت" ہے۔

یہی حال سامی خاندان کی زبانوں کا ہے۔ اشوری میں ضمیر مخاطب "اتّا" کلدانی، عربی اور سریانی میں انت۔ قدیم مصری میں "ابتک" اور قبطی میں "نتوک" ہے۔

بہر حال اردو میں ضمیر غائب اُس ہے جس میں " اُ " اسم اشارہ بعید ہے۔ وہ بھی اس ہی سے بنا ہے۔ " س " اور " ہ " میں خاص مناسبت ہے۔ جس ' ہ ' کے بعد " ت " ہو وہ ضرور " س " سے بدل جاتی ہے۔ سنسکرت کے بعض الفاظ کے آخر میں جو دو نقطے ہوتے ہیں انھیں وسرگ کہتے ہیں۔ ان کا تلفظ ٹھیک اس طرح کیا جاتا ہے جس طرح ہم ہائے ہوز کا تلفظ کرتے ہیں مثلاً کہ (کون)۔ اگر وسرگ کے بعد " ت " ہو تو وسرگ کی ' ہ ' " س " کا روپ اختیار کر لیتی ہے۔ " کس توُم " (تو کون ہے) اصل میں " کہ توُم " تھا۔ اس کے علاوہ فارسی " کس " سنسکرت " کہ " کے قائم مقام ہے۔ خود فارسی میں بھی " کہ " کس کے معنی میں ہے۔ " س " نے بھی ' ہ ' کا روپ اختیار کیا ہے اور یہ زیادہ ہے۔ سنسکرت " اسمی (میں ہوں) قدیم فارسی میں " اہمی " ہے۔ فارسی ہفت کسی زمانہ میں " سپت " تھا۔ اس لئے خیال کیا جاتا ہے کہ ' وہ ' کی ' ہ ' بھی اس کے " س " کا بدلا ہوا روپ ہے۔ میں ' ہ ' کو ضمیر غائب کی اصل سمجھتا ہوں۔ یہ زیادہ قرین صواب ہے۔ سامی خاندان کی زبانوں میں بھی غائب کی ضمیر " ہ " ہے۔ عربی، عبرانی اور سریانی میں یہ ھُوَ کی شکل میں ہے۔ یہ ' ہ ' جمع کے صیغوں میں بھی ہے۔ عربی اور عبرانی میں جمع مذکر کے لئے ھُم اور جمع مونث کے لئے ھُنّ ہے۔ سریانی میں یہ ضمیریں بترتیب ھنون اور ھنین ہیں۔ ' ہ ' ان سب میں مشترک ہے۔

حیرت کا مقام ہے کہ بعض آریائی نسل کی زبانوں میں بھی ضمیر واحد غائب ' ہ ' یا اس کی مختلف شکلیں ہیں۔ انگریزی " ہی "۔ جرمن " ہوا " یا " ہو " اس کا ایک واضح ثبوت ہے۔

اس سلسلے میں ایک اور چیز بھی غور کرنے کے قابل ہے۔ عربی اور سنسکرت وغیرہ میں ضمیریں جہاں تنہا اور کلمے سے الگ استعمال ہوتی ہے وہاں وہ کلمے سے

متصل اور ان کا ایک جزو بن کر بھی آتی ہیں ۔ عربی میں غائب ضمیریں اگرچہ بارز یعنی نمایاں نہیں ہوتیں بلکہ مستتر ہوتی ہیں۔ لیکن حاضر کی ضمیر "ت" ظاہر ہے۔ ماضی کے صیغوں میں یہ "ت" بطور لاحقہ استعمال ہوئی ہے۔ جیسے فعلتَ (تو نے کیا) لیکن مضارع میں یہ سابقے کی طرح فعل کے شروع میں اضافہ کی گئی ہے جیسے تفعل (تو کرتا ہے یا کرے گا) فعلت اصل میں فعل + انت تھا اور تفعل انت + فعل۔ ضمیر کی یہ تقدیم و تاخیر ماضی اور مستقبل میں فرق کرنے کے لئے ہے۔ سنسکرت کا حال بھی یہی ہے۔ لیکن اس میں غائب کے تینوں صیغوں میں "س" کی جگہ "ت" ہے۔ مثلاً گچھتِ (وہ جاتا ہے)، گچھتہ (وہ دونوں جاتے ہیں) گچھنتِ (وہ سب جاتے ہیں) یہ سب "گم" (جانا) اور "ت" (وہ) سے بنے ہیں۔ ان کے مقابلے میں صیغہ واحد حاضر میں "س" ہے۔ جیسے گچھسِ (تو جاتا ہے) اور اس کے بعد کے دونوں صیغوں (تثنیہ و جمع) میں "ت"۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ہر چند "س" غائب کے لئے ہے اور "ت" حاضر کے لئے لیکن ان میں اتنا میل ملاپ اور یگانگت ہے کہ وہ ایک دوسرے کی جگہ استعمال ہوتے رہے ہیں۔ ہندوستان کی دوسری جدید بولیوں میں سے اودھی، بنگلہ وغیرہ میں ضمیر غائب "سہ" یا "سو" جوں کی توں استعمال ہوئی ہے۔ اس سے بھی میرے قیاس کی تائید ہوتی ہے کہ اردو ضمیر وہ کی اصل سنسکرت "سہ" ہے۔

ایک اور مقام پر بھی "س" اور "ہ" کا تبادلہ ہوا ہے۔ سنسکرت میں فعل مستقبل ہے "چلشیت"۔ شورسینی پراکرت میں اس کا "ش" "س" سے بدلا اور "ت" "گر گئی"۔ چلِس سے یہ فعل ہندی میں آیا تو "س" "ہ" سے بدل گیا۔ اور "چلی ہے" ہوا۔

اب ذرا وہ کے مدارج ارتقا ملاحظہ فرمائیں۔ سہ۔ اوسہ (باضافہ اُو)

اُس۔ اُہ۔ وُہ۔ ان میں سے اُہ یا اُوہ بعض بولیوں میں ہیں مثلاً ماجھہ، پوداہی اور ڈوگری وغیرہ ہیں جو پنجابی کی شاخیں ہیں۔

دے اور ان کو لیجئے۔ اردو دے اور انگریزی دے میں اس کے سوا کوئی فرق نہیں کہ اردو میں واؤ ہے اور انگریزی میں دال۔ اس کی دو وجہ ہو سکتی ہیں۔ ایک یہ کہ واحد کا واؤ جمع میں قائم رکھا گیا ہے۔ ان کی مثال فارسی دے ہے جس کا واؤ قطعی طور پر آدے آیا۔ اول سے الف گر گیا ہے رہی آخر کی ے سو وہ جمع غائب کی اعرابی علامت ہے۔ سنسکرت تے اور انگریزی دے دونوں ایک ہیں صرف ت دال سے بدل گئی ہے۔ ت اور د ہم مخرج ہیں اس لئے اکثر ان کا باہمی تبادل ہوا ہے۔ لاطینی ڈیسیم انگریزی میں ٹین ہے اور فرانسیسی تو جرمن زبان میں دد بولا جاتا ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ واؤ اصلی حرف نہیں بلکہ ت کی بدلی ہوئی صورت ہے۔ سامی زبانوں میں تو واؤ اور تے میں تبادل ہوا ہی ہے جیسا کہ عربی زبان کے مشہور لغوی اور ادیب علامہ زمخشری نے لکھا ہے۔ "عربی میں حرف قسم ب ہے۔ یہ ب پہلے واؤ ہوئی اور پھر و نے ت کی شکل اختیار کی" ود سنسکرت میں جاننا ہے۔ انگریزی میں اس کی دال ٹ ہوئی اور وٹ بنا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ دال۔ تے اور ٹے وغیرہ حروف ایک دوسرے سے بدلتے رہتے ہیں اور کچھ بعید نہیں اگر ت د ہو جائے تو دال واؤ کی شکل اختیار کرے۔

بہر حال اردو وُ ے ہو سکتا ہے کہ سنسکرت تے سے ماخوذ ہو۔ ت کو واؤ سے بدل دیا گیا ہو۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ انگریزی دے کا چربہ ہو اس لئے کہ دال بھی واؤ کی شکل اختیار کر سکتی ہے۔ دے جس ضمیر کی بدلی ہوئی صورت ہے اس میں دال اور ت دونوں ہو سکتی ہیں اور ہم قطعی طور پر نہیں کہہ سکتے کہ درحقیقت

وہ کون سا لفظ تھا اور اس کی اصلی صورت کیا ہے۔

اَن کا نون علامت جمع ہے۔ سنسکرت "تان" کے معنی ہیں وہ سب چیزیں اور "تان" کے معنی ہیں ان سب مردوں کو۔ اودھی میں جمع کی ضمیر "تنہہ" ہے۔ فعل میں بھی جمع کا مفہوم ظاہر کرنے کے لئے اَن استعمال ہوا ہے۔ جیسے ہے اور ہیں۔ جمع کا یہ نون سنسکرت اور فارسی میں بھی ہے۔ گچھنتِ (وہ سب جاتے ہیں) کردند (ان سب نے کیا) اسی لئے اس کی جمع اردو میں ان بنالی گئی۔

اس اور ان اردو میں وہ اور وے کی غیر فاعلی (مغیرہ یا محرف) حالتیں ہیں۔ ممکن ہے کہ اول اول ان میں یہ فرق نہ ہو۔ یہ وہ اور وے کی صورتیں ہوں لیکن بعد میں ان پر مفعول اور اضافی لاحقے اضافہ کئے جانے لگے ہوں۔ مجھے شبہ اس لئے ہے کہ اس کا کوئی قطعی ثبوت نہیں کہ یہ غیر فاعلی حالتیں ہیں (جبکہ سنسکرت میں اسم کی کوئی حالت بھی نہیں) یا ان کی موجودہ صورت ان حالتوں کی وجہ سے ہے۔ "اس" کے بارے میں بھی کہا گیا ہے کہ وہ اصل میں اضافی حالت ہے اور سنسکرت اسیہ (اس کا) سے ماخوذ ہے (ا + سیہ) اس صورت میں "کا" اس پر داخل نہ ہونا چاہیئے۔ اس لئے کہ (س) علامت اضافت پہلے سے ہے۔ شاید یہ بے قاعدگی اس لئے ہوئی کہ بہت سا زمانہ گذرنے کے بعد اس کی اضافی حالت فراموش کردی گئی اور اس پر اور علامات کی طرح لاحقہ اضافت اضافہ کیا جانے لگا۔ زبان کی تاریخ میں ایسا بہت ہوا ہے۔

تو اور تم شاید دونوں سنسکرت "توم" سے ماخوذ ہیں۔ "توم" کی جمع "یویم" ہے جو انگریزی "یو" کا ماخذ تو ہوسکتا ہے لیکن تم کو کسی طرح بھی اس سے نکالا نہیں جاسکتا۔ تو اور تم دونوں میں ضمیر صرف ت ہے۔ ایک میں واؤ اور دوسرے میں میم ان میں فرق کرنے کے لئے لائے گئے ہیں۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ

خود، تو تم، میں واؤ بھی ہے اور میم بھی۔ کچھ بعید نہیں کہ کسی قدیم زمانے میں تم بطور لاحقہ جمع استعمال ہو۔ سامی زبانوں میں آج بھی تم جمع کے لئے ہے۔ عربی میں انت کی جمع انتم ہے۔ عبرانی میں بھی ایسا ہی ہے البتہ سریانی میں تن ہے۔ آریائی زبانوں میں بھی تن ہی ہے۔ یوں سمجھئے کہ اگر تن علامت جمع ہے تو تم اس کا بدل ہے اور اگر اس کے برعکس ہے تو تن کو بدل سمجھنا چاہیئے۔

میں اور ہم متکلم ضمیریں ہیں۔ حاضر و غائب کی طرح ان کے بارے میں بھی کسی قدر وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ متکلم کی ضمیر صرف میم ہے لیکن اس کا استعمال مختلف زبانوں میں مختلف طور سے ہوا ہے۔ سنسکرت میں میم ضمیر کے آخر میں ہے اور فارسی میں اول میں۔ اہم اور من ہمسر ہیں۔ اور دیم ما کا بدل ہے مگر انگریزی "آئی" اور "وی" دونوں سے اصل حروف گر گئے اور جو تلفظ کی غرض سے بڑھائے گئے تھے وہ اصل حروف کی جگہ لے بیٹھے۔ وی تو صاف صاف دیم کا پتہ دے رہا ہے۔ آئی بھی شاید ابتدائے عہد میں آم تھا۔ یہ ایم (am) سے ظاہر ہے۔ علمار لسانیات نے لکھا ہے کہ یہ a اور m سے مرکب ہے a .. اس (ہونا) کی منحوت شکل ہے اور m متکلم کی ضمیر ہے۔ انگریزی میں بھی ضمیر متکلم میم ہی ہے۔ جو زمانہ گزرنے کے بعد خود تو مٹ گیا لیکن دوسرے غیر ضروری حروف کے لئے جگہ چھوڑ گیا۔ مجھے اُردو میں فارسی من سے زیادہ قریب نظر آتا ہے۔ اور اگر یہ سنسکرت یا قدیم ہند آریائی زبان سے لیا گیا ہے تو اہم کی آلی حالت میا یا ظرفی حالت مِی کا بگاڑ ہے۔ اور ھمی کی ھمیں بھی اسی سے ہے۔
ایک صورت اور بھی ہے۔ وہ یہ کہ میں سنسکرت دیم یا پالی میم سے ماخوذ ہو۔ اس صورت میں اصل کے اعتبار سے یہ جمع ہو گا۔ جیسا کہ بنگالی آمی ہے۔

ہم تم کی طرح ضمیر مفرد اہم سے ماخوذ ہے۔ اہم اور ہم میں بظاہر کوئی

فرق نہیں۔ صرف شروع سے الف گرا ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو اس سے ایک دلچسپ نتیجہ برآمد ہوتا ہے وہ یہ کہ اردو ضمیروں میں جب وہ بن رہی تھیں اور ان پر تراش خراش کا عمل جاری تھا مفرد و جمع کی کوئی تمیز نہ تھی۔ یہ بعد کی چیز ہے۔ اول ان کو تراش لیا گیا۔ بعد میں کسی خاص مناسبت سے انھیں مفرد یا جمع سے مخصوص کر دیا گیا۔ آپ کو شاید یہ دیکھ کر حیرت ہو کہ ہَم اور تُم جمع کے لئے ہیں۔ ہر چند یہ مفرد ضمیروں سے ماخوذ ہیں لیکن ان کے آخری میم نے انھیں جمع کے ساتھ خاص کر دیا ہے۔

تے اور سے خاص طور سے اضافی حالتیں ہیں اور اس میں شاید ہی کوئی شبہ کیا جا سکے کہ وہ سنسکرت تے اور مے سے ماخوذ ہیں۔ تے اور مے سنسکرت میں بھی سمبندھی یعنی اضافی ہیں۔ اس لئے ان کے آخر کا "را" "کا" کی طرح ہے۔ جو اس لئے اضافہ کیا گیا ہے کہ ان کی اضافی حالت فراموش کر دی گئی اور یہ سمجھا گیا کہ یہ فاعلی حالت میں ہیں۔

تجھ پراکرت اور اپ بھرنش میں بھی ہے اور یہ سنسکرت تبھیم سے لیا گیا ہے لیکن پالی کی راہ سے۔ پالی میں یہ تہیم ہے۔ "یہ" قاعدے کے مطابق "جھ" ہو گیا ہے۔ مجھ سنسکرت مہیم سے ماخوذ ہے۔ اس کے شروع میں پیش تجھ پر قیاس کر کے لایا گیا ہے یا اپ بھرنش مجھُ کے آخر سے لے لیا گیا ہے۔

فارسی کی طرح اردو میں بھی صرف دو اشارے ہیں۔ قریب کے لئے یہ اور بعید کے لئے وہ۔ ان میں سے وہ اردو میں بطور ضمیر بھی مستعمل ہے۔ اس کی آپ بیتی سطور بالا میں ملاحظہ فرما چکے ہیں۔ یہ اور پیش نظر رہے کہ یہ اور وہ میں جو اختلاف حرکت ہے وہ قرب اور بعد ظاہر کرنے کے لئے ہے۔ زیر کو قرب سے ایک طرح کا فطری اور ذاتی لگاؤ ہے اور پیش کو بعد سے۔ اسمائے اشارہ اکثر

زبانوں میں قریب کے لئے مکسور ہیں اور بعید کے لئے مضموم یا مفتوح - خوارسی کا این قریب کے لئے ہے اور آن بعید کے لئے - انگریزی دِس اور دیٹ کا بھی یہی حال ہے - سنسکرت میں اِدَم قریب ہے اور اَدَس بعید اس میں بھی ے اور ے کا فرق ہے) میرا خیال ہے جس طرح وہ اس سے بنا ہے یہ غالباً اس (سنسکرت الیشہ) سے لیا گیا ہے - اِس اور اُس کی حرکات کا اختلاف این اور آن کا سا ہے اِس کی جمع اِن ہے اور اُس کی اُن - ان میں بھی زبر اور پیش کا فرق ہے - اردو میں خاص طور سے دوری کو پیش سے ظاہر کیا گیا ہے -

یہ کے ارتقائی درجے یہ ہوں گے - یہ ایہ اِس ایس ایشہ - جس طرح اوہ سے الف گر گیا تھا اور اس کا پیش واؤ کو مل گیا تھا - ایہ کا زیر "ی" کے حوالے ہو گیا ہے - یہ اور وہ کی ترکیب سے اردو اور پراکرت میں بہت سے الفاظ بنے ہیں اور کہیں یہ کی جگہ صرف اِ رہ گیا ہے اور وہ کی جگہ آ چند مثالیں ملاحظہ ہوں -

یہاں اور وہاں کی اصل ہے یہ + ہاں اور وہ + ہاں - ان میں یہ کی "ی" اور وہ کا "و" باقی بچا ہے - ہاں اصل میں ستھان (بمعنی جگہ) تھا جو سنسکرت ستھا (ٹھہرنا) سے بنا ہے - ستھاں کے ابتدائی تین حروف تخریب صوتی نے کتر دئے اس لئے ہاں کا پہچاننا دشوار ہو گیا - پنجابی اِتھے اور اُتھے اِ + تھے اور ا + تھے تھے - ان میں اِس کا "اِ" اور اُس کا "اُ" باقی رہا دوسرے حروف تخریب کی نذر ہو گئے - ستھاں کا سین اور نون حذف ہو کر تھا رہا جو ہندی ٹھاں - ٹھاں اور ٹھور کی شکل میں اب بھی موجود ہے - ادھر اور اُدھر کا حال بھی یہی ہے - دھر سنسکرت تر کی بگڑی ہوئی صورت ہے - پالی میں عام طور سے سنسکرت ت دھ کا روپ اختیار کر لیتی ہے

جیسے نرت (ناچنا) پالی میں نژدہ ہے ۔ ادھر سنسکرت میں اتر ہے جو "ا" اور "تر" سے مرکب ہے ۔ آ غالباً اوس کی تخفیفی صورت ہے اور تر کے معنی طرف اور جانب کے ہیں ۔ ادھر تتر کا بدل اور اس کا قائم مقام ہے ۔ اس میں ت دہ کے لئے ہیں اور تر دھر کے لئے ۔ اردو میں دہ اور یہ کی جگہ ان کے ہم معنی سنسکرت اشارے یعنی وہ کلمے جن سے دہ اور یہ وضع ہوئے ہیں استعمال نہیں ہوتے ۔ اب سے غالباً چارسو سال پہلے عام طور سے ہندوستان کی مختلف بولیوں میں یہ مستعمل تھے مگر اب متروک ہیں ۔ قدیم اودھی میں جو ملک محمد جائسی اور تلسی داس کی زبان ہے حسب ذیل اشارے ملتے ہیں ۔

تنہ (ان) تاہ (اس کو) تہاں ۔ تہواں (وہاں) تاہیم (ان میں)

تہاں بالکل اردو وہاں ہے ۔

دو لفظ اور دیکھئے ۔ ایسا اصل میں ایہ + سا تھا ۔ فارسی ایں سان اس سے کس قدر قریب ہے ۔ بہت ممکن ہے دونوں کی اصل اور ان کا سرچشمہ ایک ہو ۔ کبھی کبھی یہ خیال ہوتا ہے کہ فارسی سان اور سنسکرت تھا دونوں ایک ہیں ۔ یہ پہلے عرض کیا جاچکا ہے کہ س اور ت میں خاص تعلق ہے اور مثال کے طور پر یونانی سو پیش کیا جاچکا ہے ۔ جو تمام علماء لسانیات کے نزدیک تو کا ایک روپ ہے ۔ اس کے ساتھ ہی تائید میں سنسکرت فعل حال کی گردان بھی دی جاچکی ہے جس میں صیغہ واحد غائب کا لاحقہ تی ہے حالانکہ ضمیر واحد غائب سہ ہے ۔ اس سے یہ قیاس کرنا بیجا نہیں کہ س ت کی جگہ ہے یا ت س کی جگہ ۔ انگریزی میں غائب کے صیغے میں "S" یعنی س ہے جیسے He likes (وہ پسند کرتا ہے) He runs (وہ دوڑتا ہے) وغیرہ سنسکرت کے صیغوں میں یہاں تی ہے ۔ سنسکرت میں جہاں س ہے ۔ انگریزی میں وہاں

تھ ہے۔ مثلاً گھس (تو جاتا ہے) انگریزی میں thou ہے۔ یہ اتفاق نہیں ہو سکتا۔ س اور ت میں ضرور کوئی رشتہ ہے۔

ویسا کی اصل ہے وہ + سا۔ یہ غالباً سنسکرت تتھا سے ماخوذ ہے۔ اس میں وہ فارسی کی طرح وے ہو گیا ہے۔ اس سے وے (جمع وہ) کی اصل کا سراغ بھی لگتا ہے اور یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ کسی زمانے میں وہ اور وے ساتھ ساتھ مستعمل تھے۔ مگر اب وے متروک ہے۔ یہی حال فارسی وے کا ہے۔ وہ اکیلا بہت کم استعمال ہوتا ہے۔

سنسکرت کا ایک لفظ ایوم ہے جو پنجابی ایوں کی اصل ہے۔ اس میں م نون سے بدل گیا ہے۔ فارسی ایں کی اصل بھی اِم ہے۔ نون میم کے بدلے میں ہے۔ اِمروز میں ایں کی جگہ اِم ہی استعمال ہوا ہے۔ اردو کا یونہی سنسکرت میں ایومیو (ایوم + ایو) تھا۔ ایوم کا یوں ہوا اور ایو کا ہی۔ ہی سنسکرت ہِ سے بھی ماخوذ ہو سکتا ہے۔ یہ بعض الفاظ کے آخر میں تحقیق و تاکید کے لئے اضافہ ہوتا ہے۔ بعض عالموں نے ہی کو سنسکرت اَپ سے نکالا ہے۔ لیکن یہ صحیح نہیں۔ اردو کا بھی سنسکرت اَپ کی پیداوار ہے۔ ڈاکٹر سکسینہ ہی کو ایو اور ہِ کی ترکیب و تالیف کا نتیجہ بتاتے ہیں۔ ان کے نزدیک اس کے ارتقائی حلقے یہ ہیں:

ایو - اے - ای - ہی -

اُردو میں حرف موصول صرف ایک ہے یعنی جَ جو سنسکرت یَ کی بدلی ہوئی صورت ہے۔ علمارِ لسانیات کا کہنا ہے کہ جدید ہند آریائی زبانوں کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں تقریباً ہر جگہ سنسکرت یَ نے جَ کا روپ اختیار کر لیا ہے۔ مثلاً سنسکرت یتن اردو میں جتن ہے اور یمنا کو عالم اور عامی بھی

جنتا کہتے ہیں۔ اور بھی بہت مثالیں ہیں جن کا ذکر تطویل کا باعث ہوگا۔ بہر حال یہ جو سنسکرت ہی میں ہو تو بھی ہے ہمارے جو کی اصل ہے۔ جس اور جن وغیرہ اسی طرح بنائے گئے ہیں۔ جیسے اس اور ان بنائے گئے تھے۔ ان۔ جن وغیرہ کے آخر کا ن علامت جمع ہے جو تمام ملکی زبانوں میں اسم اور ضمیر کے آخر میں الحاق کیا جا رہا ہے۔ س خصوصیت کے ساتھ اردو میں مفرد کی علامت ہے۔ مگر مغیرہ یعنی غیر فاعلی حالتوں میں۔ ملاحظہ فرمائیں۔

جو۔ جس۔ جن۔ کون۔ کس۔ کن۔ (وہ) اس۔ ان۔ (یہ) اِس۔ اِن۔ وغیرہ۔ وہ اور یہ قوسین میں دئے گئے ہیں۔ اس لئے کہ ان کی اصل آہ اور اِہ ہے۔ ان کی غیر فاعلی حالت اُس اور اِس ہے۔ یہ اصل کی وجہ سے ہے ورنہ وس اور دِس ہونی چاہئے تھی (غیر شستہ اور گنوار زبان میں آج بھی وِس کہتے ہیں)

اسم موصول کی ترکیب سے جو الفاظ بنے ہیں ان میں سے چند یہ ہیں۔

جہاں اصل میں جو + ہاں تھا۔ جدھر جو اور دھر سے بنا ہے اور سنسکرت یتر کے قائم مقام ہے۔ جیسا جے + سا تھا جو نہ صرف یتھا کے ہم معنی ہے بلکہ اسی کو توڑ مروڑ کے بنایا گیا ہے۔

ظروف کو لیجئے۔ اب اصل میں اَدھنا تھا۔ نا آخر سے گرا دیا گیا۔ یہ ایک طرح کا عمل تخفیف ہے جو ہماری زبان میں جاری رہا ہے۔ سنسکرت گرامر کی پیچیدگیاں سب اسی کی نذر ہوئیں۔ مورتی کی ی گری تو مورت بنی۔ لاتر کی ر صاف ہوئی۔ بھگنی کو بہن اسی نے بنایا۔ ادھنا میں تخفیف دو طرح ہوئی۔ نا گرا اور دھ ب سے تبدیل ہوا۔ اس طرح اب تیار ہوا۔ اول اور آخر سے حرف علت حذف ہوا اور دہ صرف ہ رہا۔ اس طرح پنجابی کا ہن بنا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اب اِدانیم ہو۔ اس صورت میں الف پر زیر ہونا چاہئے۔ شاید گنوار زبان

میں اب کا تلفظ جو کسرہ الف سے کیا جارہا ہے وہ اسی وجہ سے ہے۔ اب رہا یہ کہ دال کا تبادلہ ب سے کیسے ہوا؟ سو یہ ممکن ہے کہ جب اور تب اصل میں یدا اور تدا تھے۔ آخر سے الف تو گرا ہی تھا دال نے بھی چولا بدل دیا۔ برج وغیرہ پڑی زبانوں میں دال مدتوں قائم رہی اور اردو میں بھی استعمال ہوتی رہی۔ میر حسن کا شعر ہے۔

لب جو پہ آئینے میں دیکھ قد　　　　اکڑنا کھڑے سرو کا جد نہ تد

جب تک اور تب تک کی اصل۔ جیسا کہ اس سے پہلے عرض کیا گیا۔ یاوت اور تاوت ہے۔ وت کا و تو ت سے بدلا تھا۔ ت نے ک کا روپ اختیار کر لیا۔ واؤ اور ت کا تبادل وتے کے سلسلے میں زیر بحث آچکا ہے۔ ت اور ک میں بھی اکثر تبادل ہوا ہے۔ سامی زبانوں میں بھی اور آریائی زبانوں میں بھی۔ اکثر لوگ عربی کان کا تلفظ تان کرتے ہیں۔ ادھر عربی سکنت اشوری میں سکنک بولا جاتا تھا۔ عربی میں آج بھی ت اور ک دونوں مخاطب کے لئے ہیں۔ سنسکرت میں کتا کُکر ہے اور مجھے یقین ہے کہ یہی کُکر اردو میں کتا ہو گیا ہے۔

جب اور تب کی اصل کم سے کم یاد اور تاد ضرور ہے۔ سنسکرت کا د اردو میں ہر جگہ ب ہو گیا ہے۔

کبھی کد آپ تھا اور بھی اب۔ ب اور پ گویا واحد ہیں۔ پ کو اسی لئے بائے فارسی کہتے ہیں۔ یہ ایک دوسرے سے اکثر بدلتی رہی ہیں۔ ابھی بالکل مختلف لفظ ہے۔ وہ اب اور ہی کا مرکب ہے اور ان دونوں لفظوں کی سرگزشت الگ الگ دی جا چکی ہے۔ ابھی کی طرح ہی کی ترتیب سے اردو میں اور الفاظ بھی بنے ہیں۔ وہی (وہ + ہی) یہی (یہ + ہی) تبھی (تب + ہی) جبھی (جب + ہی) سبھی (سب + ہی) وغیرہ۔

سب کی اصل سرو ہے۔ ر کی تخفیف ہوئی اور و ب سے بدل گیا۔ سنکرت و تقریباً ہر جگہ پراکرت عہد ہی میں ب سے بدل گیا تھا۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔ بدیا سنسکرت میں ودیا ہے۔ بات وارتا تھا۔ اس میں اس ترتیب کے ساتھ تبدیلیاں ہوئیں۔ وارتا۔ بارتا۔ بارت۔ بات۔ بنا کی تبدیلیاں بھی غور کے قابل ہیں۔ ونا۔ بنا۔ بن۔ بہو سنسکرت ودھو کی پیداوار ہے۔ جس میں و کو ب سے بدلا گیا ہے اور دھ کو ہلکا کرکے ہ کی صورت میں باقی رکھا گیا ہے۔

حروف استفہام میں سے کیا کِم تھا اور کون کہ۔ کیا سے کیسا کدھر اور کہاں وغیرہ الفاظ بنے۔ کون کی گردان اوپر دی جاچکی ہے۔ کب کی اصل کدا ہے جو سنسکرت کداپ میں بھی موجود ہے۔ کیسا سنسکرت میں کتھا ہے۔ کیوں شاید ک اور ایوم کی ترکیب سے بنا ہے۔

اس تفصیل سے ظاہر ہوا کہ اردو میں حرف استفہام صرف ک ہے جو دوسرے حروف کے ساتھ مل کر مختلف معنی ادا کر رہا ہے۔ اسی طرح حرف موصول ج ہے۔ رہے ظروف سو وہ دو ہیں۔ ایک "ا" دوسرے ت جن میں ت اشارہ بعید ہے اور آ اشارہ قریب ہے۔ اگر تمام الفاظ متعلقہ کو سمیٹ کر یکجا کیا جائے تو وہ ذیل کے حروف ہوں گے۔

(۱) س یا ہ۔ ت۔ م — یہ ضمیریں ہیں۔ س یا ہ غائب کے لئے ت حاضر کے لئے اور م متکلم کے لئے

(۲) ج یا ی۔ — اسم موصول کے لئے۔

(۳) ک۔ — استفہام کے لئے۔

یہ بھی ممکن ہے کہ ان سب حروف کی اصل اور ان کا سرچشمہ کوئی ایک

حرف ہو جس نے یہ انوپ روپ اختیار کر کے وحدت کو کثرت کا رنگ دیا ہو۔ بقول غالبؔ :-

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی
چمن زنگار ہے آئینۂ باد بہاری کا

اُردو کی صَرفی نحوی استواری

اردو دنیا کی کسی ترقی یافتہ زبان سے پیچھے نہیں۔ یہ صرف گھروں اور بازاروں ہی میں ہمارا ساتھ نہیں دیتی اور شعر و سخن کی محفلوں میں زبان کے جوہر نہیں دکھاتی بلکہ خاص علمی صحبتوں، فلسفہ، سائنس اور قانون کے اداروں، تجارت صنعت اور دوسرے کاروباری دھندوں میں بھی ویسی ہی بڑھ بولا اور چونچال ہے۔

لیکن ہماری غفلت کا یہ حال ہے کہ ہم اس کی بابت کچھ نہیں جانتے اور نہ جاننے کی کوشش کرتے ہیں۔ بقول شخصے "ہمیں آم کھانے ہیں پیڑ گننے سے فائدہ؟" ہماری ضرورتیں جب تک اس زبان کے ذریعہ پوری ہوتی ہیں۔ ہم اپنے دل کی باتیں جب تک حسن و خوبی کے ساتھ اور موثر انداز میں اس کی مدد سے ادا کر سکتے ہیں اس کھود کرید کی کیا ضرورت ہے کہ ہماری زبان میں یہ زور، یہ اثر۔ یہ جادو بیانی، یہ گوناں گوں پہلو۔ لفظوں کے یہ آتشیں پیکر۔ نازک، گہرے اور گمبھیر اسلوب، کٹیلے تیور، حسین و جمیل ترکیبیں کہاں سے اور کیسے آئیں۔ یہ مفت کی دردسری ہے

اور تو اور ہمارے باخبر زباں داں ادیب و نقاد یہ سمجھے ہوئے ہیں کہ ہماری زبان کا موجودہ رنگ و روپ اور ابھار و نکھار یہی سو ڈیڑھ سو سال کی بات ہے۔ اول تو وہ اس زبان کو تمام تر مسلمانوں کی ساختہ، پرداختہ بتاتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ مسلمانوں کی آمد سے پہلے اردو کا وجود ہی نہیں تھا۔ یہ کوئی زبان ہی نہ تھی۔ مسلمانوں نے بنا کر اس کو کھڑا کیا۔ معلوم نہیں اردو سے ان کی کیا مراد ہے۔ زبان یہ کسے کہتے ہیں۔ ان بزرگوں نے کبھی اس کی وضاحت نہیں کی۔ وہ صرف یہ بتاتے ہیں کہ اردو مسلمانوں کی وضع کردہ ہے۔ وہ اس بات کو مختلف طریقوں سے کہتے ہیں۔ لیکن یہ نہیں بتاتے کہ اردو کیا چیز ہے۔ اور مسلمانوں نے اسے کیسے وضع کیا۔ میں نے روٹی کھائی، میں گھر جا رہا ہوں۔ میرا پاؤں دکھتا ہے اگر یہ جملے اردو زبان کے ہیں تو ان کے وضع کرنے میں مسلمانوں کا کیا ہاتھ ہے۔

غالب کا یہ شعر بھی غالباً اردو ہی ہے ؎

جب نہ ہو کچھ بھی تو دھوکا کھائیں کیا　　　لاگ ہو تو اس کو سمجھیں ہم لگاؤ

آج تک مجھے معلوم نہ ہو سکا کہ جو لوگ اردو کو مسلمانوں کی ساختہ زبان بتاتے ہیں وہ کیا یہ کہنا چاہتے ہیں کہ غالب نے اوپر کے شعر میں جو بات کہی ہے وہ مسلمانوں کی آمد سے پہلے ان الفاظ میں اور اس ترکیب کے ساتھ نہیں کہی جا سکتی تھی۔ اگر یہ بات ہے تو پھر وہ یہ بھی کہیں گے کہ اس شعر کے الفاظ اسما ہوں کہ افعال، حروف ہوں کہ ضمیریں سب مسلمانوں نے وضع کیے۔ مثلاً لاگ، لگاؤ، دھوکا اور کچھ یہ اسماء۔ پہلے اردو میں نہ تھے تو، جب، نہ، بھی، کیا، کو۔ وغیرہ حروف بھی نہ تھے۔ اس، ہم۔ یہ ضمیریں بھی نہ تھیں۔ ہوا، سمجھیں، کھائیں وغیرہ افعال بھی نہ تھے۔ اول اول مسلمانوں نے ان کو بنایا۔ ان کا وجود مسلمانوں کا شرمندۂ احسان ہے۔ یا یہ الفاظ کسی ایک جگہ ایک زبان کی شکل میں نہ تھے۔ ہندوستان کی بہت سی بولی جانے والی زبانوں میں بکھرے ہوئے تھے۔ مسلمانوں نے ان کو ادھر ادھر سے سمیٹ کر یکجا کیا۔ اور ان سے

اُردو کا کالبد تیار ہوا۔ گویا مسلمانوں نے اُردو کی مشہور کہاوت کے مطابق، کہیں کی اینٹ کہیں کا روڑا۔ بھان متی نے کنبہ جوڑا۔ بھان متیوں کی طرح لفظوں اور محاروں کے روڑوں سے زبان اردو کا کنبہ جوڑا۔

یہ دونوں باتیں غلط ہیں۔ نہ مسلمانوں نے الفاظ وضع کئے اور نہ انھیں اِدھر اُدھر سے سمیٹا۔ یہ الفاظ وضع نہیں کئے جا سکتے اس لئے کہ ان کی بڑی پرانی تاریخ ہے۔ یہ صدیوں سے سرزمین ہند و پاکستان میں بولے جاتے ہیں۔ اب سے ڈھائی ہزار برس پہلے یہ الفاظ یہاں موجود تھے۔ لیکن ان کی شکل یہ نہ تھی۔ ان کا موجودہ روپ صدیوں کے بگاڑ کا نتیجہ ہے۔ ایام کی الٹ پھیر کا اثر ہے۔ ان کو زمانے کی ریہ نے کھا چاٹ کر صاف کیا ہے۔ دوسری زبانوں سے لینے کا سوال بھی نہیں اُٹھتا۔ ایک تو یہ بات بڑی مضحکہ خیز ہے کہ مسلمان ان الفاظ کی تلاش میں گھومتے رہے۔ اور ادھر اُدھر سے جمع کرتے رہے۔ پھر ایک جگہ بیٹھ کر سلیقے کے ساتھ انھوں نے انھیں جوڑا اور اس طرح زبان کا ہیولی تیار کیا۔ دوسرے یہ الفاظ اس صورت میں اور کہیں ہیں بھی نہیں، مثلاً "سے" ایک چھوٹا سا حرف ہے دوسری زبانوں میں اس کی یہ شکلیں ہیں۔

بنگالی۔ ہوئیتے۔ تیں۔

سندھی۔ کھاں، کھوں، تاں، توں۔

پنجابی۔ تیں۔ تھیں۔ تھوں۔

گجراتی۔ تھی۔

مرہٹی۔ ہوں۔

مالوائی۔ سوں۔

چلپاوتی۔ سن۔ سین۔

برج بھاشا۔ ستے۔

اُردو " سے " ان میں سے کسی سے بھی جوڑ نہیں کھاتا۔ اردو میں " سے " ساتھ کے معنی میں ہے۔ اس کے ہم معنی حروف دوسری زبانوں میں یہ ہیں:۔

سُوں (برج) سی یا سیں (قدیم مرہٹی) سوں (قدیم ہندی) سَن (جدید مرہٹی) شوں یا شیوں (گجراتی) سیں۔ ساں (سندھی)

ان میں سے کسی ایک کو بھی اردو " سے " کا ماخذ نہیں ٹھہرا سکتے۔ اردو " سے " اور اس کے ہم معنی تمام حروف کی اصل ایک اور قدیم حرف " سَم " ہے۔ یہ حروف سب ایک اصل سے پھوٹی ہوئی شاخیں ہیں۔ اس لئے ایک دوسرے سے اتنے مشابہ ہیں۔

ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ مسلمانوں نے اردو کو جو ایک کم مایہ اور گری ہوئی زبان تھی، اور صرف روزانہ بات چیت کے کام کی تھی اُٹھا کر کھڑا کیا اور بنا سنوار کر اور عربی فارسی الفاظ کے وسیع ذخیرے سے اس کا دامن بھر کر اس قابل بنایا کہ وہ علم و ادب، سائنس اور فلسفہ کے اعلیٰ خیالات کو اچھی طرح ادا کر سکے۔ لیکن اس صورت میں یہ کہنا صحیح نہیں کہ اُردو مسلمانوں کی ساختہ پرداختہ ہے۔ بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ مسلمانوں کی " پرداختہ " ہے۔ اگر صرف اتنی سی بات سے کہ مسلمانوں نے فارسی عربی الفاظ دیکر اردو کو مالا مال کیا۔ اردو مسلمانوں کی ساختہ ہو سکتی ہے۔ اور محمد غوری کی فتح دہلی کو اس کا " جنم دن " قرار دیا جا سکتا ہے تو فارسی بھی مسلمانوں کی ساختہ ہے۔ اور ترکی بھی۔ اور ہند و پاکستان کی زبانوں میں سے پشتو، سندھی، پنجابی، گجراتی، بنگالی سبھی مسلمانوں کی ساختہ پرداختہ ہیں۔ اس لئے کہ ان زبانوں میں بھی فارسی، عربی عناصر کی کمی نہیں۔ انھیں بھی مسلمانوں نے بڑے ناز و نعمت سے پالا اور پرورش کیا ہے۔ فرق صرف قلت و کثرت کا ہے، اردو میں فارسی عربی الفاظ کسی قدر زیادہ ہیں اور ان زبانوں میں کم۔ اگرچہ ان میں سے بعض مثلاً بنگلہ میں فارسی عربی الفاظ کا تناسب سو سوا سو سال پہلے خاصا اچھا تھا۔

بہر حال اردو مسلمانوں کی ساختہ نہیں۔ اور اس کا محمود غزنوی اور محمد غوری کی

داخلہ ہند سے جوڑ لگانا بے جوڑ بات ہے۔ اردو یہیں کی پیداوار ہے۔ مسلمانوں کی آمد سے پہلے بھی نہیں تھی۔ اور محمود شیرانی جیسے محقق کے خیال میں۔ صرف دہلی اور میرٹھ کے علاقوں میں بولی جاتی تھی۔" اس کا سکہ بازاروں میں چلتا تھا۔ لین دین اسی میں ہوتا تھا۔ مسلمانوں نے نوک پلک سے اسے درست کیا۔ اس میں اضافے کیے۔ اس کو الفاظ اور مرکبات کا بڑا ذخیرہ دیا۔ بازاروں سے محلوں میں اور محلوں سے درباروں میں پہنچایا۔ بس اتنا کام مسلمانوں کا ہے۔ اگر ساختن پرداختن یہی ہے تو ہزار بار یہ زبان مسلمانوں کی ساختہ پرداختہ ہے۔

جہاں یہ صحیح نہیں کہ اردو کا آغاز اس وقت ہوا جب مسلمان فاتحانہ شان سے ہندوستان آئے وہاں یہ بھی غلط ہے کہ اردو اورنگ زیب کے زمانے تک ایک خام اور ناتمام حالت میں تھی، اس میں پختگی کا رنگ عہد محمد شاہ میں آیا۔ ہمارے ادب کے نقاد زبان اور ادب میں فرق نہیں کرتے۔ وہ ادب کی تاریخ کو زبان کی تاریخ اور ادب کے آغاز کو زبان کا یوم میلاد قرار دیتے ہیں اس میں شک نہیں زبان میں وسعت ادب کے ساتھ آتی ہے۔ زبان ادب سے غذا، قوت، توانائی اور پرداز حاصل کرتی ہے۔ جوں جوں کسی زبان میں ادب پیدا وار بڑھتی ہے۔ زبان پھلتی، پھولتی اور پھیلتی جاتی ہے۔ اس میں بیان کی راہیں کھلتی جاتی ہیں۔ نئے نئے اسلوب پیدا ہوتے جاتے ہیں۔ لیکن زبان میں ادب پیدا ہی اس وقت ہوتا ہے جب وہ تمام اور پختہ ہو جاتی ہیں۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ولی کے زمانے میں اردو "سیال حالت میں تھی اور اس کی تشکیل ہو رہی تھی" وہ شاید سیال کے معنی نہیں جانتے۔ زبان کے مزاج اس کی بناوٹ اور ارتقا کے عمل کو نہیں پہچانتے۔ اس مسئلہ کا اردو کی پوری تاریخ سے تعلق ہے۔ آغاز سے بھی اور ارتقا سے بھی، اردو اگر مسلمانوں کی آمد کے ساتھ وجود میں آتی تو شاید یہ کہنا صحیح

ہوتا کہ وہ اٹھارویں صدی کے شروع میں یا سترھویں صدی کے آخر میں سیال حالت میں تھی، ایک بچہ تھی. جس کے اعضا میں ابھی سختی اور توانائی نہیں آئی تھی۔ بات کہنے کے انداز مقرر نہ تھے، جو اردو کو قدیم زبان جانتے ہیں۔ اور جن کے خیال میں بڑی منزلیں مار کر وہ یہاں تک پہنچی ہے وہ کبھی یہ بات نہیں مان سکتے۔ اردو کے سیال حالت میں ہونے کے صرف ایک ہی معنی ہیں، وہ یہ کہ اس میں اس وقت بے تکاپن تھا۔ نہ اس میں صرفی نحوی انضباط تھا۔ اور نہ اشتقاق کا کوئی ٹکا بندھا ضابطہ ہی تھا۔ اردو کے عام اور بہت زیادہ استعمال میں آنے والے حرف "نے" کو لیجیے اس کے متعلق بڑے ذمہ دار عالموں نے جو زبان کے مسائل سے پوری پوری واقفیت رکھتے ہیں۔ اس قسم کی باتیں کہی ہیں۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق صاحب کا بیان ہے کہ "میر و مرزا کے زمانے میں" "نے" کے استعمال میں بڑی بے قاعدگی پائی جاتی تھی۔ اس کے استعمال کے قواعد حال میں منضبط ہوئے ہیں۔ مشہور محقق گریرسن نے تو ٹھیک ٹھیک تدوین کی تاریخ بھی بتا دی ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ "نے" کے استعمال کے قواعد سب سے پہلے ۱۷۷۸ء میں مرتب ہوئے۔ اردو کی ایک گرامر بنگالی زبان میں اسی سنہ میں تصنیف ہوئی۔ اس میں یہ تصریح ہے کہ فعل متعدی ماضی کے ساتھ "نے" کا استعمال ہونا چاہیے۔[۱]

اہل علم کی ان تصریحات سے غالباً لوگوں کے ذہن میں یہ شبہ جڑ پکڑ گیا کہ اٹھارویں صدی کے آخر تک زبان کا ایک معیار مقرر نہ ہوا تھا۔ ان عالموں کو دھوکا اس زمانے کی اردو نظموں سے لگا۔ یہ زمانہ اردو شعر و شاعری کے آغاز کا تھا۔

اس عہد کے شعراء کے سامنے دکنی شعر کے سوا کوئی اور نمونہ نہ تھا۔ زبان کا معیار تو تھا لیکن ریختہ شعر گوئی کا کوئی معیار نہ تھا۔ شعراء ریختہ فارسی عروض کی کڑی پابندیوں

---

[۱] جنرل ایشیاٹک سوسائٹی بنگال ۱۸۹۳ء ص ۴۹

سے مجبور ہو کر زبان میں بہت کچھ تصرف کر لیتے تھے اور اس کو ضرورت شعری کے تحت جائز سمجھتے تھے۔ اودھ کی کتابوں میں ان لسانی تصرفات کی بہت سی مثالیں ہیں اور زیادہ تر متقدمین کے کلام میں ہیں۔ مثلاً متحرک کو ساکن یا ساکن کو متحرک کرنا۔ کسی ایک حرف کو گرا دینا۔ لفظوں کی نحوی ترتیب بدلنا۔ مذکر کو مونث یا مونث کو مذکر باندھنا۔ فاعل جمع کے لئے فعل مفرد لانا۔ کسی فارسی یا عربی لفظ کی ہندی لفظ کی طرف اضافت اور اسی قسم کے بہت سے تصرفات جن کی تفصیل کے لئے وقت چاہیئے۔ یہ تصرفات صرف شعر میں ہوتے تھے نثر میں جائز نہ تھے۔ بات چیت میں زبان کے تمام اصول اور قاعدوں کی پوری پوری رعائت کی جاتی تھی۔

بالکل یہی حال حرف "نے" کا بھی ہے۔ یہ صرف شمالی ہند کی زبان یعنی اردوئے معلی شاہ جہاں آباد میں ماضی متعدی کے ساتھ ٹھیک ٹھیک استعمال ہوتا تھا۔ اور پرتگالی زبان کی اردو گرامر کی تصنیف کے وقت بھی ہوتا تھا۔ اور اس سے پہلے بھی شاہجہاں آباد کی زبان میں کوئی بے قاعدگی نہ تھی۔ یہ اور بات ہے کہ اس وقت اس کے استعمال کے قواعد مدون نہ ہوئے تھے۔ قواعد بے شبہ اہل زبان کے استعمال کو دیکھ کر مرتب کئے جاتے ہیں۔ اور اسوقت مرتب کئے جاتے ہیں۔ جب زبان میں پختگی رونما ہوتی ہے۔ استعمال کے ٹکسال سے لفظوں کو چلن ملتا ہے۔ اور عوام کے دربار سے استعمالات کو سند دی جاتی ہے۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ پختگی رونما ہوتے ہی قواعد مرتب ہو جائیں ...... صرف اتنی سی بات ہے کہ "نے" کے استعمال کا اردو میں کوئی قاعدہ نہ تھا۔ رہی یہ بات کہ میر و مرزا کے یہاں اس کے استعمال میں بے قاعدگی پائی جاتی ہے۔ سو اس کی وجہ اوپر عرض کر چکا ہوں کہ شعرا وزن کی پابندیوں سے مجبور تھے۔ شعری ضرورت کے دباؤ میں اکثر وہ "نے" کو گرا دیتے تھے۔ اس عہد کی زبان میں بے تکا پن نہ تھا۔ میرے

میرے پاس اس کے کئی ثبوت ہیں۔ سب سے پہلے تو یہ کہ ۔ "نے" کی کیا خصوصیت ہے۔ اس عہد کے اشعار میں اور بھی الفاظ و حروف ضرورت شعری کی وجہ سے حذف ہوئے ہیں۔ یہ الفاظ و حروف اس عہد کی زبان میں شامل تھے۔ اور کوئی "نے" کی طرح ان کے استعمال میں بے قاعدگی کا قائل نہیں۔ اس کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں

کبھی "کے" (حرف اضافت) گرا دیا جاتا تھا۔ حاتم کا شعر ہے ؎

"وہ رکھے ہے رات دن جوں جاں مجھے
جس اُپر دینا ہے جاں آساں مجھے"

"جس اُپر" یعنی جس کے اوپر۔

حاتم ہی کا ایک شعر ہے ؎

"ہے شاکی رات اور دن نیند اس ہاتھ
عداوت ہے اسے نسیاں کے ساتھ"

"اس ہاتھ" یعنی اس کے ہاتھ۔

افضل جھنجھانوی کا بارہ ماسہ مشہور ہے جو حسب بیان شیرانی ۱۶۲۶ء کی تصنیف ہے۔ اس میں اذیل کا شعر بھی ہے ؎

تمامی لوگ مجھ بوری کہیں ری
خرد گم کردہ و مجنوں کہیں ری

مجھ کی جگہ "مجھ کو" چاہیے۔ "کو" حذف ہوا ہے۔

ذیل کے شعر میں "میں" حذف ہوا ہے۔

"وہی جانے کہ جس کے تن لگی ہے
برہوں کی آگ تن من میں رکی ہے"

تن لگی ہے یعنی تن میں لگی ہے۔

سے " کے حذف کی مثال حاتم کا یہ شعر ہے ؎

"جلا جوں پھلجھڑی اس ناتواں کوں
شرر لبریز کر ہر استخواں کوں"

شرر سے لبریز ہونا چاہئے تھا۔

ذیل کے دو شعر آرزو کے ہیں۔ ان میں سے ایک میں " کے " ہے اور دوسرے میں نہیں۔

(۱) رکھے سیپارہ دل کھول آگے عندلیبوں کے
چمن کے بیچ گویا پھول ہیں تیرے شہیدوں کے

(۲) مے خانے بیچ جا کے شیشے تمام توڑے
زاہد نے آج اپنے دل کے پھپھولے پھوڑے

نثر میں " نے " کا استعمال اردوئے معلیٰ شاہجہاں آباد میں بہت کم سے کم مجھے بے قاعدگی کی کوئی مثال نہیں ملی اس کے علاوہ تدمار کے باقاعدہ ہوا ہے۔ یہاں " لے " کا ترک اگر زبان کی ناتمامی کی وجہ سے تھا تو اس کے بعد جب " نے " کا استعمال قاعدہ کے مطابق اور صحیح ہونے لگا زبان میں پختگی اور ہمواری آگئی۔ اور " نے " کے استعمال کا قاعدہ بھی بن گیا۔ تو پھر اس کا ترک نہ ہونا چاہئے تھا۔ جب بیان گر یہ سن ۱۷۶۰ء میں اس کے استعمال کے قاعدے مرتب ہوئے۔ میر حسن نے ۱۷۸۵ء میں مثنوی بدر منیر لکھی ہے۔ اس کا ایک شعر ہے ؎

"ہر اک بات پر دل کو میں خوں کیا
تب اس طرح رنگیں یہ مضموں کیا"

جب ۱۷۶۰ء میں " نے " کے استعمال کا قاعدہ بن چکا تھا تو میر حسن نے ۱۷۸۵ء کے لگ بھگ کس لئے " نے " کا ترک کیا۔ اس کی صرف ایک ہی وجہ ہو سکتی ہے۔ اور وہ

میں اوپر بیان کر آیا ہوں۔

ظہور الدین حاتم کا زمانہ میر و مرزا سے بھی پہلے کا ہے۔ وہ مرزا کے استاد اور شمالی ہند کے دور اول کے شعراء میں سے ہیں" مجالس رنگین" کے حوالے سے مولانا آزاد نے "آب حیات" میں لکھا ہے کہ ایک روز اپنے شاگردوں کے مجمع میں حاتم نے فرمایا کہ رات کو خواب میں ایک شعر موزوں ہوا جو آنکھ کھلنے پر یاد رہا وہ شعر یہ ہے ؎

"سر کو پٹکا ہے کبھو سینہ کبھو کوٹا ہے
رات ہم ہجر کی دولت سے مزا لوٹا ہے

رنگین کہتے ہیں یہ میری جوانی کا زمانہ تھا۔ مزاج میں تیزی اور چالاکی زیادہ اور شعور کم تھا۔ میں نے بے تکلفی کے ساتھ عرض کیا۔ حضرت! اگر دوسرے مصرعے میں اس طرح ترمیم کر لی جائے تو بہتر ہے۔ ع

ہم نے شب ہجر کی دولت سے مزا لوٹا ہے

حاتم نے یہ سن کر میرے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا اور تحسین و آفریں کہی۔

اس واقعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس زمانے میں فعل ماضی (متعدی) کے ساتھ "نے" کا ترک معیوب سمجھا جاتا تھا۔ رنگین نے حاتم کے شعر میں جو ان کے استاد تھے ترمیم اس لئے کی کہ اس میں اردو محاورے کے خلاف "نے" چھوٹ گیا تھا۔ یہ واقعہ اٹھارویں صدی کے وسط کا ہے۔ اس سے جہاں معلوم ہوتا ہے کہ میر و مرزا سے بھی پہلے دہلوی زبان میں "نے" کا استعمال بہت باقاعدہ تھا وہاں یہ بھی ثابت ہو جاتا ہے کہ اس عہد کے شعراء فکر و سخن میں زیادہ کنج کاوی نہیں کرتے تھے۔ اور وزن شعر کی پابندیوں سے مجبور ہو کر کبھی کبھی خلاف محاورہ بعض الفاظ ترک کر دیتے تھے۔ اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ اس زمانے کی اردو کا کوئی معیار نہ تھا۔ وہ ناقص اور سیال حالت میں تھی۔

اس سلسلے میں یہ بھی عرض کر دوں کہ "نے" جیسا کہ دریائے لطافت میں ہے فعل متعدی پر دلالت کرتا ہے۔ اور صیغہ ماضی کے ساتھ مخصوص ہے۔ جو افعال اردو میں لازم بھی ہیں اور متعدی بھی ان کے ساتھ "نے" آتا بھی ہے اور نہیں بھی آتا۔ اس قسم کے دو فعل میرے ذہن میں ہیں۔ سمجھنا اور بولنا۔ سمجھنا جب لازم ہوتا ہے تو دریافت ہونا۔ یا جانا۔ اور عقل میں آنا کچھ اس قسم کے معنی ادا کرتا ہے اس وقت اس کے ساتھ "نے" نہیں آتا جیسے "اچھا! اب میں سمجھا" یعنی اب میری عقل میں بات آئی۔ "میں نے سمجھا تم جا رہے ہو۔ یہاں سمجھا متعدی ہے" بولنا" کا حال بھی یہی ہے۔ عام طور سے یہ لازم ہے اور لازم ہی استعمال ہوتا ہے۔ لیکن "اس نے جھوٹ بولا" اس قسم کے استعمالات میں یہ متعدی ہے۔ انشا کے زمانے تک دلی میں "بولا" (لازمی) کے ساتھ بھی "نے" آتا تھا۔ اسی لئے انشا نے اس کو خلاف قیاس بتایا ہے[۱]۔ خاکسار دہلوی میر تقی کے ہم عصروں میں سے ہیں۔ انکا ایک شعر تذکرہ گلزار ابراہیم میں ہے (صہ ۱۲۴) جس میں "بولا" (لازمی) کے ساتھ "نے" استعمال ہوا ہے ؎

کل مجھے قتل کر اس دشمن دیں کافر نے
بولا لوگوں سے یہ تھا مرد مسلمان عزیز

آج کل اس موقع پر اہل دہلی بھی "نے" نہیں بولتے۔

"نے" کے متعلق یہ ساری بحث ایک مثال ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اٹھارویں صدی کے آغاز میں جب دلی کے فارسی گو شعرا نے محاورہ اردوئے معلیٰ شاہجہان آباد کے مطابق ریختہ میں شعر کہنا شروع کیا تو اس وقت زبان خام یا نا تمام حالت میں تھی۔ وہ اس سے بہت پہلے گیارہویں صدی عیسوی ہی میں بن چکی تھی، سیال زبان کی اس حالت کو کہتے ہیں جب وہ ادھ کچری ہو۔ اور اس کے استعمالات کے

---

[۱] دریائے لطافت طبع دوم صہ ۲۶۳

ڈکے بندھے اصول نہ ہوں۔ اس زمانے کی اردو اس حالت میں نہ تھی جو نے" کی بابت بعض اہل علم کا یہ خیال کہ اس زمانے کی زبان میں اس کے استعمال کا کوئی قاعدہ نہ تھا۔ قارئین نے دیکھ لیا کہ صحیح نہیں۔ اس کے علاوہ ہیں اس عہد کی اردو میں کوئی بے تکا پن نہیں پاتا۔ زبان کا ارتقار اور اس کے لفظوں کا تراش خراش اور چیز ہے اس کا زبان کی پختگی سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ زبان کی زندگی ہے۔ دنیا کی کوئی چیز ایک حالت پر قائم نہیں رہتی۔ قدرت کے کارخانے میں سکون موت کا دوسرا نام ہے۔ تغیر زندگی کی زندگی ہے اور یہی دنیا کی سب سے بڑی حقیقت ہے۔ زندہ زبان برابر بدلتی ہے۔ جو کل تھی آج نہیں اور جو آج ہے کل نہ ہوگی۔ اگر یہ زبان کی ناتمامی اور اس کی سیالیت ہے تو پھر یقین کیجئے دنیا کی کوئی زبان بھی کسی وقت پختہ اور تمام نہ تھی۔ ہر زبان سیال ہے۔ اور جیسے اب سے دو صدی پہلے سیال تھی۔ آج بھی ویسی ہی سیال ہے۔ اور جیسے پہلے ناتمام تھی آج بھی ویسی ہی ناتمام ہے بیچاری اردو کس شمار میں ہے۔ اقبال کے لفظوں میں تو ساری کائنات ناتمام ہے

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید
کہ آرہی ہے دمادم صدائے کُن فیکون

"نے" کی سرگزشت

"نے" یوں تو ایک چھوٹا سا لفظ ہے، اس کی سرگزشت ہی کیا۔ لیکن اس چھوٹے سے لفظ کی اردو زبان کی تاریخ میں بڑی اہمیت ہے۔ اس میں اردو کی قدامت عہد کی داستان پنہاں ہے۔ یہ ہانکے پکارے کہہ رہا ہے کہ اہل نظر کہاں ہیں، آئیں اور میرے دل کو چیریں اور اس میں اردو زبان کے بیتے ہوئے دنوں کی داستان پڑھیں۔ میں نے رسالہ "اردو" کی کسی گزشتہ اشاعت میں وعدہ کیا تھا کہ میں اس لفظ کی کہانی قارئین "اردو" کو سناؤں گا کہ اتفاق سے جنوری سنہ ۱۹۵۲ء کی اشاعت میں ایک صاحب نے جو مری کالج کے استاد ہیں اس کی ایک مختصر سی روداد شائع کرادی۔ اس نے بقول شخصے "سمند ناز پہ ایک اور تازیانہ ہوا" مجھے اس پر آمادہ کیا کہ میں اس ہیچ اور بے مقدار لفظ کی داستان ذرا تفصیل کے ساتھ سناؤں اور ساتھ ہی ان غلط فہمیوں کا ازالہ بھی کردوں جو اس کے متعلق ہمارے اہل علم میں پیدا ہوگئی ہیں۔ یہ بے زبان تو کچھ نہیں کہہ سکتا۔ میں اس کی زبان بن کر اس کی مشکل حل کردوں۔

سب سے بڑی شکایت تو اس لفظ کو اپنے بزرگوں اور قدر دانوں سے یہ ہے کہ وہ اسے کل کا بچہ سمجھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اس کی عمر کچھ زیادہ نہیں۔ یہی اصدی دو صدی کی بات ہے کہ یہ نہ معلوم کہاں سے رمتے جوگی کی طرح گھومتا پھرتا اردو میں آیا۔ اردو نے اس کے لئے اپنی آغوش کھول دی اور بڑے چاؤ چونچلوں سے پال پوس کر اس کو بڑا کیا۔ اس کے حسب و نسب کا ٹھیک ٹھیک پتہ نہیں اور نہ یہ معلوم ہے کہ اس کا جنم کہاں ہوا۔ اس نے کس کی چھاتی کا دودھ پیا اور کس طرح اپنی ماں سے بچھڑ کر یہ اردو کی گود میں پہنچا۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق صاحب سے اس کو بڑی امیدیں تھیں وہ جانتا تھا کہ مولانا کو اردو سے کتنا پیار ہے۔ انھوں نے اس کی تربیت میں کیسی کیسی جان فشانیاں کی ہیں۔ اس کو خیال تھا کہ مولانا ضرور اس کو پہچانتے ہوں گے۔ اور اس کے حسب و نسب کا صحیح پتہ لگا کر بتائیں گے کہ یہ خاندانی ہے۔ اس نے اردو کے بڑے گھرانے میں جنم لیا ہے۔ بڑوں بڑوں کی آنکھیں دیکھی ہیں۔ اردو کے دوسرے الفاظ کے ساتھ پل کر بڑا ہوا ہے۔ لیکن اسے یہ دیکھ کر بڑا دکھ ہوا کہ مولانا نے بھی اسے کل کا چھوکرا سمجھا اور یہ لکھ دیا[1]۔ "فاعل کی علامت کے طور پر قدیم ہندی میں "نے" کہیں استعمال نہیں ہوا۔ اور ہندی کی پوربی شاخوں میں اس کا وجود نہیں تلسی داس تک کے کلام میں کہیں اس کا استعمال نہیں پایا جاتا۔ اس کا استعمال اس طور پر غالباً اس وقت شروع ہوا جب کہ اردو نے اپنا سکہ جمایا۔" مولانا کی اس تحریر سے مضمون نگار نے یہ نتیجہ نکالا کہ قدیم اردو میں "نے" نہیں تھا۔ دکن کی اردو قدیم اردو ہے۔" وہ تقریباً آج تک ویسی ہی سیکڑوں سال پرانی چلی آتی ہے۔" دلی کی زبان میں برابر ارتقا ہوتا رہا۔ اس لئے وہ بدل گئی۔ دکن والوں کو اردو

---

[1] قواعد اردو صفحہ ۱۶۰

کے اس ارتقا کا علم نہ ہو سکا۔ اس لئے وہ جوں کی توں رہی اور رد و بدل اس میں راہ نہ پا سکا۔ نے " اگر قدیم اردو میں ہوتا تو دکن کے مصنفین اس کو استعمال کرتے اور آج بھی روزانہ بول چال میں اس کا سراغ ملتا، لیکن یہ نہ دکن کے شعرا اور نثر نگاروں کے یہاں ہے اور نہ آج کی زبان میں۔ روزانہ بول چال میں اکثر اہل دکن کو یہ کہتے سنا ہے " میں کتاب میز پر رکھ دیا ہوں " ایک صاحب ہیں جنھوں نے علی گڑھ یونیورسٹی سے لسانیات میں پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری لی ہے۔ انھوں نے اپنے تحقیقی مقالے میں لکھا ہے " قدیم ہندی یا اردو ادب میں " نے " علامت فاعل کے طور پر کہیں استعمال نہیں ہوا ہے[1] "

مولانا عبدالحق صاحب سے " نے " کو بجا شکایت ہے۔ وہ اردو کے بڑے محقق ہیں۔ زبانوں کے مزاج شناس ہیں۔ لفظوں کی بڑی اچھی پرکھ رکھتے ہیں۔ کم سے کم انھیں تحقیق سے کام لینا چاہیے تھا اور حق و انصاف کا دامن ہاتھ سے نہیں دینا چاہیے تھا۔ یہ مانا کہ مولانا نے جو کچھ لکھا ہے اپنی طرف سے نہیں لکھا۔ انگریز محققوں میں سے جان بیمز اور گریرسن کی تحقیقات پر اعتماد کیا۔ بیمز نے غالباً سب سے پہلے یہ بادہوائی بات لکھی کہ " نے " جمعہ جمعہ آٹھ دن کا ہے۔ قدیم ہندی میں کہیں اس کا وجود نہ تھا۔ اس پر گریرسن نے حاشیہ چڑھایا۔ " بے شک یہ لفظ بھاشا میں اس معنی میں کبھی استعمال نہیں ہوا " لیکن مولانا عبدالحق صاحب کو اس کی تقلید کیا ضرور ی تھی۔ علی گڑھ کے ڈاکٹر لسانیات نے مولانا کی ہاں میں ہاں ملائی، اچھا کیا۔ مگر مولانا نے تو صرف اتنا لکھا تھا کہ " نے " قدیم ہندی میں استعمال نہیں ہوا۔ انھوں نے " قدیم اردو ادب " یہ الفاظ اپنی طرف سے بڑھا کر اپنے خیال میں اس کمی کو پورا کر دیا جو مولانا سے رہ گئی تھی۔ اردو کے مضمون نگار نے ایک قدم اور بڑھایا اور یہ لکھ مارا کہ " قدیم آریائی زبانوں میں " جن کا تعلق اردو کے شجرے سے

---

[1] تاریخ زبان اردو ص ۲۰۵

قریب یا بعید کا ہے" "نے" کا سراغ نہیں ملتا" اور اس پر غضب یہ کیا کہ یہ قول بھی مولانا کی طرف منسوب کر دیا۔ کہ مولانا نے "قواعد اردو" میں "نے" پر بحث کرتے ہوئے بتایا ہے کہ قدیم زبانوں میں اس کا نام ونشان نہیں۔ یہ سب کچھ ایک دوسرے کی تقلید سہی۔ نقل و حکایت سہی، لیکن اس نقل و حکایت میں بھی ان کرم فرماؤں نے کوئی نہ کوئی نئی اور انوکھی بات کہی ہے اور جدت کے شوق میں میری ہستی کو مٹانا اور مجھے ملیامیٹ کرنا چاہا ہے۔ لیکن میں تو غالبؔ کا ماننے والا ہوں اور بقول اس کے میرا مسلک ہے۔

نہ لڑ ناصح سے غالبؔ کیا ہوا گر اس نے شدت کی

ہمارا بھی تو آخر زور چلتا ہے گریباں پر

باتیں تو سبھی غلط ہیں لیکن ان سب سے زیادہ گمراہ کن اور بے اصل بات یہ ہے کہ "نے" کا قدیم آریائی زبانوں میں نشان نہ تھا۔ مولانا عبدالحق صاحب پر یہ اتہام ہے کہ انھوں نے "قواعد اردو" میں اس قسم کی کوئی بات کہی۔ مولانا ایسی غلط اور بے سروپا بات کبھی نہیں کہہ سکتے تھے۔ انھوں نے تو اسکے خلاف "قواعد اردو" ہی میں لکھا ہے کہ مرہٹی میں اس کا استعمال اردو یا ہندی کی طرح ہوتا ہے۔ وہ بھلا یہ کیسے لکھ دیتے کہ قدیم زبانوں میں "نے" کا نشان نہیں ملتا۔ آخر قدیم زبانوں سے آپ کی کیا مراد ہے؟ ہندوپاکستان کی جدید آریائی زبانیں قریب قریب سب ہم عمر ہیں، اور جو معمولی سی چھوٹ بڑائی ہے بھی وہ کچھ زیادہ قابل اعتبار نہیں۔ ان زبانوں کے ابھرنے اور نمایاں ہونے کا زمانہ دسویں صدی عیسوی کے بعد کا ہے۔ اس لحاظ سے یہ زبانیں ایک حیثیت کی ہیں۔ اگر آپ نے اردو کو کم عمر اور نوخیز سمجھ کر دوسری تمام آریائی زبانوں کو قدیم کہا ہے تو مرہٹی بھی ان کے ساتھ قدیم ہے۔ بلکہ زبان کی عام بناوٹ اور ارتقائی تاریخ کے لحاظ سے وہ

ہندوپاکستان کی دوسری جدید بولیوں کے مقابلے میں زیادہ قدیم ہے۔ مولانا عبدالحق صاحب کی اس تصریح کے بعد کہ مرہٹی میں " نے " اردو یا ہندی کی طرح استعمال ہوا ہے۔ آپ کا یہ کہنا کہ " نے " قدیم زبانوں میں نہیں اور اس کو مولانا کی طرف منسوب کرنا آپ کی بہت بڑی جسارت ہے اور اگر آپ کا مقصد یہ ہے کہ ہندوپاکستان کی موجودہ بولیوں میں سے کسی ایک میں بھی قدیم زمانے میں " نے " استعمال نہیں ہوا تو یہ بھی غلط ہے۔ مرہٹی میں " نے " اردو یا ہندی کی طرح قدیم زمانے میں مستعمل تھا اور جس طرح آج استعمال ہوتا ہے پہلے بھی استعمال ہوتا تھا۔ گیانیشور مرہٹی کا قدیم ترین شاعر تھا۔ اس کا زمانہ ۱۲۹۰ء کے لگ بھگ بتایا جاتا ہے اس کو امیر خسرو کا معاصر سمجھنا چاہیے۔ مرہٹی ادبیات میں، دو ایک کتبوں کو چھوڑ کر، سب سے زیادہ قدیم ادبی نمونہ اسی کا کلام ہے۔ بھنڈارکر نے کم سے کم چار مثالیں اس شاعر کے کلام سے پیش کی ہیں جن میں " نی " اردو " نے " کی طرح استعمال ہوا ہے۔ اس کے علاوہ اس کے یہاں " نیں " (بیائے مجہول) بھی ہے۔ لیکن یہ ضمیر کے ساتھ آتا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں[1]۔

" یے نیں مانیں " (اس معیار سے) " جے نیں تو شیں " (جس اطمینان سے)۔

" یے نیں پرسادیں " (اس عنایت سے) ان مثالوں میں " نیں " جو اردو " نے " کا ایک روپ ہے آلے یا ذریعہ کے معنی میں ہے اور یہی مفہوم اردو " نے " کا ہے۔ رسالہ " اردو " کے مضمون نگار نے اس کو دلائل و شواہد سے ثابت کیا ہے کہ " نے " اردو میں فاعل کی علامت نہیں بلکہ آلے یا واسطے کے لئے ہے۔

کچھ بعید نہیں کہ مضمون نگار یہ کہیں کہ قدیم زبانوں کے جو دو مفہوم بتائے گئے ہیں ان میں سے ایک بھی میرے ذہن میں نہ تھا۔ میرا منشا قدیم زبانوں سے سنسکرت

---

[1] فلالوجکل لیکچرز (۳۰۲)

پراکرت، اپ بھرنش اور قدیم ہندی (مغربی ہندی) وغیرہ زبانیں ہیں جو براہ راست اردو کے سلسلۂ نسب میں ہیں اور اردو نے جن سے ترقی پاکر اپنا موجودہ رنگ اختیار کیا ہے۔ چنانچہ میں نے اپنے منشار کی مزید وضاحت کے لئے قدیم آریائی زبانوں کے بعد یہ ایک توصیفی فقرہ بھی بڑھا دیا تھا "جن کا تعلق اردو کے شجرے سے قریب یا بعید کا ہے" اس پر بھی اگر کسی نے میرا منشا سمجھنے میں غلطی کی تو اس میں میرا کیا قصور ہے۔ اردو کے شجرے میں تو ہند و پاکستان کے سب ہی قدیم و جدید آریائی زبانیں ہیں۔ وہ بھی جو اردو کی ماں، نانی، پرنانی ہیں وہ بھی جو اس کی خالائیں ہیں اور وہ بھی جو اس کی بہنیں ہیں۔ ان سبھی زبانوں کا اردو کے شجرے سے تعلق ہے۔ کچھ ان میں سے قریب ہیں اور کچھ بعید۔ ہاں! اردو کے سلسلۂ نسب (Lineage) میں صرف وہ زبانیں آتی ہیں جن سے ترقی پاکر اردو بنی اور جنھیں اردو کی ماں، نانی، پرنانی وغیرہ کہا جاتا ہے۔ یعنی سنسکرت (قدیم آریائی) شورسینی پراکرت، شورسینی اپ بھرنش اور قدیم ہندی۔ اگر فاضل مضمون نگار کا قدیم آریائی زبانوں سے زبان کا یہ اوپر سے نیچے اترتا ہوا سلسلہ مراد تھا تو انھیں صحیح مناسب اور برمحل لفظ استعمال کرنا چاہیے تھا اور "اردو کے شجرے" کی بجائے "سلسلۂ نسب" لکھنا چاہیے تھا۔ اس وقت اگر ان کا مطلب سمجھنے میں غلطی ہوتی تو مخاطب کے قصور فہم پر محمول کیا جاتا۔

خیر اس بحث کو چھوڑیے اور مضمون نگار کے مفہوم و منشار کو فلسفہ لسان کی کسوٹی پر پرکھئے۔ وہ خوب اچھی طرح جانتے ہیں کہ زبان ایک نامی چیز ہے جو گردش روزگار اور اختلاف لیل و نہار کے ساتھ برابر بنتی، بگڑتی اور ڈھلتی ڈھلاتی رہتی ہے جو کل تھی آج نہیں اور جو آج ہے وہ شاید کل نہ ہوگی۔ اس لئے زبان کے سرمایۂ الفاظ میں سے کسی ایک لفظ کو لیکر

یہ کہنا کہ اسے قدیم زبانوں میں دکھایئے بچوں کی سی ضد ہے۔ قدیم زبانوں میں اپنے موجودہ روپ کے ساتھ مشکل ہی سے کوئی لفظ مل سکتا ہے۔ اگر آپ سراغ لگانا چاہیں اور بقول شاعر ؎

بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش   من انداز قدت را می شناسم

لفظ کے "انداز قد" سے آپ کو واقفیت بھی ہو تو آپ اس کو کسی نہ کسی رنگ میں، کسی نہ کسی روپ میں اور کسی نہ کسی آہنگ کے ساتھ شاید پا سکیں گے "نے" کا کھوج بعد میں لگائیں گے۔ لگے ہاتھوں اس سلسلے کے دوسرے بیانات کو بھی پرکھتے چلیں۔ علی گڑھ کے ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں، اور اپنے زعم میں دور کی کوڑی لائے ہیں، کہ "نے" قدیم اردو ادب میں علامت فاعل کے طور پر کہیں استعمال نہیں ہوا۔ قدیم اردو ادب اگر انھوں نے دکھنی اور گجراتی اردو ادب کو کہا ہے تو اس کا کسی قدر تفصیل کے ساتھ ذکر آگے آئے گا۔ فی الحال شمالی ہند کے قدیم اردو ادب کو لیجئے اور دیکھیے کہ اس میں "نے" کا کوئی سراغ ملتا ہے یا نہیں۔ آخر یہ بھی تو اردو زبان کا ادب ہے اور زمانے کے لحاظ سے اس کا کچھ حصّہ تو دکھنی ادب سے بھی زیادہ قدیم ہے۔ ہر چند اس کا ایک حصّہ اس زمانے کا ہے جب دکن میں تصنیف و تالیف کے سلسلہ کا آغاز ہوا۔ امیر خسرو دہلوی اردو (کھڑی بولی) کے اولین شاعر ہیں۔ ان کا زمانہ تیرہویں صدی کا نصف آخر اور چودہویں صدی کا ربع اول ہے۔ امیر کا کلام عام طور سے دستیاب نہیں ہوتا۔ لیکن ان کی چند غزلیں جو ادھر اُدھر سے ملی ہیں، جب تک یہ ثابت نہ ہو جائے کہ وہ ان کی نہیں ہم ان کو ان کی طرف منسوب کر سکتے ہیں اور ان سے لسانی نتیجے بھی نکال سکتے ہیں۔ پروفیسر شیرانی جیسے محقق نے ایک غزل ان کے نام سے اپنی مایۂ ناز تصنیف "پنجاب میں اردو" میں نقل کی ہے

اور اس کی بابت لکھا ہے کہ یہ جس بیاض سے نقل کی گئی ہے وہ تیرہویں صدی ہجری کے ابتدا میں لکھی گئی تھی۔ اس میں یہ شعر بھی ہے ؎

میرا جو من تم نے لیا، تم نے اٹھا غم کوں دیا
غم نے مجھے ایسا کیا جیسا پتنگا آگ پر

اس شعر میں تین جگہ "نے" ہے۔

محمد افضل سولھویں صدی عیسوی کے شاعر ہیں۔ جھنجھانہ ضلع میرٹھ کے رہنے والے تھے۔ ان کا زمانہ اور اردو کے قدیم ترین شاعر دکنی مصنف قطب مشتری کا زمانہ ایک ہے۔ مولانا شیرانی کے بقول انھوں نے ۱۰۳۵ھ میں انتقال کیا۔ بارہ ماسہ یا بکٹ کہانی کے نام سے انھوں نے ایک طویل نظم لکھی تھی۔ مشہور تذکرہ نگار کمال کا کہنا ہے کہ یہ دکنی زبان میں ہے۔ لیکن اس کے باوجود اس میں چھ جگہ "نے" استعمال ہوا ہے۔ میر حسن نے اپنے تذکرے میں اس کے دو شعر بطور مثال لکھے ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے ؎

مسافر سے جنھوں نے دل لگایا   انھوں نے سب جنم روتے گنوایا

اس میں "نے" ہے اور دو جگہ ہے۔

چندر بھان برہمن عہد شاہجہانی کا ایک مشہور فارسی شاعر ہے۔ پنڈت کیفی کا خیال ہے کہ سب سے پہلے اُردو میں غزل اسی نے لکھی (شمالی ہند میں) اس کی غزل کا مطلع ہے۔

خدا نے کس شہر اندر ہمن کو لائے ڈالا ہے
نہ دلبر ہے نہ ساقی ہے۔ نہ شیشہ ہے نہ پیالہ ہے

یہاں بھی "نے" موجود ہے۔

سعدی کاکوروی ایک اور شاعر ہیں۔ تذکرہ نویسوں نے تو انھیں

باشندہ دکن کا تھا ، بتایا تھا ۔ لیکن اصل میں وہ شمالی ہند کے ہیں ۔ زور نے لکھا ہے کہ وہ اکبر اعظم کے زمانے میں تھے ۔ اور محمد قلی قطب شاہ کے معاصر ہیں ۔ ان کا ایک شعر تذکروں میں اس طرح منقول ہے ۔

ہمنا تمہن کوں دل دیا تم دل لیا اور دکھ دیا
ہم یہ کیا تم وہ کیا ایسی بھلی یہ پیت ہے

اس میں " ہمنا " کا " نا " " نے " کے معنی میں ہے ۔ اغلب یہ ہے کہ یہ " ہم نے " تھا اور اگر " ہمنا " ہی ہے ، تو " نا " " نے " کا منہ بولا بھائی ہے لہ

یہ چند مثالیں " نے " کے استعمال کی ہیں ۔ جو متقدمین شعراء کے کلام سے منتخب کی گئی ہیں ۔ کیا ہمارے دوستوں اور بزرگوں کو ان کی قدامت سے انکار ہے اور کیا وہ ان کو قدیم اُردو ادب میں شمار نہیں کرتے ۔

قدیم ہندی بھی کچھ کم مبہم اور شبہ میں ڈالنے والا لفظ نہیں ۔ عام طور سے قدیم ہندی اس زبان کو کہتے ہیں جو اپ بھرنش کے بعد ہے اور مشرقی ہندی و مغربی ہندی کے درمیان کی چیز ہے ۔ یہ دو زبانیں اس کی دو بڑی شاخیں ہیں ۔ مغربی ہندی کی پانچ بولیاں ہیں اور مشرقی ہندی کی تین ۔ مغربی ہندی کی بولیوں میں سے اردو (کھڑی) اور برج بھاشا (پڑی) زیادہ اہم اور بڑے درجے کی ہیں اور مشرقی ہندی کی بولیوں میں سے اودھی کو شہرت اور عزت حاصل ہے ۔ صحیح اور سچی بات یہ ہے کہ قدیم ہندی کوئی زبان نہیں ۔ جس

لہ اصل علامت " ن " ہے ۔ " نا " اور " نے " اس کے دو روپ ہیں ۔ " ہم کیا " اور " تم کیا " میں بھی " نے " ہے لیکن مذکور نہیں ۔ اگر " تم نے " نہ ہوتا تو " ہم کیے " اور " تم کیے " ہونا چاہیے تھا ۔

طرح انسان زید، عمرو، بکر وغیرہ سے الگ کوئی شخص نہیں۔ میکس مولر کے لفظوں میں ایک منطقیوں کی اپج ہے۔ تو دوسری لغویوں کی۔ یہ بال کی کھال نکالنے والوں کا کام ہے۔ ہاں! برج اور اودھی جدا جدا دو بولیاں ہیں جن میں ایک مغربی ہندی کی قائم مقام ہے اور دوسری مشرقی ہندی کی۔ مولانا عبد الحق صاحب کا یہ فرمانا درست ہے کہ ہندی کی پوربی شاخوں میں "نے" کا وجود نہیں۔ تلسی داس کے کلام میں اس کا استعمال نہیں پایا جاتا۔ لیکن ہندی کی پچھمی شاخوں میں اس کا وجود ہے۔ سور داس کے یہاں کثرت کے ساتھ اس کا استعمال ہوا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے۔

ایک پرش نے آجو موہی سپنا دینوں (سور ساگر پد ۲۹ صفحہ ۲۰۰)

ایک شخص نے آج مجھے خواب میں اپنے درشن دئے۔ یہاں "پرش نے" نائب فاعل یا آلی فاعل ہے اور ٹھیک اردو محاورے اور استعمال کے مطابق ہے۔

پرتھی راج راسو کی زبان کو بھی لوگ قدیم ہندی کہتے ہیں۔ مجھے تسلیم ہے کہ راسو میں "نے" اپنے اصلی روپ (نا، نے، نی، نیں وغیرہ) میں استعمال نہیں ہوا۔ لیکن اس سے "نے" کی قدامت پر حرف نہیں آتا۔ ایک تو راسو کی زبان خالص ہندی زبان نہیں۔ اس میں پنجابی کی آمیزش بھی ہے۔ چند اصل میں لاہور کا باشندہ تھا۔ ممکن نہیں کہ دہلی پہنچ کر وہ اپنے وطن کی زبان جو اس نے ماں کی گود میں سیکھی تھی یکسر بھول گیا ہو۔ اس کے یہاں فارسی، عربی الفاظ کی کثرت بھی اسی وجہ سے ہے یہ الفاظ اس نے لاہور میں سیکھے تھے اور وہ اس کی زبان پر اس طرح چڑھ گئے تھے کہ وہ خود بخود زبان پر لڑھکتے چلے آتے تھے اور اسے اس کا احساس تک نہ ہوتا تھا۔ دوسرے وہ برج کے سلسلے کی زبان ہے۔ اس قدیم ہندی سے اس کا کوئی تعلق نہیں جس سے اُردو (کھڑی) نے ارتقا پایا۔

تیسرے" نے" بدلے ہوئے روپ میں چند کے یہاں بھی ہے۔ اسکی تفصیلات میں اس وقت بیان کروں گا جب اس کی اصلیت بتاؤں گا اور اس کے نسب کا سُراغ لگاؤں گا۔

راسو بارہویں صدی کے آخر کی تصنیف ہے۔ اس زمانے کے کچھ پروانے ناگری پرچارنی سبھا نے دریافت کئے ہیں۔ یہ پرتھی راج نے اپنے عہد کے جاگیرداروں ویدوں اور عالموں کو لکھے تھے۔ ان میں ایک فرمان آچاریہ رشی کیش دہن دنتری کے نام کا ہے۔ اس میں یہ الفاظ غور کرنے کے قابل ہیں: "تم نے کاکاجی کم کے دوا کی آرام چنگو" (تم نے کاکاجی کی دوا کی اور ان کو اچھا کیا) اس میں "نے" اردو محاورے کے مطابق ہے۔ یہ فرمان ۱۳۳۵ سمبت بکرمی کا لکھا ہوا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس سے زیادہ پرانی تحریر کا ملنا ممکن نہیں۔ یہ زمانہ جدید آریائی زبانوں کے اُبھرنے اور وجود میں آنے کا ہے۔

"نے" کم سے کم اُردو میں قدیم زمانے سے ہے۔ یہ اس وقت بھی تھا جب بقول مولانا عبدالحق صاحب کے اردو نے اپنا سکہ نہ جمایا تھا۔ اور اس وقت بھی تھا جب اردو کا سکہ جم چکا تھا۔ اور گلی گلی کوچے کوچے چل نکلا تھا۔ اسی سلسلے کی ایک کڑی جس کا تعلق حرف "نے" کی نوخیزی سے ہے۔ ہمارے بزرگوں کا یہ قول ہے کہ "نے" اُردو میں درآمد کئے جانے کے بعد بھی مدتوں زبان میں اچھی طرح رچ بچ نہ سکا۔ اور کچھ بنیا سا رہا۔ چنانچہ مولانا عبدالحق صاحب نے لکھا ہے کہ میر وسودا کے زمانے تک "نے" کے استعمال میں بے قاعدگی پائی جاتی تھی۔ اس کے استعمال کے قواعد حال ہی میں منضبط ہوئے ہیں۔ گریرسن کے خیال میں "نے" کے استعمال کے قواعد سب سے پہلے ۱۷۷۸ء

ہیں مرتب ہوئے۔ یہ بھی "نے" کے ساتھ بڑی ناانصافی ہے۔ "نے" اردو کی اپنی چیز ہے۔ یہ کہیں سے درآمد نہیں ہوا۔ اُردو کے بطن سے پیدا ہوا۔ اس کی چھاتی سے اس نے دودھ پیا۔ اس کی آغوش میں اس نے پرورش پائی۔ اُردو میں اس کا استعمال ہمیشہ قاعدہ کے مطابق ہوا اور کبھی اس کے استعمال میں کسی قسم کی بے قاعدگی نہیں برتی گئی۔ میر وسودا کے زمانے سے پہلے بھی اہل زبان اس کو اچھی طرح جانتے پہچانتے تھے اور ٹھیک قاعدے کے مطابق اس کا استعمال کرتے تھے۔ فعل متعدی کی ماضی اور ان تمام افعال کے ساتھ جو ماضی کی ترکیب سے بنتے ہیں۔ فاعل پر "نے" داخل کیا جاتا تھا۔ اور اس میں کسی قسم کی ناہمواری نہ تھی۔

"نے" کے استعمال میں بے قاعدگی کو عام طور سے لوگ نہیں سمجھتے۔ وہ اس کو بھی بے قاعدگی کہتے ہیں کہ جہاں "نے" آنا چاہیے وہاں نہ آئے اور جہاں اس کا ذکر ضروری ہو وہاں چھوٹ جائے۔ مثلاً حاتم کے اس مصرعے میں "نے" چھوٹ گیا تھا۔

رات ہم خواب میں اس زلف کو پیچاں دیکھا

وہ اسے بے قاعدگی کہتے ہیں۔ یہ بے قاعدگی نہیں ناہمواری ہے۔ "نے" اس مصرعے میں "مقدر ہے کہ مذکور نہیں۔"

یعنی لفظوں میں "نے" نہیں لیکن وہ اپنا کام کر رہا ہے۔ اس کا اثر موجود ہے۔ "نے" کا اثر یہ ہے کہ فعل کا تعلق اس اسم سے نہ رہے جس پر "نے" آئے جیسے "میں بولا" اور "ہم بولے" ان جملوں میں فعل "میں" اور "ہم" کے مطابق ہے۔ اس لئے کہ اس میں "نے" نہیں۔ "میں نے جھوٹ بولا" اور "ہم نے جھوٹ بولا" ان میں "نے" کی وجہ سے "بولا" کا تعلق "میں" اور "ہم" سے

منقطع ہو گیا اور وہ دونوں صورتوں میں "بولا" رہا۔ حاتم کے مصرعے میں "نے" مذکور نہیں لیکن اس پر بھی "ہم" کے ساتھ فعل "دیکھا" ہے۔ دیکھتے نہیں۔ اس لئے اس میں بے قاعدگی کہاں؟ بے قاعدگی اس جملے میں ہے۔ "اس خاطر زلیخا نے کیا کری" (سب رس) اس میں نے کے ہوتے بھی "کری" فاعل کے مطابق مؤنث ہے۔ قاعدے کے مطابق یہ جملہ یوں ہونا چاہیے تھا: "زلیخا نے کیا کرا" (کیا) یا اس جملے میں ہے "میں کتاب میز پر رکھ دیا ہوں" اس میں "نے" صرف ترک ہی نہیں کیا گیا بلکہ فعل کو فاعل کے مطابق بنا کر اس کا راستہ بند کر دیا گیا ہے۔ یہ جملہ اس طرح صحیح ہے: "میں نے کتاب میز پر رکھ دی ہے"

حاتم کے زمانے میں ترک "نے" معیوب سمجھا جاتا تھا۔ اس کا بڑا ثبوت یہ ہے کہ ایک موقع پر حاتم نے شعر کہا۔

سر کو پیٹا ہے کبھو سینہ کبھو کوٹا ہے
رات ہم ہجر کی دولت کا مزا لوٹا ہے

یہاں "نے" آنا چاہیے تھا۔ جو حاتم سے چھوٹ گیا تھا۔ سعادت یار خاں رنگین حاتم کے ایک منہ چڑھے شاگرد ہیں۔ انھوں نے استاد کا شعر سنا تو فرمایا۔ حضرت! اس کے دوسرے مصرعے میں یہ ترمیم فرمائیں تو بہتر ہے:۔

ہم نے شب ہجر کی دولت کا مزا لوٹا ہے

رنگین کا بیان ہے کہ حاتم نے ان کی اس اصلاح کو قبول فرمایا اور ان کو شاباش دی۔ اس واقعہ کو رنگین نے خود "مجالس" میں بیان کیا ہے اور بظاہر اس کی صحت میں شبہ کرنے کی گنجائش نہیں۔ اگر میر و مرزا کے زمانے تک "نے" کے استعمال میں بے قاعدگی پائی جاتی تھی اور اس کا کوئی معیار یا ضابطہ نہیں تھا۔ تو رنگین نے کس لئے اپنے استاد کے شعر میں اصلاح کی جرأت کی۔ حاتم نے اس کی اصلاح کو کیوں قبول فرمایا

اور کس واسطے رنگین کی اس جرأت و بے باکی پر حاتم نے اس کی پیٹھ ٹھونکی۔

دراصل یہ ساری غلط فہمی اس لئے ہے کہ میر و مرزا کے زمانے تک ہماری شاعری کا کوئی اچھا اور صحیح معیار قائم نہیں ہوا تھا۔ اردو شاعری میں فن کی پختگی اور استواری نہیں آئی تھی۔ اردو کے متقدمین شعرا، وزن اور قافیہ کی کڑی پابندیوں سے مجبور ہو کر زبان کے اصول کا پورا پورا لحاظ نہیں رکھتے تھے۔ محاورے غلط نظم کر جاتے تھے۔ الفاظ ان سے چھوٹ جاتے تھے۔ کوئی لفظ دب جاتا تھا۔ کسی لفظ میں بے جا تصرف کر لیتے تھے۔ یہ سب کچھ اس لئے تھا کہ ابتدائی دور کے شعرا نظم پر اچھی قدرت نہیں رکھتے تھے۔ یہ صحیح نہیں کہ زبان اور محاورے سے متعلق جو فروگذاشتیں ان کے کلام میں ہیں وہ اس عہد کی زبان میں صحیح اور جائز تھیں۔

اس بدعنوانی اور ناہمواری کو اس سے بڑی مدد ملی کہ اردو شاعری کا باقاعدہ آغاز اردو کے مرکز یعنی دلی سے دور دکن میں ہوا۔ اردو محمد تغلق کے عہد میں مسلمانوں کے ساتھ دکن پہنچی۔ ایک تو دکن جانے والے مسلمان اچھی طرح اردو نہیں جانتے تھے۔ ان کی زبان فارسی تھی۔ دلی پہنچ کر انھوں نے اردو سیکھ لی تھی۔ دوسرے مولانا شیرانی کی تحقیق کے مطابق یہ لوگ پنجاب سے گئے تھے۔ اور پنجابی بولتے ہوئے گئے تھے۔ محمد تغلق غیاث الدین کا بیٹا تھا۔ جس کی زندگی کا بڑا حصہ پنجاب میں گذرا۔ اس نے ۷۲۰ھ میں ایک بڑی دل کے ساتھ دہلی کا رخ کیا اور اپنے پنجابی لشکر کے ساتھ وہیں ٹھہر گیا۔ محمد تغلق نے ۷۲۷ھ میں اپنے لاؤ لشکر کے ساتھ دکن کی طرف ہجرت کی۔ ہجرت کرنے والوں میں بڑی تعداد ان لوگوں کی تھی جو ۷۲۰ھ میں محمد تغلق کے باپ کے ساتھ دلی آئے تھے۔ یہ لوگ آٹھ سال کے عرصہ میں دلی کی زبان کیا سیکھ سکتے تھے۔ بری بھلی پنجابی آمیز زبان بولتے

ہوئے یہ دکن پہنچے۔ مشہور فرانسیسی ماہر لسانیات ڈاکٹر جولس بلاک کی رائے بھی یہی ہے۔ وہ فرماتے ہیں[1]۔

"میرے خیال میں مشرقی پنجاب کے اضلاع کی زبان لشکریوں کے ساتھ دکن پہنچی جس نے زمانے کے الٹ پھیر کے بعد شائستہ ادبی معیاری زبان کی حیثیت اختیار کی۔"

کچھ عرصے بعد جب اُردو کے مرکز سے ان کا سیاسی تعلق منقطع ہو گیا تو ان کی زبان اُدھوری اور ناقص رہ گئی۔ ساتھ ہی پڑوس کی زبانوں میں سے گجراتی اور مرہٹی نے بھی اس کو متاثر کیا اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ دلی کی اُردو سے مختلف ہو گئی اور بہت سے صرفی و نحوی اصول میں اس سے بچھڑ گئی۔ دکنی اُردو میں جو بے قاعدگیاں ہیں خصوصیت کے ساتھ "نے" کے استعمال میں ان کا بڑا سبب یہی ہے۔

فاضل مضمون نگار کا یہ کہنا غلط ہے کہ دکن کے شعراء اور نثر نگاروں کے یہاں "نے" نہیں ملتا۔ ان کے یہاں "نے" ہے لیکن اس کا استعمال ہموار اور باقاعدہ نہیں۔ اس کا اعتراف مولانا عبدالحق صاحب کو بھی ہے۔ انھوں نے مقدمہ "سب رس" میں دکنی اُردو کی خصوصیات بتاتے ہوئے لکھا ہے[2]۔

"نے" کا استعمال بہت بے قاعدہ ہے۔ اس حرف کے استعمال کے قواعد حال میں منضبط ہوئے ہیں" سب رس اردو نثر کی قدیم کتاب ہے جو خالص دکنی زبان میں ہے مولانا عبدالحق صاحب نے اس کا سال تصنیف ۱۰۴۵ھ بتایا ہے۔ یہ کتاب مولانا باقر آگاہ کے دیباچہ مجموعۂ نظم سے زیادہ قدیم ہے۔ خود مضمون نگار کا بیان ہے کہ باقر آگاہ رحمۃ اللہ علیہ نے یہ دیباچہ ۱۲۰۶ھ میں تصنیف فرمایا۔ سب رس

---

[1] بلیٹن آف اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز۔ بابت سنہ ۳۰-۱۹۳۸ صفحہ ۷۳۰۔
[2] مقدمہ سب رس صفحہ ۴۹۔

کی زبان دکن کی قدیم زبان ہے ۔ اگر دکن کی اردو قدیم اُردو ہے تو اس کا قدیم روپ سب رس کے آئینہ میں دیکھئے ۔ سب رس کے چند جملے جن میں ' نے ' استعمال ہوا ہے (گو بے قاعدہ اور بے محل سہی) ہیں ذیل میں دے رہا ہوں ۔ اگر آپ ' نے ' کے اعداد و شمار جمع کرنا چاہیں تو سب رس کی سیر فرمائیں ۔

(۱) غمزے نے نظروں کو اپنے گھر لے کر گیا (صفحہ ۹۰)

(۲) رقیب نے رو سیاہ نے بے نصیب نے بولیا (صفحہ ۷۱)

(۳) سبے نمک کھائے تے آدمی نے کیا سواد پانا (صفحہ ۶۸)

اس سلسلے میں ایک لطیفہ بھی ہوا ہے ۔ فرماتے ہیں ۔ دکن کی اردو قدیم اردو ہے وہ آج تک تقریباً ویسی ہی سیکڑوں سال پرانی چلی آتی ہے ۔ دہلی کی اردو میں ارتقا برابر جاری رہا ، لیکن دکن والوں کو اس ارتقا کا علم نہ ہو سکا ۔ اس لئے دلی کی اردو میں تو نیا پن آگیا ، لیکن دکنی اُردو بدستور پرانی رہی ۔ وہاں کے عوام کی بول چال پر اس کا کوئی اثر نہ پڑا (اُردو صفحہ ۹۳) اب ان سے کون پوچھے کہ دلّی کی اردو میں ارتقا کیوں برابر جاری رہا ۔ دکن کی اردو اس سے کیوں محروم رہی ۔ اس کو ممی بنا کر کس نے رکھا ۔ وہ زمانے کے بہاؤ کے ساتھ کیوں نہ بہی ۔ بہاریں بھی آئیں اور خزاں بھی ۔ لیکن اس کا گلشن صدا بہار رہا ۔ کیوں ؟ اس کے درختوں کے پتے پیلے کیوں نہ پڑے ؟ اور پت جھڑ میں کیوں نہ جھڑے ،

یہاں تھوڑی دیر ٹھہر کر اس کا فیصلہ کرلیں کہ " نے " اُردو میں کہاں سے آیا ۔ یہ خود اُردو کی چیز ہے یا کسی دوسری پاس پڑوس کی زبان سے اُردو میں لیا گیا ہے ۔ " نے " ہندوستان و پاکستان کی جدید آریائی زبانوں میں سے مرہٹی ، گجراتی ، پنجابی ، ہریانی اور برج بھاشا میں بھی ہے ۔ ان میں ہریانی اور برج اُردو سے زیادہ قریب ہیں اور ماہرین لسانیات کے خیال

میں وہ اردو کی سگی بہنیں ہیں۔ باقی زبانیں اردو کی خالائیں ہیں۔ ان زبانوں میں "نے" کے روپ اور اس کے مختلف استعمالات اس طور پر ہیں۔

زبان	روپ	محل استعمال	ترجمہ
۱۔ اردو	نے	آلی فاعل (نائب فاعل)	ذریعہ۔ واسطے سے
۲۔ مرہٹی	نیں (بیائے مجہول) مفرد	آلی	"
	نیں (بیائے معروف) جمع		
۳۔ گجراتی	ے	آلی	
	نے	مفعولی	کو
	نوں۔ نی۔ نو	اضافی	کا
۴۔ پنجابی	نے	آلی	ذریعہ۔ واسطے
	نوں	مفعولی	کو
۵۔ ہریانی	نے	فاعلی آلی	ذریعہ۔ واسطے سے
	نے	مفعولی	کو
۶۔ برج	نیں (بے مجہول)	فاعلی (آلی)	ذریعہ۔ واسطے سے

چتپاونی مرہٹی کی ایک شاخ ہے۔ اس میں "نا" (کو، کے معنی میں ہے اور غالباً دکنی اردو کے "ہمنا" (ہم کو) کا "نا" مرہٹی زبان کی اسی شاخ سے لیا گیا ہے

"نے" کے بارے میں گریرسن کا خیال ہے اور اس کا ذکر میں اوپر کر آیا ہوں کہ یہ بھاشا (برج) کا نہیں۔ اس معنی میں کبھی یہ بھاشا میں استعمال نہیں ہوا۔ اس کی اصلیت میں اختلاف ہے۔ کچھ علماء کا خیال ہے کہ یہ مرہٹی سے لیا گیا ہے اور کچھ کی رائے ہے کہ مضافات دہلی کی زبان سے[1]۔ شیام سندر

---

[1] کلکتہ ریویو جلد ۱۵ صفحہ ۱۵۴

داس اسے مغربی ہندی کی پیداوار بتاتے ہیں۔ مضافات دہلی کی تین زبانیں ہیں جن میں "نے" ہے۔ ایک میرٹھ اور اس کے نواح کی کھڑی (یہی زبان ہے جس پر اُردو کی بنیاد کھڑی ہے) دوسری ہریانی۔ تیسری متھرا کی برج۔ یہ زبانیں مغربی ہندی کی شاخیں ہیں۔ دکنی اُردو کے آغاز اور اشاعت سے متعلق جو تفصیلات اوپر دی گئیں ان سے ثابت ہوتا ہے کہ اُردو "نے" پنجابی "نے" یا "نوں" سے ماخوذ نہیں۔ دکن جانے والے مسلمان پنجابی تھے جو مدتوں پنجاب میں رہے تھے۔ مولانا شیرانی کا کہنا ہے کہ انھوں نے پنجاب میں پنجابی سیکھی اس کے بعد دلی پہنچ کر انھوں نے۔ دہلوی زبان" سیکھی ہو یا نہ سیکھی ہو۔ دکنی زبان پر جو پنجابی کا اثر ہے اور اس کا ڈول جو پنجابی سے ملتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ دکن کی طرف ہجرت کرنے والے پنجابی بولتے تھے یا کم سے کم یہ زبان جانتے تھے۔ اس مسئلے کی تفصیل کا موقع نہیں۔ مولانا شیرانی کے نتائج سے اختلاف کیا جاسکتا ہے۔ تاریخی طور پر شاید اس کو جھٹلایا بھی جاسکتا ہے کہ دکن جانے والے پنجابی تھے۔ لیکن دکنی اور پنجابی میں جو لسانی مشابہتیں ہیں۔ صرف و نحو کے اصول میں جو ان کا اتحاد ہے اسے جھٹلانا ممکن نہیں۔ اتنی بات تو ماننی ہی پڑے گی کہ دکن کی اردو پنجابی سے بہت قریب ہے بلکہ قدیم دکنی اُردو تو ہر لحاظ سے پنجابی کا ایک چربہ ہے اور پھر اس کی توجیہہ یہ کرنی ہوگی کہ دکن جانے والے مسلمان پنجابی تھے۔ ان کی زبان کا پرچھانوا اس زبان پر بھی پڑا جو دلی آکر انھوں نے سیکھی تھی۔ اگر یہ زیادہ عرصہ تک دلی میں رہتے۔ اہل زبان سے انکا اختلاط و ارتباط بڑھتا تو شاید یہ اس زبان کو اتنا نہ بگاڑ سکتے۔ لیکن زبان کے اصل مرکز سے دور ہو جانے کے بعد انھیں اپنی منشا کے مطابق اس زبان کو ڈھالنے کی آسانیاں حاصل ہو گئیں۔

"نے" اگر پنجابی سے اُردو میں آیا ہوتا تو دکن کی قدیم زبان میں پایا جاتا۔ اور دکنی ادبیات میں اس کا استعمال نہایت باقاعدہ اور ہموار ہوتا۔ بلکہ "نے" کے ساتھ ساتھ "نوں" بھی دکن میں ہونا چاہیے تھا اس لیئے کہ "نے" کی بابت تو یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ پنجابی میں بعد کی پیداوار ہے اور شاید اس کی شکل وصورت بھی پاس پڑوس کی زبانوں کی شرمندۂ احسان ہے۔ لیکن "نوں" پنجاب کی اپنی چیز ہے۔ یہ اس معنی میں اور اس صورت کے ساتھ کسی اور زبان میں نہیں۔ لیکن معاملہ اس کے برعکس ہے۔ شمالی ہند کی قدیم وجدید شعراء کے یہاں تو "نے" ہے اور بہت باقاعدہ تاریخی تسلسل کے ساتھ استعمال ہوا ہے، لیکن دکن میں بقول مضمون نگار یہ قدیم زمانے میں تھا اور نہ آج ہے۔ وہاں کے لوگ اسے نہیں جانتے اور گو نادانستہ ہی اکثر اس طرح لکھ جاتے ہیں "میں کتابیں میز پر رکھ دیا ہوں" رہا "نوں" تو اس کا تو دکنی اُردو میں نام ونشاں تک نہیں۔

"نے" مغربی ہندی کی پیداوار بھی نہیں۔ اس کا بڑا ثبوت یہ ہے کہ پرتھی راج راسو میں۔ جسے مغربی ہندی کا قدیم ترین نمونہ بتایا جاتا ہے۔ یہ نہیں ملا۔ وہاں اس کا مفہوم "نے" کی جگہ قدیم اپ بھرنش "ہیں" سے ادا کیا گیا ہے یہاں سے ایک بات اور بھی معلوم ہوئی وہ یہ کہ "نے" برج کی بھی نہیں۔ راسو کی زبان برج بھاشا سے بہت ملتی ہے بلکہ وہ برج بھاشا ہی کا ایک قدیم روپ ہے۔ شیام سندر داس کا بیان ہے کہ "پرتھی راج راسو میں برج کے ڈھانچ کا بہت کچھ آبھاس ہے۔"[۱] اگر "نے" برج میں قدیم زمانے سے ہوتا تو اس کے قدیم روپ یعنی راسو کی زبان میں اس کا استعمال ہونا چاہیے تھا۔ اس کے علاوہ برج نے اودھی کو بھی متاثر کیا ہے اور اس پر برج کی چھاپ بہت گہری

---

[۱] ہندی بھاشا کا ساہتیہ صفحہ ۷۲۔

ہے۔ "نے" برج میں ہوتا تو اس کے چوکنّا پن کا تقاضا تھا کہ وہ اردھی سے بھی رسم و راہ پیدا کرے۔ اردھی کا اس سے ناآشنا ہونا اس امر کا ثبوت ہے کہ کم سے کم اس زمانے میں برج کی گود اس سے خالی تھی جب اس نے اردھی کو دودھ پلایا ان تمام قرائن کو سامنے رکھ کر ہی شاید گریرسن نے اس کے ہندی الاصل ہونے سے انکار کیا تھا۔

پنجابی، مغربی ہندی اور برج بھاشا کو چھانٹ دینے کے بعد مرہٹی، گجراتی اور ہریانی صرف تین زبانیں رہ جاتی ہیں جن میں "نے" استعمال ہوا ہے ہارنلے کے اس خیال کو بھی اگر سامنے رکھ لیا جائے کہ "نے" راجستھانی بولیوں میں سے مارواڑی میں بھی ہے۔ وہاں سے بھی اردو میں آسکتا ہے تو اس فہرست میں ایک زبان کا اور اضافہ ہو جاتا ہے۔ اس کا آخری فیصلہ کرنے سے پہلے کہ اردو، ہریانی، گجراتی، مارواڑی اور مرہٹی ان پانچ زبانوں میں سے "نے" کس زبان کا ہے اور کہاں اس نے جنم لیا۔ اس کی زندگی کے مختلف دوروں پر ایک نظر ڈال لیں تو بہتر ہے۔ اگر ہم اس کی زندگی کے مختلف دوروں کو روشنی میں لا سکے اور اس بہروپیے کو اصلی روپ میں دیکھ سکے تو اس کی اصلیت حقیقت اور نسب کا کھوج لگانے میں بھی شاید ہم کامیاب ہو جائیں۔

آئیے دیکھیں ماہرین لسانیات نے "نے" کے بارے میں کیا کیا قیاس آرائیاں کی ہیں۔

(۱) ہارنلے کہتے ہیں کہ "نے" اصل میں "لبدھے" تھا جو لبھ (حاصل کرنا) سے اسم مفعول ہے اور مفعول ثانی یعنی (DATIVE) حالت میں ہے "لبدھے" کے لفظی معنی ہیں حاصل کردہ کے لئے اور اس کے مختلف مدارج ارتقا اس طور پر ہیں:- لبدھے۔ لبھے۔ لہے۔ لیے۔ لے۔ نے۔

(۲) جان بیمز اس کی اصل سنسکرت "لگنے" بتاتے ہیں۔ یہ بھی اسم مفعول ہے اور مفعول ثانوی حالت میں ہے۔ لیکن اس کا مادہ "لگ" بمعنی چمٹنا اور چپکنا ہے۔ "لگنے" کے معنی ہیں لگے ہوئے اور چپکے ہوئے کے لئے"۔ اس کے ارتقائی درجے یعنی منازل حیات یہ ہیں۔ لگنے۔ لگے۔ لگّے۔ لیئے۔ لے۔ نے ۱؎

(۳) ڈاکٹر بھنڈارکر اسے سنسکرت علامت آلہ (کرن) "ـ ریں" (بیائے مجہول) سے ماخوذ بتاتے ہیں جس کا استعمال پراکرت کے آخری عہد تک ہوا ہے۔ پالی اور پراکرت میں مفتوح الاواخر اسماء کے آخر میں آلی حالت Instrumental کے اظہار کے لئے یہی علامت استعمال ہوتی تھی۔ اپ بھرنش عہد تک پہنچتے پہنچتے "ـ رین" کا "ن" غنہ ہو کر "ـ ریں" رہ گیا۔ لیکن اس کے ساتھ "ـ ریں" باظہار "ن" بھی رائج تھا۔ آلے کے لئے بھی اور فعل مجہول کے فاعل یعنی Agent کے لئے بھی۔

اب سوال یہ ہے کہ "ـ رین" سے "نے" کیسے بنا؟ اسکی دو توجیہیں کی گئی ہیں۔

الف۔ بھنڈارکر کہتے ہیں کہ "نے" دوہری علامت ہے۔ اوّل "ریں" سے "ن" تراش لیا گیا۔ بعد میں اپ بھرنش "ـ ریں" ("ن" غنہ کے ساتھ) اس پر اضافہ کر دیا گیا۔ اس طرح "ن ـ ریں" (ن یں = نیں) اور پھر "نے" بنا۔

۱؎ مولانا عبدالحق صاحب نے بیمز کے اس قول پر اعتماد کیا ہے۔ لیکن انھوں نے "لگنے" کی جگہ غلطی سے "لگیا" لکھا ہے اور اس کو مفعول (اسم مفعول؟) بتایا ہے۔ سنسکرت میں "لگیا" کوئی لفظ نہیں۔ اسم مفعول "لگن" یا "لگنت" ہے۔

(ب) شیام سندر، ہری اودھ دھیریندر نے "نے" کو "ریں" کا مقلوب (اُلٹا) مانا ہے۔ قلب ارتقائے زبان کا ایک محرک ہے جس نے جدید آریائی زبانوں کی تعمیر میں بڑا حصہ لیا ہے۔

ایک تیسری توجیہہ یہ بھی ہے کہ اصل علامت آلہ سنسکرت میں 'ن' ہے۔ مفتوح الآخر اسمار میں یہ 'ن' 'ریں' کی شکل میں تھا اور مکسور یا مضموم الآخر (مذکر و مونث) اسمار میں 'نا' کی شکل میں۔ جیسے مُنِ (عابد) سے 'منِنا' اور بھان (سورج) سے 'بھاننا'۔ 'نے' 'ن' کی مفعول ثانی حالت ہے۔

'نے' کو "لگنے" یا لبدھے، سے نکالنا کئی وجہ سے غلط ہے۔ 'نے' مذکورہ بالا زبانوں میں، 'واسطے' اور 'ذریعے' کے معنی میں ہے یا 'کو' کے معنی میں یعنی 'نے' آلے یا نائب فاعل کی علامت ہے یا مفعول کی۔ 'لگنے' اور لبدھے، جنھیں ان علمار نے 'نے' کا ماخذ بتایا ہے۔ ان دو معنوں میں سے کسی ایک سے بھی تعلق نہیں رکھتے۔ نہ قریب کا اور نہ بعید کا، نہ لفظی اور نہ معنوی۔ اس لیے قدرتی طور پر یہاں یہ سوال ہو سکتا ہے کہ یہ خالص سنسکرت کلمے اولاً کب اور کس لیے نائب فاعل یا مفعول کا مفہوم ادا کرنے کے لیے منتخب کیے گئے۔ علی گڑھ کے ڈاکٹر لسانیات کا یہ فرمانا[1] بڑا ہی مضحکہ خیز ہے کہ "چونکہ سنسکرت کے مفعول (اسم مفعول) "لگیا" سے نکلا ہے۔ اس لیے (نے) بیشتر زبانوں میں علامت مفعول ٹھہرایا گیا ہے۔" آخر کیوں نہیں۔ مفعول اور اسم مفعول بھائی بھائی جو ہوئے۔ لیکن جن زبانوں میں علامت فاعل ٹھہرایا گیا ہے، انھوں نے فاعل کا مفعول سے کیا رشتہ بتایا ہے؟ قدیم زمانے سے لے کر آج تک سنسکرت پراکرت اور اپ بھرنش میں یہ کلمے یا ان کے درمیانی حلقے کبھی 'نے' کی جگہ اور

---

[1] اردو زبان کی تاریخ صفحہ ۲۴۳

اس کے مفہوم میں استعمال نہیں ہوئے۔ صرف ہیمز نے اتنا لکھا ہے کہ نیپالی میں ’لاؤ‘ مفعول کے لئے ہے اور ’ے‘ آلے کے لئے۔ لیکن نیپالی جدید آریائی زبانوں میں سے ہے اور اس کے ابھرنے کا زمانہ قریب قریب وہی ہے جو دوسری جدید زبانوں کا ہے۔ اس لئے اس میں کسی لفظ کا کسی معنی میں استعمال اور اس کا رنگ روپ اس لفظ کی حقیقت کا پتا لگانے میں ہماری کوئی مدد نہیں کرتا۔ نیپالی ’لے‘ ہو سکتا ہے کہ ’نے‘ ہو اور اس کا ’ن‘، ’ل‘ سے بدل گیا ہو۔ جدید آریائی زبانوں میں اس کی بے شمار مثالیں ہیں۔ مثلاً لوٹنا۔ پراکرت نُوٹ۔ سنسکرت نُورت۔ صوتی اعتبار سے بھی یہ اشتقاق صحیح نہیں: ’نے‘ کے متعدد روپوں میں سے ایک روپ ”نیں“ ہے جو مرہٹی اور مارواڑی کے علاوہ برج میں بھی ہے اگر ”نیں“ ’لیے‘ یا ’نے‘ سے بنا ہے تو اس میں نون، کہاں سے آیا۔ اس کے علاوہ لگے۔ لئے سے نے (بفتح ’ن‘) تو ہو سکتا ہے۔ نے (بکسر ’ن‘) نہیں ہو سکتا۔

ان وجوہ میں سب سے اہم وجہ یہ ہے کہ ’نے‘ کی زندگی اور اس کے ارتقا کے جتنے منازل ہارنیلے یا ہیمز نے بیان کئے ہیں وہ جدید آریائی زبانوں کے اصلی ماخذوں میں نہیں ملتے۔ سنسکرت (قدیم ہند آریائی) پالی، پراکرت اور اپ بھرنش یہ چار بڑے ارتقائی زینے ہیں جن سے اتر کر ہماری موجودہ زبانوں نے اپنا موجودہ روپ اختیار کیا اور ان کے خط و خال اتنے ابھرے اور نمایاں ہوئے کہ وہ اپنے ماخذوں سے الگ مستقل اور آزاد زبانیں بنیں، ’نے‘ کا اس سے پہلے کیا روپ تھا یہ بتایا جائے اور صرف بتایا ہی نہ جائے بلکہ اپ بھرنش ادب میں اس کا یہ روپ دکھایا بھی جائے۔ اسی طرح اس سے پہلے کا روپ پراکرت میں دکھایا جائے اور اوپر تک اس کے تمام ارتقائی درمیانی منزلوں

کی نشان دہی کی جائے۔

یہ بات صرف اس قیاس کو حاصل ہے جو بھنڈارکر اور اس کے دوسرے ہندی ساتھیوں نے پیش کیا ہے۔ اس میں "نے" کی صرف دو منزلیں ہیں۔ ایک قدیم جو سنسکرت میں ہے یعنی "ین" اور "نا"۔ دوسری جدید جو ہماری زبان میں ہے یعنی "نے" اور "نا"۔ نیں کی تین منزلیں ہیں۔ ایک سادہی جو سنسکرت میں ہے دوسری "تنیں"۔ یہ اپ بھرنش میں ہے اور تیسری "نیں"۔ اس حساب سے "نے" سب سے زیادہ قدیم ہے۔ یہ سنسکرت کے قدیم روپ "ین" سے لیا گیا ہے اس میں نہ پراکرت کا واسطہ ہے نہ اپ بھرنش کا اور نہ قدیم مغربی ہندی کا اس لئے کہ پراکرت اور قدیم ہندی میں اس لاحقے کا روپ "ریں" نون غنہ کے ساتھ تھا اپ بھرنش میں ہر چند نون کا اظہار بھی ہے لیکن زیادہ تر اس میں نون کا اخفا دیکھا گیا ہے۔ "نے" میں "ن" کا اظہار ہے۔ ہماری زبانوں کا عام رجحان ہے کہ ان میں سنسکرت اور پراکرت "انوناسک" (م۔ن وغیرہ) غنہ ہو جاتے ہیں۔ یہ ممکن نہیں کہ جدید زبانوں کے عام میلان اور مزاج کے خلاف جب "ریں" سے "نے" ڈھالا گیا ہو تو غنہ کو ظاہر کر دیا گیا ہو۔ یہ اُلٹی گنگا بہانا ہے۔ جس کا زبان کی شریعت میں ذرا سا بھی امکان نہیں۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ "نے" اصل میں حالت آلی کی علامت ہے۔ سنسکرت میں بھی۔ پراکرت میں بھی اور اپ بھرنش میں بھی۔ بلکہ اپ بھرنش میں جو قدیم آریائی زبان کے تنزل کا آخری درجہ اور جدید آریائی زبانوں کے ارتقا کا اولین درجہ ہے "ریں" نائب فاعل Agent کی حالت بتانے کے لئے استعمال ہوا ہے اور یہ استعمال ٹھیک اُردو میں "نے" کے استعمال کے مطابق ہے۔ "نے" کے نسب اور اس کے نشو و نما کے متعلق جو کچھ عرض کیا گیا

اگر وہ صحیح ہے تو ماننا پڑے گا کہ 'نے'، قدیم ہی نہیں بلکہ قدیم ہند آریائی عہد سے لے کر جدید زبانوں کی تعمیر کے زمانے تک یہ صرف ایک معنی میں استعمال ہوتا رہا ہے اور اس سے صرف ایک کام لیا گیا ہے یعنی آلی حالت کا اظہار۔ اسم مفعول (یعنی ماضی متعدی) کی فاعلی حالت بھی اسی میں آجاتی ہے۔ سنسکرت میں ان دونوں حالتوں کے لئے ایک خاص اصطلاح "کرن" تھی۔ اردو میں آلہ کے لئے میں نے آلی حالت کی اصطلاح وضع کر لی ہے۔ اور ماضی متعدی کے فاعل کے لئے نائب فاعل یا آلی فاعل کی۔ سنسکرت پراکرت اور اپ بھرنش میں 'ہ' ریں، آلے اور آلی فاعل دونوں کے لئے مستعمل تھا۔ اردو میں آلے کے لئے 'سے' ہے اور آلی فاعل کے لئے 'نے'۔ جیسے زید نے عمر کو لاٹھی سے مارا۔ اس میں لاٹھی آلہ ضرب ہے اور اسے 'نے' سے ظاہر کیا گیا ہے۔ بس اتنا سا فرق ہے ویسے 'نے'، آلی حالت کے لئے سنسکرت اور پراکرت استعمال کے مطابق ہے۔

'نے' کے ماخذ 'ریں' کا اپ بھرنش عہد تک صرف ایک مفہوم رہا۔ اسلئے قرین قیاس یہ ہے کہ 'نے'، جو اس کی فرع ہے اول اول اپنے اسی اصلی مفہوم میں استعمال ہوا۔ بعد میں جب اس کا یہ مفہوم حافظہ سے اُتر گیا، یا عام اعرابی حالتوں میں فرق نہ رہا۔ تو یہ مفعول کے لئے استعمال ہونے لگا۔ ایک مفہوم سے دوسرے مفہوم تک منتقل ہونے میں ضرور کچھ وقت لگا ہوگا۔ لیکن آج اس وقت اس کی حد بندی اور تعین ذرا مشکل ہے۔ اس اصول کی صحت میں شبہ نہیں۔ میں اس اصول کو 'نے'، اور اس کے استعمال کی قدامت کا معیار سمجھتا ہوں۔ 'نے' کا پہلا استعمال دوسرے استعمال سے قدیم ہے۔ جن زبانوں میں صرف پہلا استعمال ہے ان میں 'نے'، زیادہ قدیم زمانے سے ہے اور جن میں دوسرا استعمال ہے یا پہلا

اور دوسرا دونوں استعمالات ہیں ان میں کسی قدر متاخر زمانے سے ہے۔ یہ اتنی صاف اور واضح بات ہے کہ اس کے ماننے میں کسی کو تامل نہ ہونا چاہیے۔ اس کے دو قرینے ہیں ایک تو "نے" کا دوسرا استعمال بعد کے زمانے کا ہے۔ اس لیے جس زبان میں یہ استعمال ہے وہ اگر بعد کی نہیں تو کم سے کم "نے" کا اس زبان میں وجود ضرور متاخر ہے۔ دوسرے یہ استعمال اس زبان میں یقیناً قدیم زبانوں سے نہیں آیا۔ یہ قدیم زبانوں میں تھا ہی نہیں۔ ان سے کوئی زبان اس استعمال کو کیسے حاصل کر سکتی تھی۔ اس لئے یوں کہئے کہ ان زبانوں نے "نے" کو اس کے پہلے استعمال کے ساتھ قدیم زبانوں سے لیا۔ دوسرا استعمال کچھ زمانہ گذرنے کے بعد خود ان زبانوں میں ابھر آیا۔

ممکن ہے کوئی صاحب یہ فرمائیں کہ ایسا کیوں نہیں ہو سکتا کہ "نے" کا پہلا استعمال جسے آپ قدیم بتاتے ہیں ان زبانوں سے آیا ہو جن میں "نے" کے دونوں استعمال پہلے سے تھے۔ آخر اس میں کیا دقت ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ ممکن نہیں۔ اگر "نے" کسی ایسی زبان سے لیا جاتا تو اپنے دونوں مفہوموں کے ساتھ لیا جاتا۔ یہ قطعاً خلاف قیاس ہے کہ "نے" کسی زبان میں فاعل و مفعول دونوں کے لئے استعمال ہو اور ہم اسے اپنی زبان میں لیں تو اس کا ایک مفہوم گم کر دیں دوسری زبانوں میں تو "نے" کو ایک نئے معنی پہنا دئے جائیں اور ہم جب اس لفظ کو اختیار کریں تو کاٹ چھانٹ دیں۔ آخر یہ فرق کیوں؟ اہل علم اس کے کیا اسباب بتائیں گے[1] سیدھی سادی بات تو یہ ہے کہ ہم "نے" کو اس زبان کی چیز

---

[1] یہ کوئی وجہ نہیں کہ اردو میں مفعول کی علامت "کو" موجود تھی۔ لہٰذا "نے" فاعل کے ساتھ مخصوص ہو گیا۔ اس کا کیا ثبوت ہے کہ "کو" "نے" سے پہلے ہے۔

بتائیں جس میں سنسکرت سے ے کہ اپ بھرنش عہد تک کی قدیم زبانوں کی طرح 'نے' کا ایک صاف اور واضح مفہوم تھا اور اس کے نئے مفہوم کو دوسری زبانوں کی پیداوار بتائیں۔ یہ صاف بھی ہے، صحیح بھی ہے اور قیاس کے مطابق بھی۔ ہم اس سیدھی اور سچی راہ کو چھوڑ کر ٹیڑھی اور غلط راہ کس لئے اختیار کریں۔

اس اصول کے مطابق ہریانی گجراتی اور مارواڑی زبانیں نکل جاتی ہیں۔ ان میں سے پہلی دو زبانوں میں 'نے'، آلی (فاعلی) اور مفعولی دونوں مفہوموں کے لئے ہے اور مارواڑی میں صرف مفعول کے لئے۔ اردو 'نے'، ان زبانوں سے ماخوذ نہیں اردو میں 'نے' کا آلی استعمال ان زبانوں کے مشتبہ اور مخلوط دوگونہ استعمال سے کہیں زیادہ قدیم ہے۔ اب صرف دو ہی صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ میرٹھ کی کھڑی بولی سے 'نے' لیا گیا۔ دوسرے مرہٹی سے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اردو مرہٹی حلقۂ اثر سے بہت دور ہے۔ اس لئے وہاں سے لینے کی کوئی صورت نہیں۔ دوسرے مرہٹی میں 'نے' کی نوعیت اردو 'نے' سے ذرا مختلف ہے۔ اردو میں 'نے' غیر منصرف ہے اور مرہٹی میں منصرف۔ اردو میں 'نے' واحد اور جمع دونوں کے لئے ہے مرہٹی میں 'نیں' (بیائے مجہول) مفرد کے لئے ہے 'نیں' (بیائے معروف) جمع کے لئے۔ اردو 'نے'، سنسکرت 'ت یں' سے زیادہ قریب ہے اور مرہٹی 'نیں' اپ بھرنش 'ہ یں' سے۔ اس لئے میرا خیال ہے کہ اردو 'نے'، اور مرہٹی 'نیں' جدا جدا دو صیغے ہیں۔ دونوں ایک دوسرے سے آزاد ہیں۔ نہ یہ اس سے لیا گیا اور نہ وہ اس سے۔ دونوں سنسکرت اور پراکرت عہد سے ارتقاء کے منازل الگ الگ طے کرتے آئے ہیں۔ ان کے استقلال اور ایک دوسرے سے بے نیازی کا ثبوت یہ ہے کہ اردو اور مرہٹی دونوں زبانوں میں 'نے'، قدیم سے ہے اور ان کے قدیم ادب میں اس کا سراغ ملتا ہے۔ گیانیشور اور امیر خسرو قریب

قریب معاصر ہیں اس کا ذکر میں اوپر کر چکا ہوں دونوں کے یہاں 'نے' ہے۔ ان دو زبانوں کو چھوڑ کر جدید آریائی زبانوں کے قدیم ادب میں اس کا کہیں نشان نہیں ملتا۔

اس کے بعد اُردو کی قدامت پر غور فرمائیں۔ یہ زبان جدید آریائی زبانوں میں کسی سے کم عمر نہیں۔ قدیم زمانے سے یہ ترقی کرتی آئی ہے۔ یہ دوآبے کے اس حصہ کی زبان تھی جو آریاؤں کے زمانے سے علم، تہذیب روشن خیالی کا مرکز رہا ہے۔ اس پر قدیم آریائی زبانوں کی گہری چھاپ ہے یہ کسی زمانے میں پالی اور قدیم آردھ ماگدھی کی جانشین تھی اور شاید پالی اسی زبان کی ادبی علمی اور معیاری شکل ہے۔ یہ داستان بڑی طویل ہے۔ لیکن اتنی ہی دلچسپ بھی ہے۔ میں نے 'نے' کی تاریخ سے اس زبان کی قدامت پر جو روشنی ڈالی ہے اس سے اردو کی عظمت اور اس کے خاندانی ہونے کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

"جیسا" کی کہانی

جس طور سے کہ، یا جس صورت سے کہ، کے علاوہ "جیسا" کے اور بھی کئی معنی ہیں جن میں سے چند درج ذیل ہیں:۔

جب (جوں ہی)

"جیسے میں اسٹیشن پر پہنچا گاڑی چھوٹ گئی۔"

جو "پڑھو یا سو جاؤ، جیسا چاہو کرو۔"

گویا "چال جیسے کڑی کمان کا تیر۔" (غالب)

"دیکھتی کیا ہے جیسے اس کے والد چوکھٹے میں ایک تصویر لئے کھڑے ہیں۔" (رویائے صادقہ ص ۹)

فصحا، اردو نے "جیسا" کو مثل و مانند کے معنی میں بھی استعمال کیا ہے اور آج یہ عالم و عامی ہر شخص کی زبان پر ہے۔ (انشا)

اٹھتی کونپل اور چاہت بگیما کیا قہر ہے۔ چاند جیسا لگ گیا بے ڈول یہ لکہ تجھ

ذوق۔

گم ہوں گے اس بساط پہ ہم جیسے بدقمار

کیفی دہلوی :-

غرض مخدوم تحسین کون ہے دنیا میں اس جیسا۔

نذیر احمد :-

"وہ لوگ بھی ہم ہی جیسے تھے "

(رویائے صادقہ ، ص ۱۵۱)

ناطق لکھنوی :-

"ہندو اور مسلمانوں کے باہمی تعلقات بھائیوں جیسے تھے۔

نظم اُردو ، ص ۱۴)

"جیسا" 'جے' اور 'سا' سے مرکب ہے 'جے' (جو) موصول RELATIVE PRONOUN ہے اور سا حرف (بمعنی مثل) سا اور اس کے گھرانے کی بحث کرتا چلوں۔

'سا' بطور لاحقہ استعمال ہوتا ہے۔ یعنی کسی اسم یا حرف کے آخر میں بیواسطہ جوڑا جاتا ہے۔ بے واسطہ کا مطلب ہے کہ اسے جوڑ جاڑ یا میل ملاپ کے لئے کسی دوسرے حرف کی مدد درکار نہیں براہ راست سابق کیلئے پر اضافہ کر دیجئے۔ یہ مثل و مانند کے معنی میں ضرور ہے لیکن مثل و مانند کی طرح نہیں۔ یہ اسم ہیں اور 'سا' حرف یہ میل ملاپ کے لئے 'کا' 'کی' (بعض حضرات کے نزدیک 'کے') کے محتاج ہیں 'سا' ان میں سے کسی کا محتاج نہیں۔ میں نے اس کا مثل نہیں دیکھا۔ اس کی (یا کے) مانند شاید ہی کوئی ہو۔ پہلی مثال میں 'کا' ہے۔ دوسری میں 'کی' (یا کے) 'مجھ سا' اور 'تجھ سا' میں 'سا' کے بعد ان میں سے کوئی حرف نہیں،

شام ہی سے بجھا سا رہتا ہے

پھوڑا سا ساری رات جو پکتا رہے گا دل

ع دشمنی ہم سے کی زمانے نے
کہ جفا کار تجھ سا یار کیا

یہ چند مثالیں ہیں۔ ڈھونڈنے سے اور بھی مل جائیں گی۔

جو صاحبان ہجے کرنے کے خوگر نہیں وہ شاید 'پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے، یاد گل میں اس کی سی جو بو آئی'، ان مثالوں کو دیکھ کر ناک بھوں چڑھائیں اور فرمائیں کہ ان مثالوں میں 'سا' (سی) کو 'کی'، 'کی' مدد سے جوڑا گیا ہے۔ لیکن ہجے کرنے والے جانتے ہیں کہ ان میں 'سی'، کا تعلق "گلاب" اور "اس" سے نہیں 'پنکھڑی' اور 'بو' سے ہے۔

اصل عبارت کی نثر کی جائے تو یوں ہوگی:- "گلاب کی پنکھڑی سی ہے، یاد گل میں اس کی بو سی آئی۔

بہر حال 'سا' بہت پرانا لاحقہ ہے۔ سنسکرت میں یہ 'ش'، 'تھا'، اوستائی میں 'س'، ہے) جہاں بطور لاحقہ استعمال ہوا ہے۔ مثلاً 'کپ ش'، کے معنی ہیں بندر سا (کپ = بندر) اور 'کنٹرک ش' کے معنی ہیں کنکر سا۔ کنٹرک = کنکر) ڈاکٹر چیٹرجی اس کا رشتہ قدیم ہند آریائی 'کو'، سے ملاتے ہیں۔ یہ طویل داستان ہے جسے میں چھیڑنا نہیں چاہتا۔ لیکن یہ امر شبہ سے بالاتر ہے کہ اردو 'سا'، سنسکرت کا 'ش'، تھا جو اردو یا پراکرت میں جس سے اردو نے ارتقا پایا، زبان کی فطرت کے مطابق 'س'، ہو گیا ہے۔ سل سنسکرت میں شلا تھا اور ساگ، شاک۔

'سا'، کی ترکیب سے اردو نے ذیل کے کنایات وضع کئے:-

کیسا (کے = استفہام)، ایسا (اے = اشارہ) ویسا (وے = ضمیر)، جیسا (جے = موصولہ)، تیسا (تے = ضمیر)۔ ان میں 'سا'، کے تشبیہی معنی باقی ہیں

کیسا کے معنی ہیں کس طرح، ایسا کے معنی ہیں اس طرح (قریب کے لئے)، ویسا کے معنی ہیں اُس طرح (بعید کے لئے) "تیسا" کے معنی ہیں تس طرح (اسطرح) "کون سا" اور "جون سا" بھی اگرچہ "سا" ہی کی پیداوار ہیں اور اس کی ترکیب سے بنے ہیں، لیکن یہ "سا" کے معنی کھو چکے ہیں۔ یہ کلمے قریب قریب "کون" اور "جون" کے ہم معنی ہیں "بہت سا" اور "خوب سا" کا بھی یہی حال ہے "بہت سا" کے معنی ہیں بہت اور "خوب سا" کے معنی ہیں خوب۔ حسرت:۔

شکوۂ جور و جفا کو چھوڑ کر شکر ستم
کیجئے اور خوب سا ان کو پشیماں کیجئے

زبان کبھی ایک حالت پر قائم نہیں رہتی۔ آئے دن اس میں ردو بدل ہوتے رہتے ہیں۔ شکست و ریخت کا ایک ختم نہ ہونے والا سلسلہ جاری رہتا ہے "سا" آج بھی تشبیہی معنی میں مستعمل ہے لیکن گردش روزگار کا اس کلمے کی معنوی حیثیت پر اثر پڑا اور بعض صورتوں میں اس کے تشبیہی معنی محو ہو گئے۔ "جیسا" زبان کی بدلنے والی فطرت اور ہمہ گیر ناموس تغیر کے اثر سے کس طرح بے نیاز رہ سکتا تھا۔ اس میں جو معنوی تغیرات ہوئے ان کا ذکر اس مقام پر ناگزیر ہے۔

"جیسا" ہر چند ساخت کے لحاظ سے تشبیہی کلمہ ہے۔ لیکن تشبیہ کے ساتھ اس میں موصولیت اور شرطیت بھی ہے۔ موصولیت کا تقاضا ہے کہ اس کے بعد پورا ایک جملہ صلہ کا ہو جس میں موصول کے ابہام کی وضاحت کی گئی ہو۔ شرطیت کا تقاضا ہے کہ اس کی جزا ہو "جیسا میں نے آپ سے کہا تھا" نامکمل ہے جب تک اس میں ایک جملہ بڑھا کر یوں نہ کہا جائے "جیسا میں نے آپ سے کہا تھا آپ نے اس پر عمل نہیں کیا" اس میں "میں نے آپ سے کہا تھا" صلہ ہے،

آپ نے عمل نہیں کیا، جزا۔ میر کے مصرعے ہیں :۔

جیسا کیا تھا ہم نے ویسا ہی یار پایا

'یار پایا' جزا ہے اور 'ویسا' حرف جزا۔

موصولیت شرطیت کی متضمن ہوا کرتی ہے۔ یعنی اسم موصول میں شرط کے معنی ہوتے ہیں۔ 'جیسا' کی موصولیت کو لونی لگنی شروع ہوئی اور وہ زبان کی تغیر پسند فطرت کی نذر ہوئی تو 'جیسا' مثل کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔ 'مثل' اسم ہے اور اسم کے ساتھ استعمال ہوتا ہے۔ 'جیسا' اپنی قدیم فطرت کی مناسبت سے جملے یا مرکب کے لئے استعمال ہوا۔ 'مثل' کا مشبہ بہ اسم مفرد ہوتا ہے 'جیسا' کا مشبہ بہ بعض صورتوں میں جملہ ہوا۔ مثلاً :۔

چیل ٹوٹے ہے گوشت پر جیسے

چیل کا گوشت پر ٹوٹ کر گرنا مشبہ بہ ہے۔ اور بعض صورتوں میں مرکب مثلاً :۔ چال جیسے کڑی کمان کا تیر

اس میں 'کڑی کمان کا تیر' مشبہ بہ ہے۔ یہ تمثیل ہے اور تمثیل کے لئے اہل اردو 'گویا' استعمال کرتے ہیں، ہندی والے 'مانو'۔

'جیسا' کا ترقی کی طرف یہ پہلا قدم تھا۔ جب اس نے دوسرا قدم اُٹھایا تو وہ 'مثل' کے معنی میں اور اس کی جگہ استعمال ہوا۔

ہڈیوں پر لڑے ہے جیسے سگ

یا جو ہو گا تو جیسے گنہگار ہو گا

جیسے سگ یعنی مثل سگ، اور جیسے گنہگار۔ یعنی مثل گنہگار۔

'سا' کے معنی میں اس کا استعمال ارتقار کی تیسری اور آخری منزل ہے۔ اس کی مثالیں انشا، ذوق، نذیر احمد۔ کیفی اور ناطق کے کلام اور تصانیف

سے اوپر پیش کی جاچکی ہیں۔ جیسا اولاً علقیہ کلمہ تھا۔ اس کے بعد متعلق فعل ہوا۔ پھر اسم اور آخر میں لاحقہ۔ یہ اس کے صرفی نحوی سفرِ حیات کی چار منزلیں ہیں جن میں ایک خاص معنوی ترتیب ہے۔ پہلی دو صورتوں میں اس کا مقام جملے سے پہلے ہے۔ تیسری صورت میں اسم سے پہلے، اور چوتھی صورت میں اسم کے بعد۔

جیسا کے معنوی نیز صرفی نحوی ارتقاء کی یہ ترتیب بڑی حد تک قیاس پر مبنی ہے، اگرچہ یہ قیاس لسانیاتی ہے محض قیاس نہیں۔ لفظ کی ساخت اور فطرت کو دیکھ کر اس کے مختلف استعمالات کی تاریخ متعین کی گئی ہے۔ جیسا کے چوتھے استعمال کی بابت کسی قدر وثوق سے کہا جاسکتا ہے کہ وہ پہلے تین استعمالات کے بعد وجود میں آیا۔ اس کے دو قرینے ہیں۔ پہلا قرینہ نحوی ہے۔ جیسا، اسم کی مغیرہ حالت پر داخل ہوتا ہے۔ اس جیسا، تجھ جیسا وغیرہ۔ اس سے قیاس کیا جاتا ہے (اگرچہ اس کی کوئی مثال مجھے نہیں ملی) کہ کسی زمانے میں یہ علامت اضافت (کا، کی) کی مدد سے اسم کے آخر میں لاحق کیا جاتا رہا ہوگا۔ علامت اضافت تخفیف ہو گئی۔ اسم کی محرف حالت آج تک برقرار ہے۔ دوسرا قرینہ تاریخی ہے۔ عہد اول کے اردو شعراء کے یہاں مجھے یہ استعمال نہیں ملا۔ اس لئے میں سمجھتا ہوں اٹھارہویں صدی کا نصف آخر اس کے ابھار یا پیداوار کا زمانہ ہے۔

'جوں' ج (موصولہ) اور 'وں' سے مرکب ہے۔ 'جیسا' کی طرح اسکی موصولیت باطل ہو چکی ہے اور اب وہ (جیسا) کی وضع پر مثل (مانند) کے معنی میں مستعمل ہے:۔ بیٹھا ہوں جوں غبارِ ضعیف اب، دگر نہ
میں پھرتا رہا ہوں گلیوں میں آوارہ گرد سا

ابتدائی سطروں میں، میں نے عرض کیا تھا کہ جیسا۔ جو، جب، یا جوں کے معنی میں بھی ہے۔ یہ سب تجرید کا کرشمہ ہے۔ 'جیسا' کو اس کے جزو اول یعنی 'ج' سے مجرد کیا گیا تو اس کے تشبیہی استعمالات وجود میں آئے۔ جب اسکے جزو ثانی یعنی 'سا' کی تجرید ہوئی تو وہ موصول کے طور پر استعمال ہوا۔

بہر حال الفاظ کے معنوی تغیرات و استعمالات کے سلسلے میں، تجرید کی بڑی شان ہے۔ اس کی مدد سے زبان کے بڑے بڑے عقدے کھلے ہیں۔ آخر میں یہ اور عرض کر دوں کہ حضرات لکھنؤ 'جیسا' کی جگہ 'ایسا' استعمال کرتے ہیں۔

"کی" کی جگہ "کے" کیوں؟

ڈاکٹر مولوی عبدالحق مدظلہ اردو ادب اور زبان کے بہت بڑے پارکھ ہیں۔ ان کا علم و فضل اور ادبی لسانی مسائل میں غیر معمولی تبحر ہمیں اپنے اسلاف کی یاد دلاتا ہے۔ ایسی ہی بے مثال شخصیتیں بقیۃ السلف کہلاتی ہیں "قومی زبان" کی اشاعت یکم دسمبر ۱۹۵۷ء میں "ترکیب اضافی میں "کی" کی بجائے "کے" کا استعمال" کے زیر عنوان مولوی صاحب قبلہ کا ایک مختصر ادبی افادہ[1] دیکھ کر خیال ہوا کیا ہی اچھا ہو اگر "قومی زبان" کے ذریعے مولوی صاحب کے ادبی و لسانی افادات برابر اسی طرح شائع ہوتے رہیں تاکہ اردو زبان سے دلچسپی رکھنے والے اصحاب ان سے اپنی معلومات میں اضافہ کر سکیں۔ اس سلسلے میں مجھے چند گزارشیں پیش کرنی ہیں۔

جس طرح "کی" کی جگہ "کے" اردو میں استعمال ہوا ہے "ری" (علامت اضافت مونث) کی جگہ "رے" (علامت اضافت مذکر) بھی بکثرت مستعمل ہے۔ مرزا شوق لکھنوی کا شعر ہے۔

---

[1] یہ ادبی افادہ اس مضمون کے آخر میں ملاحظہ کیجئے۔

مر رہا تو جگت کے مارے ہے جان پر بن رہی ہمارے ہے

"جان پر ہماری" کی جگہ "جان پر ہمارے" اردو محاورے اور روزمرّہ کے مطابق ہے۔ میر کا شعر ہے۔

اک شور ہو رہا ہے خوں ریزی میں ہمارے
حیرت سے ہم تو چپ ہیں کچھ تم بھی بولو پیارے

اس شعر کو نقل کرنے کے بعد مولانا نظم طباطبائی مرحوم نے لکھا تھا۔ میر تقی میر سے یہاں سہو ہوا۔ "ہماری" کی جگہ "ہمارے" قاعدے کے خلاف ہے۔ مولانا نظم مرحوم اُردو نحو کے اس قاعدے سے باخبر تھے کہ قلب ترکیب کی صورت میں "میری" کی جگہ "میرے" بھی صحیح ہے پھر انھوں نے میر کے مندرجہ بالا شعر میں "ہماری" کی جگہ "ہمارے" کو میر کا نحوی سہو کیسے قرار دیا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔

بہر حال مولانا نظم مرحوم کے نزدیک اُردو زبان کا نحوی ضابطہ یہ ہے کہ ترکیب اضافی اپنے اصل پر ہو تو تانیث کی صورت میں "کی" کہنا واجب ہے۔ قلب ترکیب کی حالت میں "کی" اور "کے" دونوں جائز ہیں، ایک تیسری صورت یہ ہے کہ مضاف سرے سے مذکور نہ ہو۔ اس صورت میں "کے" واجب اور ضروری ہے۔ اس کی حسب ذیل تین مثالیں مولانا نے پیش کی ہیں۔ اس کے کنگھی کی۔ اس کے گدگدی کی۔ اس کے چٹکی لی۔ ان مثالوں میں "کے" کی جگہ "کی" غلط اور اردو محاورے کے خلاف ہے۔ اسکے لڑکا ہوا۔ اس کے پھنسی نکل آئی۔ ہمارے چوری ہوگئی۔ یہ سب مثالیں حذف و تقدیر مضاف کی ہیں۔ مضاف مقدر مذکر ہو یا مونث (مثلاً بغل گردن وغیرہ) ہر صورت میں کہیں گے ہیں نے اس کے چٹکی لی۔ اس کے

پھنسی نکل آئی۔

یہاں کئی نکتے اس قابل ہیں کہ ان کی طرف اہل علم کی توجہ منعطف کرائی جائے۔ قلب ترکیب کی صورت میں کہیں صرف "کے" کہنا صحیح ہے۔ جیسے مانند شیر کے۔ مثل چاند کے۔ طرف آسمان کے۔ ان مثالوں میں "کے" کی بجائے "کی" صحیح نہیں نظم مرحوم نے لکھا ہے کلکتہ میں ایک صاحب کی غزل میرے پاس اصلاح کو آئی اس میں یہ مصرعہ بھی تھا اور یہی زمین بھی تھی۔

پھینکی کمند آہ طرف آسمان کے

میں نے دیکھا کہ یہاں "کی" کہیں تو محاورے کا خون ہوتا ہے۔ یونہی رہنے دیا، اب چاہے کوئی غلط سمجھے لیکن لفظ "طرف" میں محاورہ یہ ہے کہ اصل ترکیب باقی ہو تو "کی" کہیں اور قلب کی صورت میں "کے" کہیں "کے" اور "کی" دونوں صحیح ہیں۔ میر کے اس شعر میں۔

جان یہ ہے ترے گھوڑے میں کہ تا روز جزا
گرد کو اس کی نہ پہنچے گی کبھی اس کی اجل

"اس کی" اور "اس کے" دونوں طرح پڑھ سکتے ہیں۔

"کے" علامت اضافت "کا" کی محرف (Oblique form) شکل ہے۔ مضاف کے بعد اگر حروف مغیرہ (سے۔ کو۔ میں۔ پر۔ تک وغیرہ) میں سے کوئی حرف ہو تو "کا" صورت بدل کر "کے" ہو جاتا ہے۔ قاعدہ یہ ہے کہ مضاف، مضاف الیہ سے پہلے ہو اور مضاف کے ساتھ حرف مغیرہ بھی ہو تو "کے" اور "کی" دونوں درست ہیں۔ اور اگر حرف مغیرہ نہ ہو تو "کی" بصورت تانیث اور "کا" بصورت تذکیر ہوگا جیسے۔

نقش کردوں خوبی اس چہرہ کتابی کی (میر)

بتی اس کے میل کی بتی اگر کی ہو گئی (ناسخ)

ان مثالوں میں مضاف اگرچہ مضاف الیہ سے پہلے ہے لیکن مضاف کے ساتھ کوئی حرف مغیرہ نہیں، اس لئے "کے" یہاں صحیح نہ ہوگا۔ ذیل کی مثالوں میں مضاف کے ساتھ حرف مغیرہ بھی ہے۔

(۱) میدان میں تھا حشر بپا چال سے اس کے
(۲) آئے بانیں پر جو مجھ بیمار کے
(۳) داڑھی میں لال بال تھے اس بدنہاد کے
(۴) معرفت میں اس خدائے پاک کے
(۵) اک شور ہو رہا ہے خوں ریزی میں ہمارے
(۶) سُرمہ دیا آنکھوں میں کبھی نور نظر کے
(۷) جان پر بن رہی ہمارے ہے
(۸) گرد کو اس کی نہ پہونچے گی کبھی اس کی اجل

ان میں "کی" اور "کے" دونوں درست ہیں۔ آخری مثال میں شاعر نے "کی" ہی لکھا ہے۔

یہاں دو سوال پیدا ہوتے ہیں۔ اول یہ کہ "طرف آسمان کے" اور "مانند شیر کے" وغیرہ مثالوں میں جہاں مضاف مقدم ہے لیکن اس کے ساتھ حروف مغیرہ میں سے کوئی حرف نہیں اور "اس کے چٹکی لی" "اس کے کنگھی کی" وغیرہ مثالوں میں جہاں سرے سے مضاف ہی نہیں "کے" کیسے آیا اور کیوں؟ دوسرے "کی" علامت تانیث ہے۔ اس کی جگہ "کے" علامت تذکیر لانا کیسے صحیح ہوا؟ ان سوالوں کا مختصر اور کم سے کم الفاظ میں جواب یہ ہے کہ "سے" اردو میں ظرف کی نشانی ہے۔ جہاں

ظرفیت بتانا چاہتے ہیں اردو کلمے کے آخری الف یا (ہ) کو " ے " سے بدل لیتے ہیں۔ ندی کنارے۔ صبح سویرے۔ منھ اندھیرے "تری آواز مکے اور مدینے " ان مثالوں میں کنارہ۔ سویرا۔ اندھیرا وغیرہ کلمات کے الف (یا ہ) کو " ے " سے بدل کر جگہ اور وقت کا اظہار کیا گیا ہے "ندی کنارے " کے معنی ہیں ندی کے کنارے پر (اسی لئے اس کے بعد "پر " کہنا صحیح نہیں) اوپر کی مثالوں میں جہاں مضاف کو حذف کر دیا گیا ہے " کے " واضح طور سے ظرف کے لئے ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ اس کے بعد اگر " یہاں " " وہاں " وغیرہ کوئی ظرفی کلمہ مقدر مانیں تو معنی درست ہو جاتے ہیں۔ اس کے چٹکی لی۔ اس کے وہاں چٹکی لی۔ اس کے لڑکا ہوا۔ اس کے وہاں لڑکا ہوا " وہاں " عام ہے۔ گردن۔ بغل۔ جانگھ جہاں بھی چٹکی لیں یونہی کہیں گے۔ اس کے وہاں چٹکی لی۔ اس سے ثابت ہوا کہ مضاف مقدر کوئی خاص لفظ نہیں۔ یہاں وہاں قسم کا کوئی عام ظرفی کلمہ ہے۔ جن مثالوں میں مضاف مقدم ہے وہاں اگر ترکیب مقلوب فرض کریں تو مضاف کی رعایت سے " کی " کہنا ضروری ہوگا۔ جیسے " گرد کو اس کی " اور اگر مضاف محذوف و مقدر سمجھیں تو " وہاں " کو مضاف مان کر " کے " لانا پڑے گا۔ " داڑھی میں لال بال تھے اس بدنہاد کے " اصل میں یوں تھا۔ اس بدنہاد کے وہاں داڑھی میں لال بال تھے۔ یہ زبان کا خاص محاورہ یا انداز بیان ہے۔ عربی میں قطع زیدہٗ یدہٗ (زید کاٹ دیا گیا اس کا ہاتھ) اس سے بہت مشابہ ہے۔ " سرمہ دیا آنکھوں میں کبھی نور نظر کے " یعنی نور نظر کی آنکھوں میں سرمہ دیا۔ دوسری مثالوں کو اس پر قیاس کر لیا جائے۔ طرف کے ساتھ " کے " لانا شاید اس لئے ضروری ہوا کہ اس میں

ظرفیت کے معنی ہیں اور جس لفظ میں ظرفیت ہو اگر اسے علامت اضافت سے پہلے لائیں تو اس کے بعد "وہاں" مقدر ماننا ہوگا۔ مثل، مانند وغیرہ کلمات ہر چند ظرفی نہیں لیکن چونکہ وہ فعل کی کیفیت بتاتے ہیں اس لئے انھیں ظرف کی حیثیت دیدی گئی۔

(۳)

جن اُردو اسمائ صفات، افعال نیز حروف کے آخر میں الف ہے اکثر دیکھا گیا ہے کہ ان کا الف "ے" ہو جاتا ہے اور وہ، الف، کی بجائے "ے" سے لکھے جاتے ہیں، جیسے۔

؎ جیتے جی کوچہ دلدار سے آیا نہ گیا

؎ تاب لاتے ہی بنے گی غالب

؎ مت پوچھ کہ کیا حال ہے میرا ترے پیچھے
تو دیکھ کہ کیا رنگ ہے تیرا مرے آگے

؎ مجھ پہ طوفاں اُٹھائے لوگوں نے
مفت بیٹھے بٹھائے لوگوں نے

؎ مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کئے ہوئے
جوش قدح سے بزم چراغاں کئے ہوئے

ان مثالوں میں جیتے، لاتے، پیچھے، آگے، بیٹھے بٹھائے، کئے ہوئے وغیرہ کلمات کے آخر میں الف تھا یہاں وہ "ے" پر ختم ہوئے ہیں۔ آپ نے غور کیا کیوں؟ اُردو میں کلمے کا آخری الف جمع کی صورت میں "ے" ہو جاتا ہے جیسے "میرے گھوڑے"۔ "طوفاں اُٹھائے" یا اس وقت "ے" ہوتا ہے جب اس کے بعد میں "پر"، "سے"، "تک"، "نے" کو وغیرہ حروف میں سے کوئی حرف

ہو جیسے گھوڑے سے، گھوڑے پر، گھوڑے کو وغیرہ۔ مذکورہ بالا کلمے نہ تو جمع کے صیغے ہیں، نہ ان کے بعد مذکورہ بالا حروف میں سے کوئی حرف ہی ہے پھر ان کا الف کس لئے "ے" ہوا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ ان کلمات کی "ے"، پراکرت، اپ بھرنش، مغربی ہندی سے ہوتی ہوئی اردو میں آئی۔ سنسکرت میں اسم کی آٹھ حالتیں ہیں ان میں سے ایک "ادھی کرن" بھی ہے۔ انگریزی میں اس کا ترجمہ (locative) کیا گیا اردو والوں نے اسے ظرفی کہا۔ لیکن اس کا مفہوم کسی قدر وسیع تر ہے۔ اسے ایک طرح کا متعلق فعل (Adverb) کہئے سنسکرت ادھی کرن کی علامت "ے"، جدید آریائی زبانوں کو ترکے میں ملی۔ اردو کی معاصر بولیوں نے آغوش کھول کر اس کی پذیرائی کی۔ ہر اسم کے آخر میں اس نے جگہ پائی۔ لیکن اردو نے اس کے ساتھ کچھ تکلف برتا۔ اس نے ان اسماء کے آخر میں اسے جگہ دی جو الف پر ختم ہوتے تھے۔ باقی اسماء بدستور ہیں، پر، وغیرہ حروف کی مدد سے گردانے گئے۔ "دس منٹے" بنگلا ہے اس میں منٹ کے آخر کی "ے" ظرفی ہے۔ اس کے معنی ہیں دس منٹ میں، "لاہورے" کے معنی ہیں لاہور میں۔ "کالجے" کالج میں۔ اسکولے میدانے۔ گھرے وغیرہ کلمات بھی اسی قسم کے ہیں۔ اردو میں "ترے ماتھے لگا سندور"، "ندی کنارے بگلا بیٹھا" وغیرہ مثالوں میں ماتھے اور کنارے جیسے الفاظ میں یائے ظرفی کو جگہ مل سکی اس لئے کہ وہ الف پر ختم ہوتے تھے

مذکورہ بالا مثالوں میں آگے، پیچھے اسماء ظرف ہیں۔ "جیتے جی" کے معنی ہیں جیتے وقت یعنی زندگی میں۔ "بیٹھے بٹھائے" جس وقت میں اطمینان سے بیٹھا ہوا تھا۔ "مہماں گئے ہوئے" جب یار مہمان تھا، تاب

لاتے" برداشت کرتے۔ سب ظرفی حالتیں ہیں۔ ان کی " ے " ظرفیت کی ہے۔ دو ایک مثالیں اور ملاحظہ ہوں۔

"جب کنارہ آگیا" اس میں "کنارہ" فاعلی حالت میں ہے "جب میری کشتی کنارے لگی" یہاں "کنارے" ظرفی حالت میں ہے "سویرا ہوگیا" میں "سویرا" فاعلی حالت میں ہے۔ "سویرے جو آنکھ میری کھلی" یہاں ظرفیت نے اس کے الف کو " ے " سے بدل دیا" جب میں بیدار ہوا تو اندھیرا تھا" (فاعلی) "منھ اندھیرے میں بیدار ہو جاتا ہوں" (ظرفی) ہنستے کھیلتے۔ آتے جاتے، چلتے چلاتے، بھاگتے دوڑتے۔ وغیرہ وغیرہ

اردو محاورے کا ایک نازک فرق ملاحظہ ہو۔ "وہ دوڑتا ہوا میرے پاس آیا" اس جملے میں حالت بتائی گئی ہے۔ یعنی جب وہ آیا تو دوڑ رہا تھا، "وہ دوڑتے ہوئے ناک سے سانس لیتا ہے" اس میں وقت بتایا گیا ہے جب وہ دوڑتا ہے تو ناک سے سانس لیتا ہے۔ پہلی مثال میں دوڑتا، الف سے ہے اور دوسری میں " ے " سے۔

اردو میں کئی اسمار ایسے ہیں جن کے آخر میں الف ہے جیسے آگا پیچھا، نیچا، پہلا، یہ اسماء اگر بطور ظرف مستعمل ہوں تو " ے " پر ختم ہوں گے۔ جیسے آگے گیا، پیچھے رہ گیا، نیچے آؤ، پہلے میں ہوں۔ یہی اسمار اگر بطور اسم یا صفت استعمال ہوں تو ان کے آخر میں الف ہوگا۔ جیسے کبوتر نیچا اڑ رہا تھا، پہلا شخص کون ہے۔ یا آگا پیچھا دیکھ کر چلو۔

لاحقات اضافت (کا، را) اردو میں ہمیشہ مضاف کے مطابق ہوا کرتے ہیں جیسے میرا گھوڑا، میری گھوڑی، میرے گھوڑے، میرے گھوڑے پر۔ اس لئے اگر مضاف ظرف ہو تو یہ لاحقے " ے " پر ختم ہوں گے۔ جیسے تیرے پیچھے،

میرے آگے۔ غالب کا شعر اوپر درج ہو چکا ہے۔

مت پوچھ کہ کیا حال ہے میرا ترے پیچھے ۵
تو دیکھ کہ کیا رنگ ہے تیرا مرے آگے

ایک اور شعر ہے۔

حسن غمزے کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد
بارے آرام سے ہیں اہلِ جفا میرے بعد

"میرے" میں "ے" اس لئے آئی کہ اس کا مضاف لفظ "بعد" تھا جو اسم ظرف ہے۔

کبھی لاحقات اضافت "کے بعد" کا اسم ظرف حذف ہو جاتا ہے اور اضافی لاحقے کی "ے" اس کی جگہ لے لیتی ہے۔ جیسے اس نے میرے چٹکی لی۔ اس کے لڑکا ہوا۔ اس کے پھنسی نکل آئی، ہمارے چوری ہو گئی۔ ان مثالوں میں میرے اس کے، ہمارے وغیرہ ضمائر کی "ے" ظرفیت کی ہے اور اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ اس میں کسی مقام کی خصوصیت نہیں۔ بغل، گردن، ران، جہاں بھی چٹکی لی گئی ہو ہر صورت میں کہتے ہیں میں نے اس کے چٹکی لی۔

اب ذرا ذیل کے مصرعے ملاحظہ ہوں۔

۱۔ ایک شور ہو رہا ہے خوں ریزی میں ہمارے — میر
۲۔ سرمہ دیا آنکھوں میں کبھی نور نظر کے — انیس
۳۔ میدان میں تھا حشر بپا چال سے اس کے — "

ــــــہ ان کا، کے، بھی اسی قسم کا ہے۔

اس کے پہلے (اس سے پہلے) اس کے درمیان۔ اس کے بیچ۔ اس کے اوپر۔ اس کے یہاں۔ اس کے نزدیک۔ اس کے پاس۔ اس کے گھر۔

۴۔ معرفت میں اس خدائے پاک کے — آتش

۵۔ آئے بالیں پر جو مجھ بیمار کے — امیر

۶۔ داڑھی میں لال بال تھے اس بدخصال کے — برق

۷۔ جان پر بن رہی ہمارے ہے — شوق

یہاں شعرائے کرام نے جو مستند زباں داں اور اساتذہ فن سخن ہیں اضافی لاحقے کے۔ رے (رے کے ساتھ) استعمال کئے ہیں۔ ان کے بعد کوئی اسم نہیں جسے ان کا مضاف قرار دیا جا سکے۔ ان سے پہلے ہر چند خوں ریزی، آنکھوں، چال، معرفت، بالیں، داڑھی جان وغیرہ اسمار کا ذکر ہو چکا ہے لیکن یہ اسمار مونث ہیں (سوائے "بالیں" جس کی تذکیر و تانیث میں اختلاف ہے) اور کے۔رے، مذکر کے لئے ہیں اس لئے یہ اسمار کے، اور ہمارے، کا مضاف نہیں ہو سکتے۔ سوال یہ ہے کہ ان مثالوں میں، کا، کے، اور را، رے، کیوں ہوا؟۔

ان لاحقات کی رے، ویسی ہی ہے جیسی " اس نے میرے چٹکی لی" کی رے،۔ ان کے بعد کے اسمار ظروف حذف ہو گئے اور رے، ان کی قائم مقامی کر رہی ہے۔ نور نظر کے۔ خدائے پاک کے وغیرہ کا مفہوم ہے۔ نور نظر کے وہاں۔ خدائے پاک کے وہاں۔ جیسے اس کے لڑکا ہوا۔ کا مفہوم تھا۔ اس کے وہاں یعنی اس کے گھر۔ مولانا نظم طباطبائی فرماتے ہیں۔

"سرمہ دیا آنکھوں میں کبھی نور نظر کے" اگر، آنکھوں میں، حذف کر دیں تو یہ فقرہ رہ جائے گا۔ سرمہ دیا کبھی نور نظر کے، اور اب کے، کہنا واجب ہوگا۔ جیسے لوگ کہتے ہیں، اس کے کنگھی کی۔"

اردو زبان کا نحوی ضابطہ ہے ا۔

۱ - اگر مضاف مذکور نہ ہو تو 'کے' ضروری ہے۔ جیسے اس کے کنگھی کی۔

۲ - اگر مضاف مذکور ہو لیکن لاحقہ اضافت سے پہلے ہو تو تانیث کی صورت میں کہیں "کی" اور کہیں "کے" دونوں صحیح ہیں اور کہیں صرف 'کے'،

گرد کو اس کی نہ پہنچے گی کبھی اس کی اجل

یہاں 'گرد کو اس کی' اور 'گرد کو اس کے' دونوں طرح صحیح ہے۔ مانند تیر کے، مثل چاند کے۔ طرف آسمان کے۔ ان میں 'کے' صحیح ہے اور 'کی' غلط۔

پہلے اصول پر یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ مضاف محذوف کی صورت میں بھی اساتذہ نے 'کی' استعمال کیا ہے۔

ے تجھے کیونکہ ڈھونڈھوں کہ سوتے ہی گزری
تری راہ میں اپنے پائے طلب کی

ے کس حسن سے لکھوں میں اس کی خوش اختری کی
اس ماہرو کے آگے کیا تاب مشتری کی

ے کوئی بات نکلے ہے دشوار منہ سے
ٹک اک تو بھی تو سن کسی جاں بلب کی

ے کسو نے حال سے میرے کبھی نہ تجھ سے بات
اگر کبھی کسو نے تو اپنے مطلب کی

اس کا جواب یہ ہے کہ قاعدہ یہ تھا کہ مضاف مذکور نہ ہو تو 'کے' کہیں گے۔ آخر کے تین شعروں میں مضاف مذکور ہے اور وہ 'بات' یا 'تاب' ہے۔ پہلے شعر میں اگرچہ مضاف (عمر) لفظاً مذکور نہیں لیکن بقول غالب ع

مژدۂ قتل مقدر ہے کہ مذکور نہیں

مقدر ہے اور مقدر مذکور کے حکم میں ہے 'مذکور نہ ہو' کا سیدھا اور صاف

مفہوم یہ ہے کہ لفظاً اور تقدیراً اس کا ذکر نہ ہو۔ یعنی نہ ملفوظ ہو اور نہ مقدر۔

دوسرے اصول کے بارے میں بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ لفظ مانند کو جلال اور صاحب مجمع البحرین نے مذکر لکھا ہے۔ مولوی عبدالباری آسی کی تصحیح کردہ کلیات سودا و میر میں مانند کی ردیف کی کئی غزلیں ہیں۔ ان میں "کے مانند" (یائے مجہول سے) ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ۔ اس سے قطع نظر کہ یہ امر زیر بحث نہیں کہ مانند مذکر ہے یا مونث مولوی سید احمد دہلوی، مولوی عبدالحق، مولوی کریم الدین، ڈاکٹر فیلن، مسٹر پلیٹس وغیرہ اہل علم مانند کو مونث بتاتے ہیں، پلیٹس لکھتے ہیں، مانند مونث ہے۔ ترکیب اضافی اپنی اصل پر ہو تو کہیں گے، اس کی مانند، قلب ترکیب کی صورت میں "کی"، "کے"، ہو جائے گا اور یوں کہا جائے گا۔ "مانند اس کے" مولانا سید احمد دہلوی بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق، پلیٹس وغیرہ اہل علم پر جلال، صاحب مجمع البحرین اور عبدالباری آسی کے قول کی وجہ ترجیح؟ اور اگر یہ مان بھی لیں کہ مانند مذکر ہے تو میری پیش کردہ مثالیں دو اور بھی ہیں۔ مثل چاند کے۔ طرف آسمان کے۔ ان کے بارے میں کیا کہا جائے گا۔ کیا مانند کی طرح "مثل" اور "طرف" بھی مذکر ہیں۔ میں نے لکھا تھا کہ کلکتے میں ایک صاحب نظم مرحوم کے پاس اصلاح کے لئے غزل لائے جس کا ایک مصرعہ تھا

پھینکی کمند آہ طرف آسمان کے

مولانا نظم نے اس مصرعے کو یونہی رہنے دیا اور لکھا لفظ طرف میں محاورہ یہ ہے کہ اصل ترکیب باقی ہو تو "کی"، کہیں اور قلب کی صورت میں "کے"،

پھر یہ بھی سوچنے کی بات ہے کہ میر و سودا کے کلام میں "کا مانند" کا، "کے مانند" (ے کے ساتھ) کیسے ہوا اور کیوں؟ کیا مانند کے ساتھ "کا" "کے" ہو جاتا ہے؟

ادبی افادہ از مولوی عبدالحق :-

کچھ دن ہوئے ایک صاحب نے اخبار میں میر انیس کا یہ شعر لکھا دیکھا ؎

دب دب گئے تھے نیزے جو اقبال سے اس کے
میدان میں تھا حشر بپا چال سے اس کے

انھیں یہ دیکھ کر کہ چال کو مذکر استعمال کیا ہے شبہ ہوا کہ یہ شعر انیس کا نہیں ہو سکتا۔ لیکن درحقیقت یہ شعر میر انیس ہی کا ہے۔ حال میں ایک اور صاحب نے امیر کا یہ شعر لکھا :-

آئے بالیں پر جو مجھ بیمار کے
خوب روئی موت ڈاڑھیں مار کے

اس شعر کو نقل کرنے کے بعد انھوں نے لکھا کہ امیر نے بالیں کو مذکر لکھا ہے، حالانکہ بالیں مؤنث ہے لیکن ان کا قیاس صحیح نہیں ہے۔ امیر بھی بالیں کو مؤنث ہی مانتے تھے۔

ان دونوں صاحبوں کو حرف اضافت "کے" کے استعمال سے غلط فہمی ہوئی، اصل بات یہ ہے کہ بعض اوقات، جب اضافی ترکیب اپنی اصل حالت پر نہیں ہوتی اور حرف اضافت جو عموماً مضاف الیہ اور مضاف کے درمیان ہوتا ہے آخر میں واقع ہو تو محاورے میں "کی" کے بجائے "کے" استعمال ہو جاتا ہے۔ جیسے مانند شیر کے۔ یہاں 'کے' مذکر کے لئے استعمال ہوا ہے حالانکہ مانند مؤنث ہے۔ معمولی نحوی ترکیب میں کہیں گے شیر کی مانند۔ یا مثلاً آتش کا شعر ہے ؎

معرفت میں اس خدائے پاک کے
اُڑتے ہیں ہوش و حواس ادراک کے

معرفت مؤنث ہے لیکن ترکیب کے تغیر سے اس کے لئے آخر میں "کی" کی بجائے "کے" استعمال ہوا ہے۔ میر تقی میر فرماتے ہیں :-

آنکھوں میں ہیں حقیر جس تس کے

زبان کا محاورہ یہی ہے، اس میں اعتراض کی گنجائش نہیں۔ اگرچہ عام نحوی قاعدہ اس کے خلاف ہے۔ یہ استعمال اکثر نظم میں ہوتا ہے۔"

اُردو کی مفعولی ضمیریں

حال ہی میں ڈاکٹر عبدالستار صاحب صدیقی کا ایک مختصر مگر پر مغز مضمون قومی زبان میں شایع ہوا ہے۔ جس میں ڈاکٹر صاحب نے اُردو کی مفعولی ضمیروں کی لسانی اور نحوی تحقیق فرمائی ہے۔ سلسلہ میں بعض اور نحوی اور نحوی مباحث بھی آ گئے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب موصوف ادب اور زبان کے مسائل پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ میں نے ان کی تحقیقات سے بہت کچھ فائدہ اٹھایا ہے۔ اسلئے میں ان کی ہر تحریر کو شوق و دلچسپی سے پڑھتا ہوں۔ یہ تحریر پڑھنے کے بعد میرے دل میں کچھ شکوک پیدا ہوئے ہیں جن کا اظہار ضروری ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے مفعول مطلق کی تعریف ان الفاظ میں فرمائی ہے۔

"وہ مفعول جو جملے کے فعل کا مصدر ہو یا بجائے اسی مادے کے کسی اور (مگر ہم معنی) مادے کا مصدر ہو" میرا خیال ہے کہ یہ تعریف ادھوری ہے۔ اس میں یہ الفاظ اور ہونے چاہئیں۔ اور "بطور مصدر مستعمل ہو" یہ اس لئے کہ ہر مصدر میں یہ صلاحیت نہیں کہ وہ مفعول مطلق ہو سکے۔ سامی اور آریائی زبانوں

میں مصادر کبھی مصدر یا حاصل مصدر کے علاوہ دوسرے اسمی معنی میں بھی استعمال ہوتے ہیں اور اس صورت میں وہ مفعول مطلق کی بجائے مفعول بہ ہوتے ہیں۔ مصدر کے تین مختلف استعمال ہیں۔ کبھی وہ کسی فعل کا ہونا نہ ہونا یا کرنا نہ کرنا بتاتا ہے۔ اسے مصدر کہتے ہیں۔ جیسے کھانا۔ پینا۔ اٹھنا۔ بیٹھنا وغیرہ۔ کبھی یہ فعل کا نام ہوتا ہے۔ عربی میں اسے حاصل مصدر اور انگریزی میں Noun of action کہتے ہیں۔ جیسے مارپیٹ۔ ہار۔ جیت وغیرہ اور کبھی یہ اس چیز پر دلالت کرتا ہے۔ جس پر فعل واقع ہوا ہے یا جس کا فعل سے تعلق ہے۔ اس صورت میں یہ اسم مفعول ہوتا ہے۔ جیسے خلق بمعنی مخلوق۔ لباس بمعنی ملبوس۔ کتاب بمعنی مکتوب۔ اردو میں لگان اور کھیل اور فارسی میں بازی اگرچہ بظاہر مصدر (یا حاصل مصدر) ہیں لیکن حقیقت میں وہ اسم مفعول ہیں لگان وہ رقم ہے جو کسی پر بطور ٹیکس لگائی جاتی ہے۔ کھیل اور بازی وہ دلچسپ مشغلے (جیسے کرکٹ۔ فٹ بال) ہیں جن میں مشغول رہ کر انسان اپنا دل بہلاتا ہے۔ اب ذرا عربی مثالیں ملاحظہ فرمائیں۔

کتبتُ کتاباً (میں نے ایک کتاب لکھی) لعبتُ لعباً (میں نے ایک کھیل کھیلا) اکلتُ لقمۃً (میں نے ایک نوالہ کھایا) ان مثالوں میں کتاب اور لعب فعل کے مصدر ہیں لیکن لقمہ (لقم بمعنی نگلنا) اتنی غذا جو ایک بار حلق سے نیچے اتاری جا سکے مصدر ہے اور اکلتُ فعل کا ہم معنی ہے۔ یہ سب مصدر ہوتے ہوئے بھی مفعول بہ ہیں۔ اس کی ایک اچھی پہچان کہ مصدر بطور اسم استعمال ہوا ہے یہ ہے کہ اس جملے میں فاعل یا نائب فاعل بنایا جا سکے۔ اگر معنی میں خلل نہ ہو تو وہ اسم ہے۔ کُتِبَ الکتابُ صحیح ہے لیکن ضُرِبَ الضربُ غلط ہے۔ اس لئے کتاب مفعول بہ ہے اور ضرب مفعول مطلق۔ دیسے صورت اور ساخت

کے اعتبار سے دونوں مصدر ہیں۔

اس تفصیل کے بعد ان مثالوں کو لیجئے جو ڈاکٹر صاحب نے اردو فارسی زبانوں سے پیش کی ہیں۔ اور ان میں استعمال ہونے والے اسمار کو مفعول مطلق بتایا ہے۔ ان میں یہ دو مثالیں بھی ہیں: "بازئے بازیدم"۔ "وہ ایسے ہی کھیل کھیلتا ہے"۔ ان مثالوں میں (بازی) اور (کھیل) اگرچہ صورۃً حاصل مصدر ہیں اور بناوٹ کے لحاظ سے انھیں حاصل مصدر ہی کہا جائے گا۔ لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا یہ معنیً اسم مفعول ہیں۔ ٹھیک اسی طرح جیسے اوپر کی مثالوں میں ان کا ہم معنی لفظ لعب ہے اس لئے ترکیب میں انھیں مفعول بہ ہونا چاہیئے۔ اور میرا خیال ہے کہ یہ مفعول بہ ہیں۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر صاحب نے دو مثالیں اور بھی پیش کی ہیں۔ ایک ابر باراں می بارد۔ دوسرے اس نے ایک بستی بسادی۔ ڈاکٹر صاحب نے باراں اور بستی کو حاصل مصدر بتایا ہے۔ باراں فارسی کا اسم حالیہ ہے اور بستی اردو کا۔ یہاں یہ دونوں کلمے فاعلی معنی میں استعمال ہوئے ہیں۔ باراں برسنے والا پانی اور بستی آباد ہونے والی نگریا۔ ان لفظوں کے صحیح اور مناسب معنی یہ ہیں۔ معلوم نہیں ڈاکٹر صاحب نے ان کو کس لحاظ سے مصدر یا حاصل مصدر ٹھہرایا۔

عربی میں بھی اعرابی حالتیں ہیں اور سنسکرت وغیرہ آریائی زبانوں میں بھی۔ لیکن آریائی زبانوں کی حالتیں تعداد میں عربی سے زیادہ ہیں۔ ان میں سے دو حالتیں ایسی ہیں جو معنوی لحاظ سے بعض باتوں میں عربی سے مشابہ ہیں۔ ایک سمپر دان یا Dative دوسرے کرم Accusative کسی صاحب نے ان میں سے پہلی حالت یعنی سمپر دان کا ترجمہ مفعول لہٗ کیا اور دوسری کا مفعول مطلق یا مفعول علیہ۔ ڈاکٹر صاحب کو اس پر اعتراض ہے۔ جہاں تک

عربی صرف و نحو کی اصطلاحوں کا تعلق ہے ان کا اعتراض بجا اور درست ہے۔ عربی میں مفعول علیہ کوئی اصطلاح نہیں۔ مفعول مطلق اور مفعول لہٗ اصطلاحیں ہیں لیکن سنسکرت سمپردان اور کرم سے مختلف۔ ان کو سنسکرت اصطلاحوں پر منڈھا نہیں جا سکتا۔ ڈاکٹر صاحب نے سمپردان کا ترجمہ مفعول ثانی اور کرم کا مفعول بہٖ فرمایا ہے۔ یہ ترجمے بھی ایک حد تک اشتباہ میں ڈالنے والے ہیں۔ سمپردان میں جو وسعت ہے وہ مفعول ثانی میں نہیں اور نہ مفعول بہٖ پوری طرح اس مفہوم کو ادا کرتا ہے جو accusative یا کرم کا ہے اس لئے اگر ترجمے کا مقصد یہ ہے کہ ان اصطلاحوں کا صحیح مفہوم سمجھ میں آجائے تو اس میں شک نہیں یہ ترجمے اس مقصد کو پورا نہیں کرتے اور پہلے ترجموں سے زیادہ غلط فہمی پھیلا سکتے ہیں۔ اس لئے کہ پہلے ترجموں میں تو اصطلاحوں کے لفظی اور لغوی معنی کا خیال رکھا گیا تھا اور اس کے لئے روجدید لفظ وضع کر لئے گئے تھے۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں اس کا امکان نہ تھا کہ خواہ مخواہ ان سے عربی صرف و نحو کے مفہوم مراد لئے جائیں۔ ڈاکٹر صاحب نے عربی گرامر کی مقررہ اصطلاحیں استعمال کی ہیں اس لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ ان کے وہی مفہوم مراد لئے جائیں جو عربی میں ہیں۔ اور ان تمام حدود و قیود کے ساتھ جو عربی زبان کے نحویوں اور لغویوں نے ان کے لئے مقرر کی ہیں۔

سمپردان یا dative کا ترجمہ مفعول ثانی حقیقت کے خلاف بھی ہے اور غیر جامع بھی۔ حقیقت کے خلاف اس لئے کہ جن افعال کے دو مفعول ہوتے ہیں۔ ان میں ایک فعل "دینا" بھی ہے۔ عربی میں اس کا مفعول ثانی وہ ہے جو ترتیب کے اعتبار سے دوسرے نمبر پر ہے اعطیتُ زیداً درھماً (میں نے زید کو درہم دیا) اعطیتُ کے دو مفعول ہیں۔ زید اور درہم۔ عربی نحویوں کی اصطلاح

میں درہم مفعول ثانی (دوسرا مفعول) ہے۔ اعطیتہ الکتاب (میں نے اسے کتاب دی) اس جملے میں "اسے" مفعول اول ہے اور کتاب مفعول ثانی۔ سنسکرت میں اس کے برعکس میا تسمے پستکم دتم (میں نے اسے کتاب دی) اس جملے میں جو عربی جملے کا لفظ بلفظ ترجمہ ہے اسے سمپر دان ہے (مفعول ثانی) اور کتاب مفعول اول۔ خود ڈاکٹر صاحب نے ایک مثال دی ہے۔ "میں نے اس کو (یا اسے) کتاب دی۔" اس میں انھوں نے "کتاب" کو مفعول اول (حالانکہ ترتیب میں وہ ثانی ہے) اور "اسے" کو مفعول ثانی بتایا ہے یہ سنسکرت اصطلاح کے مطابق اور عربی اصطلاح کے خلاف ہے لیکن اصطلاح عربی کی استعمال کی گئی ہے۔

یہ غیر جامع اس لئے ہے کہ سمپر دان سنسکرت میں مفعول ثانی کے ساتھ مفعول لہ کو بھی محیط ہے۔ سنسکرت میں ایسے استعمالات بھی ہیں جن میں مصدر سمپر دان کی علامت (ے) کا حامل ہے اور اس کا مفہوم بالکل وہی ہے جو عربی میں مفعول لہ یا مفعول لاجلہ کا ہے۔ وھٹنے نے ان صیغوں کو Infinitive dative کہا ہے اور بہت سی مثالیں دی ہیں[1]۔ ان میں ایک یہ بھی ہے۔ نا ئی تام تے دیوا اَدا، دُراَتَ توے (دیوتاؤں نے اُسے تجھے کھانے کے لئے نہیں دیا) اس میں "اَتَ توے" اور "تے" دونوں سمپر دان ہیں۔ اول مفعول لہ کے معنی دے رہا ہے اور دوسرا مفعول ثانی کے۔

دراصل سمپر دان یا Dative کا صحیح، مناسب اصلی ترجمہ مُعطیٰ ہے (یہ دونوں لفظ دا بمعنی دینا سے بنے ہیں) اور اس کے بہت سے استعمالات میں سے زیادہ عام استعمال مفعول لاجلہ ہے۔ اردو میں "کے لئے" اور "کے تئیں" وغیرہ کلمات اس کے قائم مقام ہیں۔ کہیں کہیں لاحقہ "کو" سے بھی کام لیا جاتا ہے۔ "اگر" کے لئے" کی رعایت سے کسی صاحب نے سمپر دان کا ترجمہ مفعول لہ کیا تو کیا

---

[1] سنسکرت گرامر پارہ ۹۸۲

بے جا کیا اور اگر ، کو ، کے لحاظ سے یہ غلط ہے تو " کے لئے " کے لحاظ سے مفعول ثانی کس لئے غلط اور بے محل نہیں ہو سکتا۔

کرم کا ترجمہ مفعول بہ ٹھیک نہیں۔ اس میں کرم کے بہت سے استعمالات نظر انداز ہو جاتے ہیں۔ اگرچہ مفعول بہ سے زیادہ اچھا اور قریب قریب کرم کے مفہوم کو ادا کرنے والا اردو میں کوئی دوسرا لفظ بھی نہیں Cognate accusative یا مفعول مطلق کا مفہوم بھی سنسکرت میں کرم ہی سے ادا کیا جاتا ہے۔ اس کی متعدد مثالیں قدیم سنسکرت ادبیات میں ملتی ہیں۔ اتھر وید میں ہے تپس تپیا مہے (ہم تپسیا کرتے ہیں [۱]) اس استعمال کے پیشِ نظر کرم کو مفعول مطلق بھی کہا جا سکتا ہے۔ کرم کے لغوی معنی مفعول کے ہیں اور سنسکرت کرم کے گوناگوں استعمالات میں سے قریب قریب ہر ایک میں اس کا لحاظ رکھا گیا ہے کہ وہ یا تو محض عمل ہو یا براہ راست عمل کا محل اثر۔ اس لئے بجا طور پر اسے سنسکرت (بلا قید یا مطلق) کہا جا سکتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ عربی میں مفعول مطلق کو ان دو استعمالوں میں سے ایک کے ساتھ خاص کر دیا گیا ہے۔ مفعول مطلق کو کم سے کم عربی میں اس لئے مطلق نہیں کہتے کہ " وہ مفعولیت کی قیدوں اور خصوصیتوں سے آزاد ہے۔ " بلکہ اس کی وجہ، جیسا کہ ابن ہشام انصاری اور ابن عقیل نے لکھا ہے۔ یہ ہے کہ وہ فیہ، بہ، معہ، لہ وغیرہ بڑھائے بغیر محض مفعول (کرم) بولا جاتا ہے [۲]۔ حقیقت میں مفعول دو ہیں۔ مطلق اور بہ۔ باقی ظروف ہیں یا علل۔ سنسکرت میں " مطلق " اور " بہ " دونوں کو کرم کہتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب مفعول فیہ کو بھی اردو میں " کپتا " نہیں مانتے۔ حالانکہ سنسکرت

---

[۱] سنسکرت گرامر پارہ ۲۷۵

[۲] بحوالہ عربی گرامر پاول ج ۱ ص ۱۴۰

گے بہت سے ظروف جیسے نیچے، آگے، پاس، اور ندی کے کنارے اور بعض اسما جن میں ظرفیت ہے جیسے گھر، مدرسہ، اسکول، صبح، شام وغیرہ۔ اردو میں حرف جر کی مدد کے بغیر استعمال ہوتے ہیں۔ جیسے وہ گھر گیا۔ وہ پیچھے آتا ہے یہ اسماء ترکیب میں مفعول فیہ ہیں۔

ایک مقام پر ڈاکٹر صاحب نے اعرابی حالتوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اردو اور ہندی میں دو حالتیں ہیں۔ قائم اور محرف۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے حالتوں سے آریائی زبانوں کی اصلی تالیفی Synthetical تصریف مراد لی ہے۔ جو اعرابی لاحقوں کی مدد سے ہوتی ہے۔ حروف معنوی کی وساطت سے اردو اور ہندوستان کی دوسری زبانوں میں آجکل بھی ان تمام اعرابی حالتوں کا اظہار کیا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر صاحب نے مرہٹی کی بابت یہ بھی لکھا ہے کہ اس میں آٹھوں حالتیں پائی جاتی ہیں۔ میرے لئے یہ بڑی اچنبھے کی بات ہے۔ مرہٹی میں بے شبہ تالیفی احوال کا استعمال دوسری ہندوستانی زبانوں کے مقابلے میں زیادہ ہے۔ لیکن یہ صحیح نہیں کہ سنسکرت کی طرح اس میں آٹھوں حالتیں ہیں۔ اور ان سب کے لئے اعرابی لاحقے ہیں۔ مرہٹی میں ان حالتوں کا باقی رہنا تو بڑی بات ہے پراکرت عہد ہی میں یہ کم ہوتے ہوتے صرف چار رہ گئی تھیں۔ آلی، مجردی، ظرفی اور اضافی۔ سب سے پہلے پالی اور اسکے بعد کی پراکرتوں میں ڈیٹو متروک ہوئی اس کے بعد فاعلی اور مفعولی کے درمیان کا امتیاز اٹھا۔ اب ہندوستان کی بولیوں میں دو حالتیں عام طور سے رائج ہیں۔ فاعلی اور غیر فاعلی۔ عام طور سے اس لئے کہ بعض اسماء اور ضمیروں میں دوسری حالتیں بھی ہیں جو مٹتے مٹتے بچی ہیں۔ مثلاً میرا، تیرا (اضافی) اور کنارے۔ سہارے (ظرفی) بعض عالموں کا خیال ہے کہ آنکھوں دیکھا۔ اور بھوکوں مرا میں آنکھوں اور بھوکوں

مجروری حالت میں ہیں۔ مرہٹی میں فاعلی اور غیر فاعلی کے علاوہ
بھی ہیں۔[1] اس کے ساتھ ہی مرہٹی میں سامانیہ روپ یا غیر فاعلی حالتیں
بھی بڑی پیچیدگی برتی جاتی ہے۔

آخر میں ایک ضروری چیز عرض کرنا ہے۔ اُردو میں مجھے، تجھے، اسے کی طرح ان کی جموع ہیں۔ تمھیں اور انھیں بھی رائج ہیں۔ یہ سب ضمیریں مفعولی ہیں۔ جو مجھ۔ تجھ۔ اُن اور ہیں سے مرکب ہوئی ہیں۔ ہیں پراکرت اور اپ بھرنش میں تھا۔ ان ضمیروں کے آخر میں ایک تاکیدی لاحقہ "ہی" بھی اضافہ کیا جاتا ہے جیسے مجھی ہم ہی اور انہی۔ اکثر لوگ انھیں اور انہی میں فرق نہیں کرتے۔ وہ انہی کی جگہ بھی انھیں لکھتے ہیں۔ مثلاً انھیں سے۔ انھیں کو اور انھیں پر۔ یہ صحیح نہیں اس کی جگہ انھی سے۔ انھی کو اور انہی پر ہونا چاہیئے اور زیادہ اچھا یہ ہے کہ ان، کو، ہی، سے جدا لکھا جائے۔ اس کی وجہ ظاہر ہے۔ انھیں مفعولی حالت ہے۔ اس پر حروف مغیرہ یعنی سے۔ پر وغیرہ داخل نہیں کیئے جا سکتے۔ اسکے علاوہ اردو میں، ان سے، اور، ان ہی سے، میں فرق ہے۔ ان ہی سے میں تاکید اور زور ہے، ان سے، میں نہیں۔ اگر ان ہی سے کی جگہ انھیں سے لکھا گیا اور، ہیں، کو صرف اعرابی لاحقہ قرار دیا گیا تو اس سے قطع نظر کہ یہ واقعہ کے خلاف ہے اس میں اور، ان سے، میں کوئی فرق نہ رہے گا۔

---

[1] تقابلی گرامر بیمز ج ۲ ص ۱۹۰ ولسن لیکچرز بھنڈارکر ص ۲۰۴

احوال اسم

اردو کی بدقسمتی ہے کہ اس کا دم بھرنے والے اس کی تاریخ سے بیخبر ہیں اور ان کو اپنی اس بے خبری کا احساس تک نہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اسکی زندگی ان کے سامنے آئینہ کی طرح ہے جس میں اس کا گزرا ہوا ہر دور نشو و ارتقا کی ہر منزل راہ سفر کا ہر نشان و اثر جلوہ گر ہے۔ اس بے خبری میں ان بزرگوں نے اسکے قامت پر جو لباس قطع کیا وہ ناموزوں تھا جس کی وجہ سے اس کی شکل وصورت، وضع قطع، رنگ و آہنگ کچھ سے کچھ ہو گئی۔ اور اس کی فطرت، مزاج اور سیرت کو اس کی صورت، ہیئت اور ظاہری وضع سے کوئی نسبت نہ رہی۔ اردو زبان کی ساری دقتیں اسی ناموزونیت کی وجہ سے ہیں۔

اُردو ہند آریائی خاندان سے ہے۔ اس کی تاریخ میں ایک تسلسل ہے۔ یوں تو اس تسلسل کا ایک سرا ۱۵۰۰ سال قبل مسیح کے تاریک زمانے میں ہے جب آریا قبائل ہند و پاکستان کی سرزمین میں داخل ہوئے۔ لیکن صحیح طور پر ۱۰۰۰ء مسیحی کے بعد اس زبان کے خط و خال ابھرنا شروع ہوئے۔ اُردو کی

تاریخ کا یہ تسلسل ہر شخص کے سامنے رہنا چاہیے۔ اس کے سامنے رکھنے سے زبان کو اچھی طرح پہچانا جاسکتا ہے۔ اس کی خوبو کا علم حاصل کیا جاسکتا ہے۔ اور اس کی ہر دقت کو اچھی طرح سمجھ کر اس کا صحیح اور مناسب حل پیش کیا جاسکتا ہے۔

اردو کی دقتوں میں ایک بڑی دقت اس کے اسماء الفاظ کی حالتیں ہیں۔ اردو زبان کی عام صرف ونحو کی کتابوں میں اردو اسما کی تین حالتیں بتائی گئی ہیں۔ فاعلی، مفعولی، اور اضافی۔ میں یہ نہیں کہتا کہ یہ غلط ہے لیکن یہ صحیح بھی نہیں۔ اردو میں ندائی، آلی، مجروری، ظرفی، مفعولی، ثانوی وغیرہ آٹھ حالتیں ہیں، اسم پر جب کوئی حرف معنوی داخل ہوتا ہے۔ اس کی حالت بدل جاتی ہے۔ مثلاً "میں"، "پر"، آجانے سے اسم ظرفی حالت میں ہوتا ہے "سے"، "تک"، آجانے سے مجروری حالت میں۔ اسی طرح "کا"، وغیرہ آجانے سے اضافی اور "کے لئے" آجانے سے مفعولی ثانوی حالت میں۔ زبان کو سمجھنے اور اس کی سرشت جاننے کے لئے ان احوال کا جاننا اتنا ضروری نہیں جتنا ان حروف یا عوامل کے اثرات کا جاننا اور یہ سمجھنا کہ سے، پر، کا، وغیرہ حروف آجانے سے لفظوں میں کیا کیا تبدیلیاں ہوتی ہیں۔

اردو گرامر یا تو عربی صرف ونحو کی تقلید میں اسی کے نہج پر لکھی گئی یا انگریزی گرامر کی پیروی میں بالکل انگریزی انداز پر۔ حالانکہ جیسا میں نے عرض کیا، اردو ہند آریائی زبان ہے۔ اس کا رشتہ سنسکرت، پراکرت، اور اپ بھرنش سے ہے۔ اس کا مزاج وہی ہے جو ان زبانوں کا ہے۔ اس کی ساخت اور سرشت ہند و پاکستان کی ان زبانوں کی سی ہے۔ اردو کی صحیح گرامر وہی ہوسکتی تھی جس میں اردو کے مزاج اور اس کے اس رشتہ کا خیال رکھا جاتا اور جو ہند و پاکستان کی قدیم وجدید زبان کے اصول و انداز اور مزاج و منہاج پر لکھی گئی ہوتی۔ ڈاکٹر عبدالستار صاحب

صدیقی نے عرصہ ہوا "احوال اسم" کے عنوان سے ایک مفصل اور جامع مقالہ لکھا تھا جو رسالہ اردو اکتوبر ۱۹۲۳ء میں شائع ہوا۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے اس مقالے میں اردو اسما کی دو حالتیں بتائی ہیں قائم اور محرف۔ اور اس کے بعد تفصیل کے ساتھ ان اسما کا ذکر کیا ہے جو محرف حالت میں بدل جاتے ہیں یا اپنی حالت پر قائم رہتے ہیں۔ یہ مقالہ اتنا جامع اور مکمل ہے کہ میں اس پر کوئی اضافہ نہیں کرسکتا۔ جو صاحب یہ جاننا چاہتے ہیں کہ اردو اسما کتنے قسم کے ہیں اور ان دو حالتوں میں بصورت مفرد یا جمع ان میں کیا کیا تبدیلیاں ہوتی ہیں، اس مقالے کی طرف رجوع فرمائیں۔ میں اس فرصت میں اردو اسما کی حالت محرف کی تاریخ دینا چاہتا ہوں اور یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اردو میں جو اسما بظاہر قاعدے میں نہیں آتے ان میں بے قاعدگی کے اسباب کیا ہیں۔

جیسا ڈاکٹر صاحب نے لکھا ہے اردو میں اسما (نیز صفات) کی دو حالتیں ہیں ایک قائم یا فاعلی۔ دوسرے محرف یا غیر فاعلی۔ قائم یا فاعلی حالت وہ ہے جب اسم کے بعد کوئی حرف معنوی[1] (نے، سے، کے، کو، کا، میں، پر، تک) نہ ہو۔ اسے قائم اس لئے کہتے ہیں کہ اس حالت میں اسم اپنی اصلی صورت پر قائم رہتا ہے اس میں کوئی لفظی یا صوتی تبدیلی نہیں ہوتی، جیسے بکرا خریدا گیا، بکرے خریدے گئے۔ بکرا مفرد ہے اور بکرے جمع۔ یہ اسما جملے میں استعمال ہونے سے پہلے جس صورت میں تھے۔ جملے میں آنے کے بعد بھی ان کی وہی صورت رہی۔ محرف حالت وہ ہے جب ان اسما کے بعد اوپر کے حروف معنوی میں سے کوئی ایک یا ایک سے زیادہ حرف آئے۔ اس وقت ان میں سے بعض کی صورت بدل جاتی ہے

[1] یہ حروف معنوی اس لئے کہے جاتے ہیں کہ یہ کلمے سے الگ بھی ہیں اور بامعنی بھی۔ اس لحاظ سے ان کو "صلات" کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔

اس لئے ہم اسمار کی اس حالت کو محرف کہتے ہیں۔ وہی اوپر والی مثال لیجئے۔ بکرے نے سینگ مارا۔ بکروں نے سینگ مارے۔ "نے" کی جگہ حروف معنوی میں سے جو حرف چاہیں رکھ لیں۔ بکرے سے۔ بکروں سے۔ بکرے پر۔ بکروں پر۔ بکرے کو۔ بکروں کو وغیرہ۔ ہر صورت میں یہ اسم اپنی پہلی حالت سے مختلف اور اس سے بدلا ہوا ملے گا۔ پہلی حالت میں بصورت افراد "بکرا" تھا۔ اب "بکرے" ہے۔ بصورت جمع پہلے "بکرے" تھا اب بکروں ہے۔ اسم مفرد میں یہ تبدیلی ہر جگہ نہیں ہوتی۔ صرف ان مذکر اسما میں ہوتی ہے جن کے آخر میں الف یا اس کے ہم آواز کوئی حرف ہ، ح، ع (ماقبل مفتوح[1]) مثلاً گھوڑا، گھوڑے نے۔ بندہ، بندے نے۔ دعویٰ، دعوے سے۔ قدح، قدح سے۔ ضلع، ضلع میں وغیرہ (صفحہ، مصرعہ اور قلعہ محرف حالت میں صفحے، مصرعے اور قلعے باضافہ "ے" لکھے جاتے ہیں۔ اس لئے کہ ان کے آخر میں "ہ" ہے) جمع میں ہر جگہ اسم بدل جاتا ہے۔ چاہے وہ کسی قسم کا ہو۔ مذکر ہو یا مؤنث۔ صحیح الآخر ہو یا معلول الآخر۔ جیسے (بہت سے) بیل (قائم) بیلوں سے (محرف) بہت سے دریا (قائم) دریاؤں سے (محرف) ناکیں، ناکوں سے۔ بکریاں (یا بکریں) بکریوں سے، ڈبیاں یا (ڈبئیں) ڈبیوں سے۔ وغیرہ۔

پہلی حالت کو میں نے فاعلی کہا۔ اور دوسری کو غیر فاعلی۔ یہ کوئی جدت نہیں، عام ماہرین لسانیات پہلی حالت کا نام (Nominative) بتاتے ہیں۔

---

[1] عربی کے ساکن الاوسط الفاظ اکثر اردو میں متحرک کر لئے گئے ہیں۔ اردو والے نَفْعْ کو نَفَعْ بولتے ہیں اور صُبْح کو صُبَح۔ جن کے آخر میں ح یا ع ہے محرف حالت میں ان کی ماقبل حرکت زیر سے بدل جاتی ہے۔ قائم حالت میں بصورت جمع ان کے آخر میں ے ہوتی ہے۔ جیسے قدحے، ضلعے وغیرہ۔

اس کے مقابلے میں دوسری حالت کو غیر فاعلی کہنا چاہیئے۔ اس پر یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ اُردو میں ’’نے‘‘ فاعل کی علامت ہے۔ وہ اسم غیر فاعلی حالت میں کیسے ہو گا جس کے آخر میں ’’نے‘‘ ہے۔ مثلاً گھوڑے نے لات ماری۔ اس مثال میں گھوڑا فاعل ہے اس لئے کہ وہ لات مارنے والا ہے۔ یہ شبہ بے بنیاد ہے اس لئے کہ ’’نے‘‘ علامت فاعل نہیں علامت آلہ ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اسے اوزاری کہا ہے۔ اوپر کی مثال میں گھوڑا (Agent) (نائب فاعل[1]) ہے ’’ماری‘‘ معنوی طور پر مجہول ہے۔ اسکی تفصیل کا موقع نہیں۔ آئندہ کسی فرصت میں اس پر بحث کروں گا۔

اس سلسلے میں دو باتیں جاننے کے قابل ہیں۔ اول یہ کہ آخر اس کی کیا وجہ ہے کہ محرف حالت میں صرف وہ مذکر اسما وصفات بدلتے ہیں جن کے آخر میں الف یا اس کے ہم آواز کوئی حرف ہے۔ دوسرے اسما کیوں نہیں بدلتے۔ دوسرے الف وغیرہ حروف پر ختم ہونے والے تمام اسما نہیں بدلتے۔ مثلاً راجا۔ دادا۔ مصطفےٰ۔ مذکر بھی ہیں اور الف پر منتہی بھی۔ لیکن اس کے باوجود محرف حالت میں جوں کے توں رہے راجا کا راجے۔ دادا کا دادے۔ مصطفےٰ کا مصطفے نہیں ہوا۔ راجا نے ہاتھی خریدا۔ دادا کو سلام کرو۔ مصطفےٰ کا احترام فرض ہے۔ شہر کے ناموں میں سے مکہ، مدینہ، کوفہ، بصرہ، کلکتہ، ڈھاکہ محرف حالت میں۔ مکے، مدینے، کوفے بصرے، کلکتے، ڈھاکے ہو گئے۔ ذوق کا شعر ہے۔

مؤذن مرحبا بر وقت بولا ۔۔۔ تری آواز مکے اور مدینے[2]

غالب کہتا ہے

کلکتے کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں ۔۔۔ اک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے

---

[1] یہاں نائب فاعل سے مراد مفعول مالم یسم فاعلہ نہیں۔ یہ ایک جدید اصطلاح ہے۔

[2] یہ دونوں اسم ظرفی حالت میں ہیں۔ ’’میں‘‘ مقدر ہے۔

قاہرہ، قسطنطنیہ، متھرا، بلیا شہروں کے نام ہیں لیکن وہ نہیں بدلے۔ موتیا موگرا، بیلا، چمپا مختلف قسم کے پھول ہیں۔ ان میں سے پہلے تین غیر فاعلی (محرف) حالت میں موتیے، موگرے، بیلے ہوئے۔ چمپا بدستور چمپا رہا۔ مثلاً چمپا کے پھول۔ بیلے کی کلیاں۔ آخر یہ ناہمواری اور شتر گربگی کیوں؟

اس سوال کے جواب دینے سے پہلے ضروری ہے کہ اردو اسما کی فاعلی حالت کی تاریخ پر ایک نظر ڈال لی جائے اور یہ دیکھ لیا جائے کہ یہ کیا ہیں اور کہاں سے آئے۔ ہند آریائی قدیم بول چال کے زبان اور ویدک سنسکرت میں اسما کی آٹھ حالتیں تھیں۔ ان میں سے فاعلی حالت میں مفتوح الآخر (اکارانت) اسما کا اعراب (س) ہوا کرتا تھا۔ قدیم فارسی یا درمیانی عہد کی زبان میں بھی یہ (س) تھا۔ جس کا (ہ) تلفظ کیا جاتا تھا۔ جیسے رامہ گچھتِ (رام جاتا ہے) گردش لیل و نہار کے ساتھ اس اعراب میں تبدیلی رونما ہوئی اور پراکرت دور تک پہنچتے پہنچتے اس نے دو روپ اختیار کر لئے۔ ایک (ـُ و) دوسرے (ـِ ے) پالی کے بعد کی پراکرتوں میں اس اعراب کی یہ دونوں صورتیں ملتی ہیں۔ گرنار اور شاہباز گڈھی کے کتبوں میں مفتوح الآخر مذکر اسماء ـُ و پر ختم ہوئے ہیں اور دوسرے مقامات کے پراکرت کتبوں میں ـِ ے پر۔ ادبی پراکرتوں میں سے ماگدھی میں ان اسما کی فاعلی علامت ـِ ے، ہے اور شورسینی میں ـُ و، جو اپ بھرنش میں تخفیف پاکر ـُ، ہوئی۔ موجودہ بولیوں میں سے سندھی میں آج بھی ـُ، موجود ہے جیسے ہتھُ (سندھی) ہاتھ (ہندی)

ہیم چندر نے اَپ بھرنش عہد کے ایک اور فاعلی اعراب ـِ ا کا ذکر کیا ہے۔ اور اس کے ثبوت میں ایک شعر بھی پیش کیا ہے۔ شیام سندر داس کا بیان ہے کہ یہ کسی پے شاجی اپ بھرنش میں تھا۔ اس (ـِ ا) کی بابت عام خیال یہ ہے

کہ یہ (ـُ و) ہی کا ایک روپ ہے جو زمانے کے اعتبار سے کسی قدر بعد میں وجود میں آیا۔ لیکن صحیح بات یہ ہے کہ یہ اعراب براہ راست سنسکرت (ـُ ہ) سے لیا گیا ہے اور اس کا قائم مقام ہے۔ ہیورنلے نے اُردو کے ان مذکر اسمار کے الف کی یہ توجیہہ کی ہے کہ پراکرت عہد میں ان اسما کے آخر میں ایک الحاقی "ک" ہوا کرتا تھا جس طرح پہلوی میں ہے۔ جیسے نامک (فارسی نامہ)۔ نیزک (فارسی نیزہ) یہ "ک" حذف ہوا تو اس کی حرکت ماقبل حرکت سے مل کر دراز ہو گئی اور اس نے الف کی شکل اختیار کر لی۔ جان بیمز کی رائے میں اُردو کے یہ تمام اسمار مفتوح الآخر اسما کی حرکت یعنی "فتحہ" کو کھینچ کر پڑھنے سے حاصل ہوئے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ اُردو میں مذکر اسما ایسے بھی ہیں جن کے آخر میں الف نہیں۔ جیسے ہونٹ۔ کان۔ تیل یہ سنسکرت اوشٹھ۔ کرنڑہ اور تیلہ سے ماخوذ ہیں جو سنسکرت میں مذکر بھی ہیں اور مفتوح الآخر بھی۔ اگر اردو کا الف پراکرت الحاقی "ک" کا بدل ہے، تو وہ "ک" ان اسما میں بھی ہونا چاہیئے۔

بہر حال جو صورت بھی ہو اُردو مذکر اسما کا آخری الف سنسکرت لاحقہ فاعل کا قائم مقام ہے چاہے ہیورنلے کی ہمنوائی میں اس کو الحاقی "ک" کا بدل کہیئے۔ چاہے بیمز کے ہم خیال ہو کر سنسکرت الفاظ کو کھینچنے اور اس پر زور دینے کا نتیجہ بتائیے۔ لیکن یہ نہ بھولیے کہ یہ ان اسما کا ذکر ہے جو سنسکرت سے لیے گئے۔ یہ پراکرت کی راہ سے اُردو میں آئے اور آتے آتے انھوں نے اپنا چولا بدل لیا۔ اس قسم کے اسمار کو اصطلاح میں تدبھو کہتے ہیں۔ اردو کے تدبھو مذکر اسما کی دو قسمیں ہیں۔

(۱) جن کے آخر میں الف ہے۔ جیسے گھوڑا۔ کیلا۔ بکرا وغیرہ۔

(۲) جن کے آخر میں الف کے علاوہ کوئی دوسرا حرف علت یا حرف صحیح ہے

جیسے گانو۔ سانپ۔ کان وغیرہ۔

پہلی قسم کے تمام اسما فاعلی علامت کے حامل ہیں ان کا آخری الف سنسکرت لاحقہ فاعلی کا بدل اور اس کا قائم مقام ہے۔ اس قسم کے اسما جب گردانے جاتے ہیں تو ان کا آخری الف فاعلی حالت (قائم) میں قائم رہتا ہے۔ غیر فاعلی حالت (محرف) میں ،ے، سے بدل جاتا ہے۔ دوسرے قسم کے اسما میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ یہ اسما اعراب کی ظاہری علامت سے خالی تھے اس لئے ان کو گردانتے وقت اس کی ضرورت نہیں کہ ان میں کوئی تصرف کیا جائے، ان کے آخر میں حرف معنوی بڑھا کر مختلف معنی حاصل کر لئے جاتے ہیں۔

اس تفصیل سے ظاہر ہوا کہ محرف حالت میں صرف وہ مفرد اسما بدلتے ہیں۔

(۱) جو براہ راست سنسکرت اسما سے کسی قدر تغیر کے بعد اردو میں آئے اور جن کا الف سنسکرت علامت فاعل ـُ، ہ، کا قائم مقام ہے۔

(۲) جو ہندی الاصل یا دیسی ہیں۔

(۳) جو مذکر ہیں۔

پہلی اور دوسری شرط کے رو سے وہ تمام اسما اس فہرست سے نکل گئے جو خالص سنسکرت کے ہیں یا جن کا الف اصلی ہے۔ جیسے

راجا، پرجا، پوجا، پتا (باپ)۔ نندا۔ پرارتھنا۔ چمپا۔ یاترا۔ راناہ دادا نانا۔ چچا۔ متھرا۔ گیا (شہر کا نام) نربدا۔ رمنا۔ گھاگھرا۔ ہمالیا۔ بلیا۔ کالکا۔

تیسری شرط کی رو سے وہ اسما خارج ہوئے جن کا الف تانیث کا ہو[۱] جیسے

ابلا (عورت) رمبھا۔ سبھدرا۔ سبھا۔ جمنا۔ گنگا۔

اردو کے وہ اسما بھی نکل گئے جن کے آخر میں ،یا، ،ر یا، تصغیر کا ہے۔ یہ

۱؎ پہلی قسم کے بہت سے الفاظ دوسری قسم میں شامل ہیں۔

اردو میں مونث ہیں۔ جیسے۔

لٹیا۔ کتیا۔ بچھیا۔ کٹیا۔ بگیا۔ چڑیا۔ چوھیا۔ ڈبیا۔ دکھیا۔ ٹھلیا۔ بڑھیا۔ چھالیا۔

یہاں یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ الف اردو میں مذکر کی علامت ہے۔ ٹھیٹ اردو الفاظ جن کے آخر میں الف ہے مذکر ہیں۔ یہ بھی محرف حالت میں نہیں بدلتے۔ اس لئے کہ ان کا الف علامت تذکیر ہونے کی وجہ سے بمنزلہ الف اصلی ہے۔ ملاحظہ ہو۔

چھدا۔ چھیدا۔ چھنگا۔ گھسیٹا۔ بٹیرا۔ تسفیعا۔ میتا۔

یہ اصول سنسکرت (تدبھو اور تت سم) اور ٹھیٹ ہندی الاصل یعنی دیسی الفاظ سے متعلق تھے۔ دوسری زبان کے لفظوں کو بھی انہی پر قیاس کر لیا گیا۔ مثلاً عربی اور فارسی کے الفاظ جو اردو میں مونث ہیں۔ تیسری شرط نہ پائے جانے کی وجہ سے اس قاعدے سے خارج ہیں۔ وہ قائم اور محرف حالت میں ایک ہی طرح بولے جاتے ہیں۔ عربی کے مونث اسمار جیسے :۔

فاطمہ۔ سارا طاہرہ۔ صغرے۔ سلمیٰ۔ زہرا۔ نعیمہ۔ لیلیٰ وغیرہ۔

عربی و فارسی اسمار جو اردو میں مونث ہیں۔ جیسے :۔

زچہ[1]۔ بیوہ۔ ہوا۔ دوا۔ دایہ۔ سزا۔ جمع[2]۔ حیا۔

عربی مصادر جو اُردو میں مونث استعمال ہوتے ہیں۔ ان میں شامل ہیں جیسے وفا۔ جفا۔ ادا۔ بقا۔ شفا۔ ضیا۔ رضا۔ ابتدا۔ انتہا۔ اشتہا۔ تمنا۔ التجا۔

لیکن میرا خیال ہے کہ عربی کے وہ اسماد مصادر جن کے آخر میں الف ممدودہ ہے

---

[1] بچہ مذکر ہے اس لئے محرف حالت میں بچے ہو جاتا ہے۔

[2] ضلع مذکر ہے اور جمع مونث۔

اس لئے نہیں گردانے جاتے کہ ان کا الف بمنزلہ اصل کلمے کے ہے۔ مثلاً

اجزاء۔ اخفار۔ افتراء۔ اقتدار۔ استغنار۔ استہزار۔ ایمار۔ افشار۔

الحمرار۔ الزہرار۔ صحرار۔ بطحار۔ صنعار۔ سینار۔ عنقار۔ ارتقار[1]

عربی فارسی یا کسی دوسری زبان کے الفاظ بھی جن کے آخر میں الف یا ہ، اصلی ہے گردانے نہیں جاتے۔ جیسے۔

رسوا۔ دانا۔ ببنا۔ آغا۔ آقا۔ دریا۔ بخارا۔ امریکا۔ ایشیا۔ آسٹریلیا۔

رومانیا۔ بلغاریا۔ افریقا۔ خواجہ۔ مرزا۔ مولانا بینا۔ ہما۔ سہا۔ موسیٰ عیسیٰ۔

مسیحا۔ مصطفےٰ۔ مرتضیٰ۔ ملا۔ منشا۔ زنا[2]

لیکن بعض دوسری زبانوں کے الفاظ جو اردو میں رچ بچ کر ٹھیٹ اردو ہوگئے ہیں۔ تدبھو الفاظ پر قیاس کرکے آج انھیں محرف حالت میں بدل لیا جاتا ہے۔ اب سے پہلے قاعدے کے مطابق وہ غیر منصرف تھے۔ ان میں سے ایک لفظ تقاضا ہے۔ غالب نے محرف حالت میں تقاضا ہی باندھا تھا۔

دل اس کو پہلے ہی ناز و ادا سے دے بیٹھے
ہمیں دماغ کہاں حسن کے تقاضا کا

آج کے محاورے میں "تقاضے کا" ہونا چاہئے۔ تقویٰ کا حال بھی یہی ہے۔ آج کل یہ منصرف ہے۔

ان تمام اسما کی جن کا 'الف' یا 'ہ' اصلی ہے یا علامت تانیث، جب

---

[1] اردو میں ان اسمار و مصادر کے آخر میں ہمزہ نہیں لکھتے۔

[2] عربی جمع مکسر کے صیغے جن کے آخر میں الف (ممدودہ یا مقصورہ) یا 'ہ' ہے اس فہرست میں شامل کئے جا سکتے ہیں۔ اس لئے کہ ان کے آخر کا الف اور 'ہ' بمنزلہ اصل کلمے کے ہے۔ جیسے۔ انبیار۔ اولیار۔ علمار۔ طلبہ۔ مرضیٰ (مریض کی جمع)

محرف حالت میں جمع بنائی جاتی ہے تو ان کا آخری الف، یا ہ، علی حالہ قائم رہتا ہے اور اس پر "ؤں" بڑھا دیا جاتا ہے۔ یہ بھی اس بات کی دلیل ہے کہ ان کا آخری حرف اصلی ہے جس کا باقی رہنا ضروری تھا۔ اگر وہ فاعلی حالت کی علامت ہوتا تو غیر فاعلی حالت میں بدل جاتا یا جمع میں حذف ہو جاتا جیسے دریاؤں۔ مولاناؤں۔ مرزاؤں۔ آریاؤں[1] آقاؤں۔ چچاؤں۔ مختصر طور پر یوں سمجھئے۔

(۱) سنسکرت تدبھو الفاظ جو مذکر ہیں اور جن کے آخر میں الف ہے محرف حالت میں بدل جاتے ہیں۔

(۲) عربی، فارسی اور سنسکرت کے الفاظ جو الف۔ ہ یا ع پر ختم ہوتے ہیں لیکن مونث ہیں اپنی حالت پر قائم رہتے ہیں۔

(۳) ان زبانوں کے الف یا ہ پر ختم ہونے والے مذکر الفاظ میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی اگر یہ ثابت ہو جائے کہ ان کا الف یا ہ جزو کلمہ یا بمنزلہ جزو کلمہ ہے

(۴) لیکن ان میں سے جو کلمات اردو میں گھل مل گئے ہیں اور اردو بن گئے ہیں ان کو پہلی قسم کے کلمات پر قیاس کر کے محرف حالت میں بدل لیا جاتا ہے۔

(۵) جو الفاظ فارسی یا عربی ترکیب میں استعمال ہوئے ہیں وہ کوئی تغیر قبول نہیں کرتے[2] بت خانہ۔ صنم کدہ اور دارالمطالعہ اردو میں زیادہ مستعمل ہیں اس لئے اردو ہو گئے ہیں۔

---

[1] بعض لوگ آریوں جمع بناتے ہیں۔

[2] جیسے جوہر آئینہ۔ حسن تقاضا۔ تیزی اندیشہ۔ دل دریدہ۔ امیر قافلہ۔

اُردو زبان کا ایک صوتی رجحان

جب تک کسی زبان کی فطرت اور اس کے صرفی اور صوتی رجحانات کا ٹھیک ٹھیک علم نہ ہو اس زبان کے رشتے معلوم کرنا اور اس کے اصل و نسب کا سراغ لگانا قریب قریب ناممکن ہے۔ اس فرصت میں مجھے اُردو کے رشتے اور اس کے گھرانے سے بحث نہیں بلکہ اس کے ایک اہم صوتی رجحان کا پتا لگانا ہے اور اس کی ہمسر بولیوں نیز قدیم تر زبانوں کے سرمایہ کی چھان بین کے بعد یہ فیصلہ کرنا ہے کہ اُردو میں یہ رجحان کہاں سے آیا۔ کیا اس سے اُردو کے ماخذ پر کوئی روشنی پڑتی ہے؟ کیا اس سے اُردو کی اصل اور اس کے ماخذ کا کھوج لگایا جا سکتا ہے؟

سنسکرت میں مخلوط حروف بھی ہیں جنھیں "سنیکت ورن" کہتے ہیں۔ عربی کے مشدد حروف کی طرح یہ ملا کر بولے جاتے ہیں۔ بھکت۔ کرم اور مشٹ میں بترتیب ک۔ت، ر۔م، س۔ٹ مخلوط ہیں جن کا تلفظ ملا کر کیا گیا ہے۔ دو حروف صحیح کا مخلوط یا متحد تلفظ کسی قدر دشوار ہے اس لئے سنسکرت عہد کے بعد جب درمیانی زمانے کی پراکرتوں کا دور آیا اور زبان کو آسان بنانے کا رجحان

بولنے والوں میں پیدا ہوا تو یہ مخلوط حروف اس طرح سہل بنا دیئے گئے کہ جب ت
کلمے کے وسط یا آخر میں آئے تو ایک کو دوسرے سے بدل دیا گیا اور پھر دونوں کا
ادغام کر دیا گیا۔ مثلاً اوپر کی مثالوں میں ک کو ت سے بدل کر ت میں ادغام کیا۔
تو "بہت" ہوا۔ ر کو م بنا کر م میں جوڑا گیا تو "کم" بنا۔ اس طرح ش کو
ٹ بنا کر جب دونوں کو مدغم کیا گیا تو "مٹھ" ہوا۔ پراکرت میں مشدد کلمات کی
کثرت اسی لئے ہے۔ یہ سب سنسکرت دور کی قدیم زبان کے مخلوط حروف کی یادگار
ہیں جنھیں سنسکرت کلمات سے ڈھالا گیا ہے۔

جدید آریائی زبانوں میں سے صرف پنجابی نے پراکرت کے مشدد کلمات کو
باقی رکھا ہے۔ اردو میں یہ مخفف ہیں۔ ذیل میں چند مثالیں دی جا رہی ہیں:-

سنسکرت	پراکرت	پنجابی	اردو
سَتیہ	سچّ	سچّ	سچ
سَروِ	سبّ	سبّ	سب
کُلیہ	کلّ	کلّ	کل
نَستُ	نتھ	نتھ	نتھ
چکر	چکّ	چکّ	چاک
اَکشِ	اکھ	اکھّ	آنکھ
اَگر	اگّ	آگے	آگے
اَگنِ	آگّ	اگّ	آگ

پراکرت مشدد کلمات کے بالمقابل اردو میں دو طرح کے کلمے ہیں۔ کچھ مخفف
ہیں اور کچھ سہل۔[1] مخفف وہ ہیں جن میں مشدد حرفوں میں سے ایک گر گیا ہے اور

---

[1] دو قسم کے تخفیفی رجحانوں میں فرق کرنے کے لئے میں نے مخفف اور سہل دو لفظ خاص معنی
میں استعمال کئے ہیں۔ انھیں جدید اصطلاح سمجھئے۔

ماقبل حرکت متصور ہے۔ جیسے کلّ اور بیچّ۔ مسہل وہ ہیں جو خود مخفف ہیں لیکن ان کے ماقبل حرکت ممدود (دراز) ہے جیسے بادل اور پیچھے۔ ان میں 'دال' اور 'چھ' مخفف ہیں اور ان کے ماقبل 'آ'، اور 'ی'، ہیں الف فتحہ کی ممدود شکل ہے اور 'ی' کسرے کی۔ اس سے اردو کے ایک صوتی رجحان کا پتہ چلتا ہے۔ پراکرت میں جو حروف مشدد تھے اُردو میں وہ مخفف ہیں۔ اردو کا یہ رجحان زبان کو آسان بنانے کی طرف دوسرا قدم ہے۔ پہلا قدم خود پراکرت کا تشدیدی رجحان سمجھیے۔ سنسکرت کے مخلوط حروف کا تلفظ زبان پر گراں تھا۔ یہ مخلوط حروف متحد التلفظ تھے۔ لیکن متحد المخرج نہ تھے۔ زبان ان کو ادا کرتے وقت براتی تھی۔ اور ایک مخرج سے دوسرے مخرج کی طرف تیزی کے ساتھ جانے میں لڑکھڑا جاتی تھی۔ مثلاً بھکت میں 'ک'، اور 'ت'، مخلوط التلفظ ہیں۔ ان کو ایک ساتھ یعنی ملا کر ادا کرنا پڑتا ہے 'ک'، حلقی ہے اور 'ت'، اسنانی (دندانی) تلفظ کے وقت سانس پہلی منزل میں ہوتا ہے اور زبان آگے پہنچ جاتی ہے۔ یہ عمل بقول ڈاکٹر بھنڈارکر بہت مشکل ہے[له] پراکرت دور میں مخلوط حروف کو ہم جنس بنا کر یہ مشکل کسی قدر آسان بنائی گئی۔ لیکن اس کا حل نہ ہوا۔ مخلوط التلفظ حروف کا ادا کرنا آسان نہ تھا۔ اس میں آلۂ صوت پر سخت دباؤ پڑتا تھا اور سہولت پسند انسان اس میں بڑی دقت محسوس کرتا تھا۔ اُردو نے مشدد حروف کے ماقبل حرکت کا اشباع کیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سانس جو پہلے محبوس سا تھا اور آلۂ صوت کو آگے بڑھنے سے روکتا تھا آزاد ہو گیا اور زبان کا منھ کے کسی حصہ سے بار بار ٹکرانا اتنا مشکل نہ رہا۔ اس کے بعد مشدد حرف کا تلفظ خفیف ہوتے ہوتے اتنا ضعیف ہو گیا کہ اس کا احساس مٹ گیا۔ اُردو کے عمل تسہیل کو اس حساب سے دو دوروں سے

له فلالوجکل لیکچرز صـ ۳۴۔

گزرنا پڑا۔ پہلے دور میں مشدد کی ماقبل حرکت ممدود ہوئی مشدد اپنی جگہ رہا۔
دوسرے دور میں تشدید غائب ہوئی صرف حرکت ممدود باقی رہی۔

مخفف اور مسہل کے ساتھ ساتھ اردو میں مشدد کلمات بھی ہیں اور انکی
خاصی اچھی تعداد ہے۔ ان میں سے چند یہ ہیں۔

مٹّی۔ کتّا۔ رکھّا۔ ہڈّی۔ سچّا۔ اچھّا۔ پٹّی۔ مکھّی۔ کچّا۔ بلّی۔ چکّی
مسّا۔ کلّو۔ مچھّر۔ پتّھر۔ مکھّن۔ رتّی وغیرہ۔

اردو کے حسب ذیل تین رجحان سمجھئے۔

(۱) پراکرت مشدد حروف کی تسہیل یعنی مشدد کا ایک حرف گرا کر ماقبل
حرکت کا اشباع۔ جیسے اگّ سے آگ۔

(۲) تخفیف محض یعنی حرف مشدد کا ایک حرف گرانا۔ جیسے کلّ سے کل۔

(۳) اور تشدید جیسے مٹّ سے مٹّی۔

اردو کی ہمسر بولیوں میں سے پنجابی کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ پنجابی میں نہ تخفیف
ہے نہ تسہیل، برج میں صرف تسہیل ہے۔ پراکرت کے جو کلمے پنجابی میں مشدد
ہیں برج میں وہ مسہل ہیں۔ یعنی ان میں صرف ایک حرف ہے جس کے ماقبل
حرکت کھنچی ہوئی ہے۔ اس لحاظ سے پنجابی اور برج میں بعد ہے وہ دو انتہائی
نقطوں پر واقع ہیں۔ اردو بین بین ہے۔ برج کی اس میں تسہیل بھی ہے اور
پنجابی کی تشدید بھی۔ ذیل کے کلمات میں اردو کا برج سے مقابلہ کرکے دیکھئے

اردو	برج
چکھے	چاکھے
رکھے	راکھے
مٹّی	ماٹی

مکھن	ماکھن
ہڈی	ہاڈ
چکی	چاکی

اس کے علاوہ اُردو اس لحاظ سے بھی بین ہے کہ تشدید اور تسہیل کے درمیان کا درجہ تخفیف ہے۔ اردو میں تخفیف ہے۔ ملاحظہ فرمائیں۔

اردو	پنجابی	برج
کل	کلّ	کال
سب	سبّ	ساب
سچ	سچّ	سانچ
نتھ	نتھ	ناتھ

اردو کے مذکورہ بالا تین رجحانوں میں سے تسہیل بہت عام ہے۔ میں فی الحال اسی سے بحث کرنا چاہتا ہوں۔ ضمناً دوسرے دو رجحانوں کا ذکر بھی کروں گا۔ سوال یہ ہے کہ اردو میں یہ رجحان کہاں سے آیا۔ کیا یہ اُردو کی اپنی فطرت ہے جو اسے اپنے خاندان سے ترکے میں ملی یا کسب کردہ خصوصیت ہے جسے پڑوس کی زبانوں سے اس نے سیکھا۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے سب سے پہلے پروفیسر محمود شیرانی مرحوم نے اُردو کے اس رجحان پر بحث کرتے ہوئے لکھا کہ اُردو پنجابی نژاد ہے۔ اول اول اس میں تشدیدی رجحان پایا جاتا تھا۔ لیکن جب یہ لاہور سے دہلی گئی تو برج نے جو اس وقت دہلی اور اس کے نواح میں بولی جاتی تھی اس کو متاثر کرنا شروع کیا اور آہستہ آہستہ اس کے مزاج میں اتنا دخل پا لیا کہ اردو برج کی طرح مشدد الفاظ کو مسہل کرنے لگی پروفیسر شیرانی نے اپنے اس قیاس کی تائید میں جو دلائل پیش کئے ہیں ان کا خلاصہ انہی کے

لفظوں میں یہ ہے :-

(۱) آٹھویں اور نویں صدی ہجری کی کتب تاریخ و لغت سے ثابت ہوتا ہے کہ اہل ہندستان پنجابی لہجے کے مطابق لاکھ۔ کھانڈ۔ بھانڈ۔ آم وغیرہ الفاظ کو بہ تخفیف لک۔ کھنڈ۔ بھنڈ۔ انب کہتے تھے اور گاڑی کا تلفظ بہ تشدید گڈی کرتے تھے۔ (مقدمہ صفحہ ۵)

(۲) اردو اس بارے میں مقلد محض ہے۔ کبھی برج کی تقلید کرتی ہے اور کبھی پنجابی کی اور کبھی دونوں کی لیکن زیادہ تر اس کا میلان پنجابی کی طرف ہے۔ چنانچہ برج کے کلمات ماکھی، ماچھر۔ پاتھر وغیرہ اردو میں مشدد یعنی مکھی، مچھر، پتھر بولے جاتے ہیں (صفحہ ۱۲۰)

ڈاکٹر چٹرجی لسانیات کے ماہر ہیں۔ انھوں نے برعظیم پاک و ہند کی جدید آریائی زبانوں کا بڑا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ وہ اگرچہ پنجابی کو اردو کا ماخذ نہیں مانتے لیکن اردو میں جو الفاظ مخفف یا مشدد ہیں انھیں پنجابی کا اثر بتاتے ہیں ان کے خیال میں تخفیف محض اور تشدید ہندستانی زبان کی روح یا اسکے مزاج کے خلاف ہیں۔ اردو سچ۔ کل۔ نتھ۔ سب۔ رتی وغیرہ الفاظ پنجابی سچّ کلّ۔ نتھّ۔ سبّ۔ رتّی سے تاثر کا نتیجہ ہیں[۱]

شیرانی مرحوم کی تحقیق اور علمی لیاقت سے انکار ممکن نہیں لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ مولانا مرد میدان لسانیات نہ تھے۔ ان کی کتاب "پنجاب میں اردو" تحقیق و جستجو کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔ اس کے باوجود لسانی حیثیت سے اس کا کوئی بڑا درجہ نہیں۔ مولانا فرماتے ہیں کہ اردو پنجابی اور برج دونوں کی مقلد ہے۔ اس کے مشدد و مخفف کلمے پنجابی کی تقلید کا نتیجہ ہیں اور مسہل

---

[۱] انڈو ایرین اینڈ ہندی صفحہ ۱۷۱-۱۷۰

برج کی تقلید کا۔ اردو اگر کوئی زبان ہے تو اس کا اپنا رجحان بھی ہونا چاہیے۔ اردو یک بیک وجود میں نہیں آسکتی۔ یہ ضرور کسی نہ کسی قدیم زبان سے ارتقا پاتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس زبان کا رجحان کیا تھا جس سے اردو نے ارتقا پایا۔ یہ رجحان اردو کو اپنی اصل سے ترکے میں ملا ہوگا۔ مولانا فرماتے ہیں کہ اردو پنجابی سے ارتقا پاتی ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو اردو کا رجحان وہی ہوگا جو پنجابی کا ہے۔ پنجابی میں تشدید ہے۔ اس لئے تشدید مولانا کی تحقیق کے مطابق اردو کی فطرت اور اس کی اپنی چیز ہونی چاہیے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ اردو پنجابی سے ماخوذ ہو اور تشدید جو پنجابی کی فطرت ہے اردو میں پنجابی سے اس طرح مانگ لی جائے جیسے بقول مولانا مرحوم تسہیل برج سے مانگ لی گئی۔ یہ صرف اس صورت میں ہو سکتا ہے کہ اردو کا ماخذ پنجابی کے سوا کوئی اور زبان ہو جس میں تشدید ہو نہ تسہیل۔

تشدید، تخفیف اور تسہیل تینوں میں سے ایک ضرور اردو کا اپنا رجحان ہونا چاہیے۔ اگر تسہیل اردو کا رجحان ہے تو آپ تشدید و تخفیف کو پنجابی اثر بتا سکتے ہیں جیسا کہ ڈاکٹر چیٹرجی نے لکھا ہے اور اگر تخفیف و تشدید اردو کا مزاج ہے تو تسہیل برج کا اثر ہو سکتا ہے لیکن یہ کیسے ممکن ہے کہ یہ تینوں اردو کے مزاج کے خلاف ہوں۔ تشدید و تخفیف پنجابی سے مستعار لی گئی ہو اور تسہیل برج بھاشا سے۔ یہ اصول لسانیات کے خلاف ہے۔

اس ساری بحث میں مولانا ہندستان کی جدید زبانوں کی ارتقائی تاریخ کو نظر انداز کر جاتے ہیں جس کے بغیر کسی زبان کے ماخذ اور اس کی اصل کا پتا چلانا ناممکن ہے۔ مولانا کے پورے استدلال کا دار ومدار ان لسانی مماثلتوں پر ہے جو اردو اور پنجابی میں دیکھی گئی ہیں۔ لیکن صرف ان مماثلتوں سے کوئی صحیح اور قطعی

نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا۔ مماثلتیں ان دو زبانوں میں بھی ہوتی ہیں جو ایک دوسرے سے ماخوذ ہیں۔ یعنی جن میں ماں اور بیٹی کا رشتہ ہے اور ان زبانوں میں بھی ہوتی ہیں جو کسی تیسری زبان سے نکلی ہیں یعنی جو آپس میں بہنیں بہنیں ہیں جیسے سنسکرت، لاطینی قدیم فارسی وغیرہ اردو اور پنجابی میں جو مماثلتیں ہیں اور جن کو مولانا مرحوم نے فاضلانہ شرح وبسط سے بیان کیا ہے اس کا کیا ثبوت ہے کہ یہ اس لئے ہیں کہ اردو بیٹی ہے اور پنجابی ماں۔ اردو اور پنجابی دونوں شورسینی پراکرت اور مغربی اپ بھرنش سے ترقی پا کر بنی ہیں۔ ان دونوں کا ماخذ واحد ہے اور یہ دونوں بہنیں بہنیں ہیں۔ اس لئے بھی یہ مماثلتیں ہو سکتی ہیں۔

پراکرت کی بابت میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ سنسکرت کے مخلوط حروف اس میں تعلیل کے بعد مشدد بنائے گئے۔ شورسینی میں اس نوع کے مشدد الفاظ کی بھرمار ہے۔ اپ بھرنش میں بھی یہ الفاظ ملتے ہیں چنانچہ ڈاکٹر چیٹرجی نے جہاں پنجابی اثر کا ذکر کیا ہے وہاں یہ بھی لکھا ہے کہ ہندستانی کے مشدد حروف اپ بھرنش کے دوسرے حروف صحیح اور مقصور حرکت کی یاد دلاتے ہیں۔ علمار لسانیات کا بیان ہے کہ اپ بھرنش گیارہویں صدی عیسوی کے بعد تک دہلی اور پنجاب کے علاقوں میں رائج تھی۔ جب مسلمان دہلی آئے تو بقول ڈاکٹر چیٹرجی دہلی اور اس کے نواح میں اپ بھرنش کا راج تھا۔ اس وقت تک برج اور پنجابی کے خط وخال اچھی طرح نمایاں نہیں ہوئے تھے۔ اردو اور اپ بھرنش کے درمیان اہل علم لسانی ارتقا کی ایک کڑی اور مانتے ہیں اور اسے مغربی ہندی کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اپ بھرنش میں جب لسانی اور صوتی تبدیلیاں رونما ہوئیں تو اس نے مغربی ہندی کا روپ اختیار کیا۔ اسی زمانے میں پنجابی کے خط وخال ابھرے۔ اپ بھرنش عہد تک اردو اور پنجابی میں کوئی فرق نہ تھا۔

یہ زبانیں اَپ بھرنش کی گود میں اس طرح سوئی ہوئی تھیں جیسے درخت کی شاخیں اس کے تنے میں۔ بارہویں صدی کے آخر میں قدیم پنجابی اور مغربی ہندی اپ بھرنش سے پھوٹیں اور بتدریج پھیلنی شروع ہوئیں۔ مغربی ہندی کا کوئی نمونہ ہمارے پاس نہیں۔ چند بردائی کی راسو بارہویں صدی کے آخر میں تصنیف ہوئی اور اگرچہ اس کا بڑا حصہ الحاقی ہے جو بعد میں بڑھایا گیا لیکن اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اس کا کچھ حصہ قدیم مغربی ہندی میں ہے۔ صوتی اعتبار سے اس زبان کا رجحان تشدید کی طرف ہے۔ راسو میں مشدد کلمے بکثرت استعمال ہوئے ہیں بلکہ یہ رجحان اس میں اتنا بڑھا ہوا ہے کہ اُردو میں آج جو کلمات مخفف ہیں صرف وہی مشدد نہیں بلکہ فارسی و عربی الفاظ تک اس میں مشدد بنالئے گئے ہیں۔ مثلاً ملاحظہ فرمائیں۔

سبّی (سب)، پچّاس (پچاس)، کمّان۔ اسّوار (سوار) شہنّائی (شہنائی) ترکّی۔ عربّی وغیرہ۔

اُردو اگر شورسینی، پراکرت، مغربی اَپ بھرنش اور مغربی ہندی کے سلسلے کی زبان ہے تو اُردو کے مشدد کلمے ان زبانوں سے لئے گئے اور تشدیدی رجحان پنجابی کی طرح اُردو کو بھی ان قدیم بولیوں سے ترکہ میں ملا۔ لیکن یہاں یہ سوال کیا جاسکتا ہے کہ اگر اُردو سے اوپر کے ارتقائی درجوں میں تشدیدی رجحان پایا جاتا تھا جو منتقل ہوتا ہوا اُردو میں آیا تو تسہیلی رجحان اُردو نے برج سے لیا اور اگر یہ رجحان اُردو کا اپنا ہے تو تشدید یقیناً پنجابی کا اثر ہے۔ ان دونوں میں سے کوئی ایک بات ضرور ہے۔ ڈاکٹر چٹرجی چونکہ اُردو کو تسہیلی زبان سمجھتے ہیں، اس لئے تخفیف و تشدید ان کے نزدیک پنجابی کا اثر ہے۔

اس سوال کا جواب دینے سے پہلے ایک چیز صاف ہوجانی چاہئے۔ بمعج

اُردو سگی بہنیں ہیں۔ ان کی ماں مغربی ہندی بتائی جاتی ہے اور میں ابھی بیان کر چکا ہوں کہ بارہویں صدی کے آخر تک دہلی، مغربی یوپی اور پنجاب میں تشدیدی رجحان عام تھا اور یہاں جو زبانیں رائج تھیں ان میں پراکرات کے مشدد حروف استعمال ہوتے تھے۔ برج بھاشا میں تسہیلی رجحان کہاں سے آیا کیا یہ ممکن نہیں کہ برج اور اردو دونوں نے یہ رجحان کسی ایک زبان سے لیا جو دہلی میرٹھ اور اس کے نواح میں بولی جاتی تھی اور یہ رجحان اس میں قدیم زمانے سے چلا آتا تھا۔ اس کو سمجھنے کے لئے آئیے ذرا تسہیلی رجحان کی تاریخ پر ایک سرسری نظر ڈالتے چلیں۔

پراکرت کے تشدیدی رجحان کا ذکر میں اوپر کر چکا ہوں۔ پراکرت سے پہلے قدیم سنسکرت عہد میں ایک بولی ایسی تھی جس میں مخلوط حروف کی تسہیل بہت عام تھی اور ایک میلان کی حیثیت رکھتی تھی۔ اہل علم نے قدیم سنسکرت عہد کے اس رجحان کا ذکر تفصیل سے کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ویدوں میں اس صوتی رجحان کے اثرات کسی قدر دھندلی شکل میں ملتے ہیں۔ شیام سندر داس اور ہری اودھ وغیرہ علماء نے ویدک ادب سے اس کی متعدد مثالیں پیش کی ہیں مثلاً "وردبھ" ایک سنسکرت لفظ ہے جس میں د اور ر مخلوط ہیں۔ وید میں یہ "دُودُبھ" استعمال ہوا ہے اور "درناش" کی شکل یہاں "دوناش" ہے[۱] ان دو لفظوں میں 'ر' گری اور ماقبل حرکت ممدود ہوئی۔ پالی میں اگرچہ مشدد اور مخفف دونوں قسم کے حروف ملتے ہیں لیکن اس میں ایک قسم کا تسہیلی رجحان بھی ہے جو قدیم سنسکرت کے مذکورہ بالا رجحان سے کسی قدر مختلف ہے۔ مخلوط حروف کا ثقل اور گرانی تلفظ میں آمیزش کا نتیجہ ہے۔ پالی میں مخلوط حروف

---

[۱] ہندی بھاشا اور اس کے ساہتیہ کا وکاس صفحہ ۱۸۔

الگ کر دیئے گئے یعنی پہلا حرف جو ساکن تھا متحرک بنا لیا گیا۔ اس طرح اسکا تلفظ آسان ہو گیا۔ اصطلاح میں اسے " دگرش " یا " سور بھگتی " کہتے ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں :-

کاریہ (کاریہ) سریہ (سوریہ) چیتیہ (چیتیہ) وغیرہ۔

یا مخلوط حروف میں سے ایک حذف کر دیا گیا۔ جیسے۔

بھمر (بھرمر) کمین (کرمین) کھلت (سکھلت) کھنڈ (سکند)

پالی کے زمانے تک تخفیفی یا تسہیلی رجحان ملتا ہے۔ اس کے بعد ادبی پراکرتوں میں اس کے نشان ماند پڑ جاتے ہیں اور مشہور پراکرتیں جن کا ذکر ورر دچی اور ہیم چندر وغیرہ قواعد نویسوں نے کیا ہے اس رجحان سے خالی ہیں۔ جدید آریائی زبانوں میں یہ رجحان پھر ابھر آتا ہے اور پنجابی کو چھوڑ کر جدید زبانوں میں چاہے وہ شمال مغرب کی ہوں یا مشرق اور وسط ہند کی سب جگہ اس کے آثار اجاگر ہو جاتے ہیں۔ پالی مسیح علیہ السلام سے تقریباً پانچ سو برس پہلے کی زبان ہے۔ جدید زبانیں گیارہویں صدی عیسوی کے بعد ظہور میں آئیں۔ اشوک کے مشرقی کتبوں کو چھوڑ کر جہاں پراکرت " دستی " کا روپ " داستی " ہے[1] درمیان کے پندرہ سو برس میں کوئی دستاویز یا تحریر علماء کو نہیں ملی جس سے زبان کے اس رجحان پر کوئی روشنی پڑتی ہو۔ شاید اس لئے علماء لسانیات کو فرض کرنا پڑا کہ اس عہد کی بولیوں میں جن سے جدید آریائی زبانیں ارتقا پاتی ہیں یہ رجحان پایا جاتا تھا۔ لیکن یہ بولیاں بول چال سے ترقی کر کے ادبی درجے کو نہ پہنچ سکیں اس لئے اس فرض یا قیاس کا ثبوت پیش کرنا مشکل ہے۔ سب سے پہلے ڈاکٹر گریرسن نے دوسری بولیوں کے عمیق مطالعے کے بعد اس خیال کا اظہار کیا کہ برعظیم کے شمال مغرب میں جو

---

[1] بلیٹن اسکول آف اورنیٹل اسٹڈیز لندن ص ۵۳۔

پراکرت بولی جاتی تھی اس میں مشدد کلمات کا وجود نہ تھا۔[1] سندھی اور گجراتی زبانیں اس تشدیدی رجحان سے خالی ہیں۔ اس لئے یا تو یہ زبانیں بھی شمال مغربی پراکرت کی پیداوار ہیں یا جس پراکرت سے انھوں نے جنم لیا اس میں تشدیدی رجحان کا فقدان تھا۔ پنجابی اور لہندا کے سلسلہ ارتقا سے ان زبانوں کا کبھی کوئی تعلق نہیں رہا۔ میں وضاحت کے لئے صرف ایک مثال پر اکتفا کروں گا۔

بھکت (سنسکرت) بھت (پراکرت) بھٹ (سندھی) بھاٹ (گجراتی) بھانڈ (اردو)

مشہور اطالوی ماہر لسانیات ڈاکٹر ٹیسی ٹری نے قدیم مغربی راجستھانی پر ایک طویل سلسلۂ مضامین بمبئی کے مشہور تحقیقی رسالے "انڈین اینٹی کویری" میں شائع کرایا تھا[2] اس میں انھوں نے گجراتی، مارواڑی اور قدیم مغربی راجستھانی زبانوں کو متحد الماخذ قرار دیتے ہوئے مغربی اپ بھرنش اور گجراتی، مارواڑی وغیرہ بولیوں کے درمیان پراکرت پنگل کی زبان کو ایک واسطہ ٹھہرایا ہے۔ ان کا بیان ہے کہ اس زمانے میں مشدد یا دوسرے حروف صحیح کی تخفیف اور ماقبل حرکت کے اشباع کا عمل شروع ہوگیا تھا چنانچہ اس درمیانی زبان میں فعل حال مجہول کی علامت اپ بھرنش "اجی" کی بجائے "ای جے" ہے۔ دسویں صدی عیسوی سے گیارہویں صدی تک کا زمانہ ان کے خیال میں اس درمیانی زبان کے ارتقا اور عروج کا زمانہ ہے۔

قدیم مغربی راجستھانی زبان میں تسہیلی رجحان ڈاکٹر صاحب کے نزدیک اسی درمیانی زبان سے آیا۔ اس کی تائید میں انھوں نے جو مثالیں پیش کی ہیں

---

[1] جرنل رائل سوسائٹی ۷۵، ۱، ص ۲۲۶۔

[2] سال ۱۹۱۴ تا ۱۹۱۶ عیسوی۔

ان میں سے دو میں یہاں نقل کرتا ہوں۔ ان کا مغربی اپ بھرنش سے مقابلہ کیجیے۔

قدیم مغربی راجستھانی	مغربی اپ بھرنش
آج	اجّ
دادل	ودل

قدیم مغربی راجستھانی کے حسب ذیل تین صوتی رجحان ڈاکٹر صاحب موصوف نے شمار کرائے ہیں۔

(۱) مشدد حروف کی تخفیف اور ماقبل حرکت کا اشباع۔ یہ وہی ہے جسے میں تسہیل کہتا ہوں۔

(۲) مشدد کی صرف تخفیف۔

(۳) اور بعض اسمار مثلاً اعداد کی تشدید جیسے ستّر۔

قدیم مغربی راجستھانی کے یہ تین رجحانات، جو اردو کے مذکورہ بالا رجحانات کے مطابق ہیں، اس کے اپنے ہیں جنھیں اس نے پراکرت ہنگل کی زبان سے ورثہ میں پایا۔ اور اگرچہ ڈاکٹر ٹیسی ٹری نے ان رجحانات کو مغربی اپ بھرنش کے بعد کی پیدا وار بتایا ہے لیکن مجھے اس کی صحت میں شبہ ہے میں اوپر کی سطروں میں مختصر طور سے تخفیف و تسہیل کا ارتقا ویدک کے عہد سے لے کر پالی کے زمانے تک دکھا چکا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ یہ رجحان پالی کے بعد پراکرت ہنگل کے عہد تک ارتقا پاتا رہا۔ لیکن اس کا تعلق بول چال کی زبانوں سے رہا اس لئے ہم اس کا کھوج نہ لگا سکے۔ پہلے پہل گریرسن کی اس پر نظر پڑی اور اس نے شمال مغربی پراکرت میں اس کا سراغ پایا۔ اس کے بعد ڈاکٹر ٹیسی ٹری نے قدیم مغربی راجستھانی کی مدد سے پراکرت ہنگل میں اس کا پتا لگایا۔ دردی۔ گجراتی۔ راجستھانی مارواڑی بولیاں ان پراکرتوں کی پیداوار ہیں۔ اس لئے تخفیفی و تسہیلی رجحان ان

زبانوں میں بھی ہے۔

میں پھر وہی سوال دہراتا ہوں کہ اردو اور برج اگر براہ راست مغربی ہندی کی پیداوار ہیں تو ان میں تسہیلی رجحان کہاں سے آیا۔ مغربی ہندی اس رجحان سے نہ صرف یہ کہ خالی ہے بلکہ اس میں اس کے برعکس تشدیدی رجحان پایا جاتا ہے۔ اس کا ذکر میں اوپر کر چکا ہوں۔ برج بھاشا راسو کی زبان سے بہت قریب ہے۔ اس میں اور راسو کی مغربی ہندی میں صرف یہی ایک فرق نمایاں ہے کہ برج کا میلان تسہیل کی طرف ہے اور راسو کا تشدید کی طرف۔ اس کے سوا ان میں اور کوئی فرق ایسا نہیں جس پر اس سلسلے میں زور دیا جا سکے۔ لیکن اردو اور راسو کی زبان میں کوئی نسبت نہیں۔ اردو کا ڈول اس سے بالکل الگ ہے۔ صوتی اعتبار سے بھی اور صرفی اعتبار سے بھی۔ اس لئے میں نہیں سمجھتا کہ اردو بارہویں صدی کے آخر میں راسو کی زبان تھی اور اس میں رد و بدل کے بعد اس نے اپنا موجودہ روپ اختیار کیا۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت اردو کا تسہیلی رجحان ہے جسے میں مغربی راجستھانی کی طرح اردو کا قدیم ترین سرمایہ سمجھتا ہوں۔ اردو نے جس بولی سے ارتقا پایا اس میں یہ رجحان موجود تھا اردو نے یہ وہیں سے لیا۔ اردو میں یہ رجحان بڑی باقاعدگی کے ساتھ ہے جیسا کہ قارئین آئندہ سطروں میں ملاحظہ فرمائیں گے۔ اگر یہ کہیں اور سے ماخوذ ہوتا تو اس میں اتنی باقاعدگی نہ پائی جاتی۔ یہ باقاعدگی مغربی راجستھانی میں بھی ہے اور یہ ثابت ہو چکا ہے کہ مغربی راجستھانی میں یہ رجحان کسی پڑوس کی زبان سے نہیں آیا۔

اس کے جواب میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ تسہیلی رجحان برج بھاشا میں بھی ہے اور اس میں ایک حد تک یکسانی ہے۔ یعنی ایک تو اس میں مشدد الفاظ نہیں دوسرے جو الفاظ اردو میں مخفف ہیں وہ یہاں مسہل ہیں۔ اردو نے یہ رجحان برج سے لیا۔

اس سے پہلے اُردو تشدیدی رجحان کی حامل تھی - چنانچہ مولانا شیرانی نے کتب تاریخ و لغت سے انتخاب کر کے جو الفاظ لکھے ہیں وہ مشدد ہیں - یہ کتابیں چودہویں اور پندرہویں صدی کی تصنیف ہیں اس لئے کم سے کم پندرہویں صدی تک اردو میں تشدیدی رجحان غالب تھا - اس کے بعد آہستہ آہستہ برج نے اسے متاثر کرنا شروع کیا اور اس میں تسہیلی رجحان آیا لیکن اس کے باوجود کچھ مشدد الفاظ باقی رہ گئے -

لیکن برج جس زبان سے ارتقا پاتی ہے وہ خود تشدیدی رجحان رکھتی تھی - ہیم چندر کی گرامر ۱۰۸۸ء اور ۱۱۷۲ء کے درمیان تصنیف ہوئی - راسو کا زمانہ تصنیف اس کے کچھ عرصہ بعد ہے - ان دونوں کتابوں میں تشدیدی رجحان غالب ہے برج کا تسہیلی رجحان ان سے ماخوذ نہیں ہو سکتا - یہ کسی اور زبان سے لیا گیا جو اس علاقے میں بولی جاتی تھی اور تسہیلی رجحان اس کی سرشت میں داخل تھا - یہ صرف بول چال کی زبان تھی اس لئے ہم اس کا کوئی تحریری ثبوت پیش نہیں کر سکتے بلکہ صرف قیاس پر اعتماد کر کے اس قسم کی بولی کا وجود برج کے علاقے میں فرض کر سکتے ہیں - اور جب برج کا ماخذ فرض کیا جا سکتا ہے تو اردو کا ماخذ فرض کرنے میں کیا قباحت ہے - اردو صوتی اور صرفی اعتبار سے بہت مختلف ہے - اس کا اور برج کا ماخذ واحد نہیں ہو سکتا -

مولانا شیرانی نے کتب لغت و تاریخ سے منتخب کر کے جو الفاظ لکھے ہیں، ان سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ قدیم اردو میں تشدیدی رجحان غالب تھا اور اردو میں یہ الفاظ مشدد استعمال ہوتے تھے - مولانا نے جن کتابوں سے یہ الفاظ لئے وہ زیادہ تر اردو کے مرکز سے باہر تصنیف ہوئیں اور اس زمانے میں تصنیف ہوئیں جب مغربی اپ بھرنش کا ہر جگہ چرچا تھا اور وہ بقول ڈاکٹر چیٹرجی ادبی زبان کی

حیثیت سے مہاراشٹر سے لے کر بنگال تک سمجھی جاتی تھی۔ یہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ مغربی آپ بھرنش کا میلان مشدد حروف کی طرف ہے۔ اس لئے ہو سکتا ہے کہ اس عہد کے مصنفین نے ہندی الفاظ ادبی اور معیاری زبان آپ بھرنش لہجے کے مطابق نقل کئے اس کے علاوہ یہ بھی صحیح نہیں کہ ان بزرگوں نے جتنے الفاظ لکھے وہ سب اپ بھرنش لہجے کے مطابق ہیں۔ ان میں خاصی بڑی تعداد مخفف اور سہل الفاظ کی بھی ہے خود مولانا شیرانی نے جو فہرست دی ہے اس میں حسب ذیل الفاظ تسہیلی رجحان کی چغلی کھاتے ہیں۔

چھاج۔ ماسا (مسّا) جامن۔ گھانٹی (گھنٹی) پاٹی (پٹی) ساہی (سّہی) چاپاتی (چپاتی) آنڈا (انڈا) آملی (املی) ساجی (سجّی) ہاڈ (ہڈی) ماکھی (مکھی) بلائی (بلّی) وغیرہ۔

ان کے علاوہ مندرجہ ذیل الفاظ شیخ شرف الدین احمد یحییٰ منیری کے ایک عمل میں جو کنج مندرا کے نام سے موسوم ہے اردو لہجے کے مطابق بہ تخفیف یا بہ تسہیل استعمال ہوئے ہیں۔

رات (اپ بھرنش رتّری) تین (تنّ) پانچ (پنچ) سات (ستّ) آٹھ (آٹھّ)

شیخ فرید الدین گنج شکر (متوفی ۶۶۴ ہجری) نے چاند (چند) آنکھ (اکھ) دو لفظ اردو کے تسہیلی رجحان کے مطابق استعمال کئے جن سے اردو کے اس صوتی رجحان کی قدامت ثابت ہوتی ہے۔ یہ دونوں بزرگ اگرچہ دہلی کے نہ تھے لیکن دہلی سے وابستہ تھے اس لئے ان کے یہاں یہ رجحان دہلی کی زبان کا اثر ہے۔

آیئے اب اُردو کے اس رجحان کا کھوج لگائیں۔ اُردو کے مذکورہ بالا تین رجحانوں کا تعلق تین قسم کے مخلوط حروف سے ہے۔

(الف) سنسکرت کے عام مخلوط حروف جیسے کلیہ اور سرد۔

(ب) سنسکرت کے وہ مخلوط حروف جن کا ایک جزو "ن" ہے۔ جیسے دنت۔ شُنڈ۔

(ج) پراکرت کے دوہرے یعنی مشدد حروف جیسے کمّ۔ بہتّ۔ کجّ۔

اردو نے تمام کلمات جو مخفف ہیں یعنی جن میں ماقبل حرکت کا اشباع نہیں ہوا براہ پالی سنسکرت سے لئے۔ جس طرح پالی میں مخلوط میں سے ایک کو حذف کر کے کلمے کو خفیف بنالیا گیا تھا اُردو میں بھی ان کلمات کی تخفیف ایک حرف گرا کر کی گئی۔ ڈاکٹر چیٹر جی کا یہ کہنا صحیح نہیں کہ ان پر پنجابی کے مشدد کلمات کا اثر ہے۔ اُردو کے حسب ذیل کلمات کا تخفیفی عمل پالی کے تخفیفی عمل کے مطابق ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:۔

پالی	سنسکرت	عمل
بھمر	بھرمر	'ر' حذف ہوئی۔
گہین	گرہین	" " "
کھنت	سکھلت	'س' حذف ہوا

یہی عمل اُردو کے مندرجہ ذیل کلمات میں جاری کیا گیا۔

اُردو	سنسکرت	عمل
کُل	کلیہ	'ی' حذف ہوئی
سب	سرد	'ر' " "
کندھا	سکندھ	'س' " "
بڑھ (بڑھنا)	وردھ	'ر' " "

کٹ (کٹنا)	کرت	ر حذف ہوئی
تک (تکنا)	ترک	ر ر ر

ذیل کے کلمات، پالی یا اس سلسلے کی کسی زبان سے آئے۔ ان میں پالی کے عام رجحان کے مطابق سنسکرت کے مخلوط حروف میں تعلیل تو ہوئی لیکن ان کو دوہرا یعنی مشدد نہیں کیا گیا۔

اُردو	سنسکرت	تعلیل
سچ	ستیہ	تیہ کو 'چ' سے بدلا
نتھ	نست	ست کو 'تھ' سے بدلا

اُردو میں ناتھ بھی ہے۔ یہ پراکرت نتھ سے ماخوذ ہے اور کسی قدر بعد کی پیداوار ہے۔

سنسکرت کے وہ مخلوط حرف جن کا جزو 'ن' ہے 'ن' کو مغنونہ بنا کر اور ماقبل حرکت کے اشباع کرنے کے بعد مخفف کر لئے گئے۔ جیسے دانت (دنت) سونڈ (شنڈ) کانٹا (کنٹک) لیکن جن میں یہ عمل نہیں ہوا وہ بعد میں سنسکرت سے درآمد کیے گئے۔ جیسے کنڈ۔ ڈنڈ وغیرہ۔

باقی کلمات اُردو نے پراکرت سے لئے اور اس میں ایک اصول ملحوظ رکھا اُردو میں جو ساکن الآخر تھے ان کے ماقبل حرکت کو کھینچ دیا گیا اور ایک حرف گرا دیا گیا تاکہ ان کا تلفظ آسان ہو جائے۔ جیسے:-

سنسکرت	پراکرت	اُردو
کرم	کمّ	کام
بھکت	بھت	بھات (چاول) بھاٹ بھانڈ
ندرا	ندّا	نیند

آگن	آگی	آگ
چکر	چکّ	چاک
اِکشُ	اکّھ	ایکھ

لیکن جن کے آخر میں حرف علت، نصف حرف علت (ر۔ ل) یا ن، تھا انھیں جوں کا توں قائم رکھا گیا۔ ان کلمات میں زور آخری حرف پر پڑتا تھا اور حروف علت وغیرہ میں سانس جاری رہتا ہے اس لئے تشدید کا ثقل کم ہو گیا۔ ملاحظہ فرمائیں۔

مٹّی۔ کتّا۔ ہڈّی۔ چکّی۔ مسّا۔ مچھّر۔ پتھّر۔ مکھّن۔ رتّی۔ وغیرہ

اگرچہ ہمارے سامنے کوئی قدیم زبان ایسی نہیں جس میں اردو کے یہ تمام رجحانات موجود ہوں لیکن الگ الگ ان میں سے ہر رجحان کہیں نہ کہیں ضرور ہے مثلاً مخلوط حروف میں سے ایک کا حذف پالی میں تھا۔ تعلیل (بلا تشدید) کلمات کے شروع میں پالی کا عام رجحان ہے۔ جیسے تپا آگ سے چاک تسہیلی رجحان شمالی مغربی اور مشرقی پراکرتوں میں تھا۔ اس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ تشدید اُردو میں جیسی با اصول اور منطقی قسم کی ہے۔ وہ خود ایک رجحان ہے۔ اس کو دیکھ کر کوئی صاحب بصیرت یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ اُردو میں کسی دوسری زبان سے آیا۔ ان تمام رجحانوں کا اجتماع، ان کی ترتیب و تہذیب اس امر کا ثبوت ہے کہ اُردو سے پہلے دہلی و میرٹھ کے نواح میں ایک بول چال کی زبان تھی جس میں یہ رجحانات پائے جاتے تھے۔ اُردو نے اس بول چال کی زبان سے ارتقا پایا اور غالباً یہی زبان ہے جسے عام ہند و اہل نظر کھڑی بولی کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

آخر میں یہ بھی عرض کر دوں کہ اگرچہ پنجابی کا پراکرتی رجحان بہت شدید قسم کا ہے لیکن چند الفاظ اس میں مخفف یا سہل بھی ہیں اور یہ شاید اُردو کے

تسہیلی رجحان کا اثر ہے۔ مثلاً

اُردو	پنجابی	پراکرت
انگوٹھا	انگوٹھ	انگٹھ
جیبھ	جیبھ	جبھا
سیکھا	سکھنا	سکھ
پرکھ	پرکھ	پرکھا
ساڑھے	ساڈھے	سڈھ
پلٹا	پلیٹا	پلٹھ
پلنگ	پلنگھ	پلنگ

اصلاحِ زبانِ اُردو

اُردو ادب پر تو اعتراضات ہوتے ہی تھے کہ اس میں غیر ملکی عنصر زیادہ ہے اور اس کا میلان تمام تر فارسی ادب وانشا کی طرف ہے۔ اب عام طور پر اردو زبان کو بھی اس نوع کے اعتراضات کا نشانہ بنایا جارہا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اُردو زبان کا آغاز فرقہ وارانہ جذبے کے تحت نہیں ہوا تو کم سے کم اس کے ارتقا میں یہ جذبہ ضرور کارفرمارہا ہے۔ اُردو زبان کے مشاہیر شُعراء اور نثر نگاروں نے جان بوجھ کر اُردو زبان سے ہندی بھاکا اور سنسکرت کے الفاظ چن چن کر نکالے اور ان کی جگہ فارسی عربی لفظ بٹھائے۔ یہ کام انھوں نے اصلاحِ زبان کے نام سے انجام دیا۔ اس سلسلے میں ظہور الدین حاتمؔ، میر تقی میرؔ، مرزا رفیع سوداؔ۔ سبھی کو الزام دیا جاتا ہے۔ مگر ناسخؔ ان میں زیادہ بدنام ہیں۔ ان پر سب سے زیادہ لعن طعن کی جاتی ہے۔ بلکہ اس اصلاح کا ذمہ دار ہی ان کو ٹھہرایا جاتا ہے۔

یہ تو میں کیسے کہوں کہ جو اصحاب اُردو زبان کی اصلاحی تحریک کو فرقہ پروری کا نتیجہ بتاتے ہیں وہ ہماری زبان کی ارتقائی تاریخ نہیں جانتے۔ ہاں یہ ضرور

کہوں گا کہ اگر وہ اس اصلاح کو بگاڑ سمجھ کر اس کا ذمہ دار حاتم یا ناسخ کو ٹھہراتے ہیں تو ایک بڑی غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ انھوں نے شاید زبانوں کی لسانیاتی تاریخ نہیں پڑھی۔ وہ نہیں جانتے کہ زبانیں کس طرح جنم لیتی، پھلتی پھولتی اور پروان چڑھتی ہیں۔ اردو زبان کی اصلاحی تحریک کوئی اختیاری یا ارادی فعل نہیں جس کا ذمہ دار ہمارے اکابر شعرا کو ٹھہرایا جائے وہ فطرت کا عمل ہے جو زبانوں کے بنانے سنوارنے اور نکھارنے سدھارنے میں اپنا اثر دکھاتا ہے۔ زبان بھی ایک ذی حیات نامی چیز ہے جو دوسری نامی چیزوں کی طرح اپنے نمو سے زندہ رہتی ہے۔ نمو زبان کی زندگی ہے۔ جب تک زبان بول چال میں کام آتی ہے قوت نمو سے مالا مال ہے۔ اس کے الفاظ بولنے والوں کی زبان پر کٹتے چھٹتے اور ترشتے ترشتے رہتے ہیں۔ اس تراش خراش اور کانٹ چھانٹ کے دوران میں بہت سے الفاظ مٹ جاتے ہیں۔ انھیں اردو میں متروک اور انگریزی میں obsolete کہتے ہیں۔ دنیا کی شاید ہی کوئی زندہ اور نامی زبان ہو جس میں اس نوع کی تبدیلیاں نہ ہوئی ہوں۔ انگریزی میں یہ تبدیلیاں اس کثرت سے ہوئیں کہ آج الفریڈ کے عہد کی زبان سمجھنا دشوار ہے۔ قدیم فارسی یا پہلوی موجودہ فارسی سے کتنی مختلف ہے۔ ورجل اور دانتے کی زبان کون کہہ سکتا ہے کہ ایک ہے الفلاس، چارلے میگنے اور گوئٹے کہنے کو تینوں جرمن ہیں لیکن ان کی زبانوں میں کتنا تفاوت ہے اس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ بائبل کا موجودہ انگریزی ترجمہ ۱۶۱۱ء کے لگ بھگ ہوا تھا۔ پادری جے بوکر نے ۱۸۶۲ء میں ایک فرہنگ شائع کی جس میں ان متروک انگریزی الفاظ کی شرح کی گئی ہے جو بائبل میں استعمال ہوئے ہیں۔ یہ ۳۸۸ الفاظ ہیں۔ پروفیسر میکس مولر[۱] کا بیان ہے کہ یہ کل استعمال شدہ

۱؎ سائنس آف لینگویج جلد اول ص ۳۵

الفاظ کا پانچواں حصہ ہیں۔ ڈھائی سو سال کے اندر ایک ضخیم کتاب کے الفاظ کا پانچواں حصہ استعمال سے خارج ہوگیا اس سے زبان کے حک و اصلاح اور لفظوں کی قطع و برید کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

ماہرین لسانیات نے متروکات کی بہت سی قسمیں کی ہیں۔ ان میں سے کثیر الوقوع حسب ذیل ہیں:۔

(۱) کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کچھ الفاظ نامقبول اور ناشائستہ قرار دے کر زبان سے نکال دیے جاتے ہیں اور ان کی جگہ دوسرے مناسب، آسان اور رواں الفاظ لے لیتے ہیں۔ یہ الفاظ ضروری نہیں کہ اس زبان اور ملک کے ہوں۔ یہ دوسری زبان سے بھی درآمد کیے جا سکتے ہیں۔ اول اول یہ الفاظ آہستہ آہستہ زبانوں میں داخل ہوتے ہیں اور ملکی یا اصلی الفاظ کے ساتھ ساتھ ان کا چلن رہتا ہے۔ بعد میں یہ بدیسی الفاظ دیسی لفظوں کو نکال باہر کرتے اور خود ان کی جگہ لے لیتے ہیں۔ انگریزی میں ایسا بہت ہوا ہے۔ نارمن فتوحات کے بعد سے بے شمار فرانسیسی الفاظ انگریزی میں داخل ہوئے۔ کچھ عرصہ بعد اصل سیکسن الفاظ ٹکسال باہر ہوئے فرانسیسی لفظ آج بھی چلتا ہوا سکہ بنے ہوئے ہیں Despaire فرانسیسی لفظ ہے۔ پہلے اس کی جگہ سیکسن WANHOPE استعمال ہوتا تھا جو اب متروک ہے۔ Ayenbites بمعنی Remorse اور Gnwit بمعنی conscience اب استعمال نہیں ہوتے۔

(۲) کبھی محض اتفاق سے الفاظ بے جان ہو کر گمنامی میں جا پڑتے ہیں اور ان کی جگہ اسی زبان کے دوسرے الفاظ استعمال ہوتے لگتے ہیں مثلاً Fore بمعنی went اور Soth بمعنی TRUTH یہ دونوں لفظ سیکسن میں استعمال ہوتے تھے اب متروک ہیں۔ مشہور ماہر لسانیات پروفیسر ڈیٹنے نے

نے اس کی بہت سی مثالیں[۱] پیش کی ہیں۔ تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں۔

(۳) کچھ متروکات ایسے بھی ہیں جن کا تعلق زبان کی ساخت اور اس کی گرامر سے ہے۔ انگریزی میں فارسی کی طرح بطور علامت مصدر on استعمال ہوا کرتا تھا اب اس کی جگہ To نے لے لی ہے۔ افعال میں لاحقہ جمع on اب ترک کیا جا چکا ہے۔ So (وہ) اور Tha (وے) اب He اور They سے تبدیل ہو چکے ہیں۔ انگریزی میں صرفی نحوی متروکات کی مثالیں اردو سے بہت زیادہ ہیں Speak کا ماضی بائبل میں ہر جگہ Spake استعمال ہوا ہے Hold کا مفعول Holden اور Shape کا Shapen

(۴) متروک کی ایک قسم اور بھی ہے جسے لسانیات میں obsolescent کہتے ہیں۔ یہ وہ الفاظ ہیں جو ادب کی خاص خاص اصناف میں استعمال ہوتے ہیں۔ عام طور پر زبان میں نہیں آتے۔ یا بازاری اور عامیانہ زبان میں تو آتے ہیں لیکن ادبی اور شستہ تحریروں میں ان کا استعمال غیر فصیح اور ناصحیح سمجھا جاتا ہے۔ مثلاً Oft انگریزی نظم میں استعمال ہوتا ہے نثر میں اس کا استعمال ناجائز ہے اس قسم کے الفاظ اصطلاح میں Poetical یا Archaic کہلاتے ہیں۔ جو الفاظ صرف عامیانہ محاورے میں استعمال ہوتے ہیں انھیں Slang کہا جاتا ہے۔

کہتے ہیں کہ اردو زبان کا سب سے پہلا مصلح حاتم ہے۔ حاتم سے پہلے دلی کے زمانے تک اردو میں بہت سے الفاظ مستعمل تھے جنھیں حاتم نے غیر صحیح اور ناشستہ قرار دے کر چھوڑ دیا۔ حاتم کے بعد میر و مرزا نے ہماری زبان کو متروکات کے خس و خاشاک سے پاک کیا۔ ناسخ کے متعلق مشہور ہے کہ انھوں نے الفاظ و

---

[۱] ملاحظہ فرمائیں۔ لائف اینڈ گروتھ آف لینگویج

محاورات کی ایک بڑی تعداد پر خط نسخ کھینچ دیا۔ اردو زبان کی اصلاح کرنے والوں میں وہ سب سے ممتاز ہیں۔ صفیر بلگرامی نے تذکرہ جلوۂ خضر میں ان مصلحین زبان کی اصلاحی سرگرمیوں کا ذکر کرتے ہوئے ان الفاظ کی ایک طویل فہرست بھی دی ہے جن کو ان مصلحین نے متروک قرار دیا۔

اس سلسلے میں سب سے پہلے میں یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ ان شعرا کو کس اعتبار سے مصلح زبان کہا جاتا ہے۔ یہ غلط ہے کہ ان اصحاب نے اپنے اختیار و پسند سے ان الفاظ کو جو ہماری زبان میں مستعمل تھے۔ متروک قرار دے کر چھوڑ دیا۔ دراصل زبان کے باب میں ترک و اختیار ایک انسان کی طاقت سے باہر ہے جیسا کہ میں اوپر لکھ آیا ہوں۔ میکس مولر نے اس کو ثابت کرنے کے لئے ایک چھوڑ دو مثالیں دی ہیں۔ شہنشاہ جرمنی سکمنڈ کی بابت کہا جاتا ہے کہ اس نے ایک موقع پر لاطینی میں تقریر کرتے ہوئے Schisma کو مذکر استعمال کیا۔ اس پر ایک مسیحی درویش نے کہا "جہاں پناہ! یہ لفظ مذکر نہیں ہے۔" بادشاہ نے کہا "کون کہتا ہے یہ لفظ مذکر نہیں؟" درویش نے جواب دیا "حضور الیگزنڈر گیلس کہتا ہے۔" اس پر بادشاہ نے کہا "الیگزنڈر کون ہے؟" درویش نے جواب دیا "مسیحی درویش" بادشاہ نے کہا "میں بادشاہ ہوں۔" میکس مولر لکھتا ہے۔ ایک جلیل القدر بادشاہ ایک لفظ کی جنس نہ بدل سکا۔ آج بھی وہ بے جنس ہے۔ دوسری مثال شہنشاہ "ٹائبریس" کی ہے جس نے ایک لفظی غلطی کا ارتکاب کیا۔ مشہور لغوی مارسیلس کے اعتراض کرنے پر قواعد دان کیپٹو نے جو اتفاق سے وہاں موجود تھا، کہا "شہنشاہ نے جو لفظ استعمال کیا وہ فصیح اور صحیح ہے اور اگر نہیں ہے تو آئندہ ہو جائے گا" مارسیلس نے جواب دیا "شہنشاہ! کیپٹو کاذب ہے۔ آپ ایک شخص کو روم کا شہری تو قرار دے سکتے ہیں لیکن ایک لفظ کو چلن عطا نہیں کر سکتے۔"

اصل بات یہ ہے کہ جو الفاظ ان مصلحین زبان نے متروک قرار دئے وہ زبان کے اس اصول کے مطابق جس ذکر کا سطور بالا میں کیا گیا۔ پہلے ہی متروک ہو چکے تھے۔ اور ان کا استعمال کم سے کم ادبی اور علمی تحریروں میں نہیں ہوتا تھا۔ ان اصحاب نے اس کا خاص اہتمام کیا کہ یہ الفاظ ان کے کلام میں راہ نہ پائیں اس لئے حک و اصلاح کی نسبت ان کی طرف کر دی گئی۔ درحقیقت نہ انھوں نے ان الفاظ کو اپنے اختیار ولپسند سے متروک قرار دیا اور نہ وہ اصول لسانیات کی رو سے ایسا کر سکتے تھے۔ صاحب شعر الہند نے اس کا اعتراف کیا ہے کہ ان الفاظ کے ترک کی ذمہ داری اگر ان اصحاب پہ ہے تو صرف اس وجہ سے کہ انھوں نے ان الفاظ کے استعمال سے، جو دراصل پہلے ہی زبان کے بازار میں کھوٹا سکہ بن چکے تھے، اجتناب کیا اور شدت کے ساتھ اس پر عمل پیرا رہے۔ فرماتے ہیں :۔

"حقیقت یہ ہے کہ اردو زبان کا قالب پہلے ہی دن سے تبدیلی کے لئے آمادہ تھا۔ اگر کوئی شخص اس میں تغیر پیدا کرنا چاہتا تو خود دلی ہی کے زمانے میں ایک ہموار زبان کا خاکہ تیار ہو جاتا۔ کیونکہ دلی کا ثلث دیوان، جیسا کہ اوپر گزرا۔ اس زبان میں ہے، جو آج فصاحت و بلاغت کا معدن سمجھی جاتی ہے"[1]

یہ کہنا بھی غلط ہے کہ اصلاح زبان کا مقصد یہ تھا کہ اردو سے ہندی یا سنسکرت الفاظ نکال باہر کئے جائیں۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے ہم ان اصولوں پر نظر ڈالتے ہیں جو حاتم کے سامنے تھے۔ حاتم نے اپنے دیوان زادہ کے مقدمہ میں ان کا ذکر کیا ہے۔

(۱) ان عربی اور فارسی الفاظ کا استعمال کرنا جو قریب الفہم اور کثیر الاستعمال

---

[1] شعر الہند حصہ اول ص۲

ہیں اور دلّی میں عام طور پر روزانہ بول چال میں استعمال ہوتے ہیں۔

(۲) ہندی بھاکا الفاظ ترک کر کے روزمرہ زبان اختیار کرنا جسے عام و خاص سبھی بولتے اور پسند کرتے ہیں۔

یہ دونوں اصول اپنی جگہ واضح ہیں۔ حاتم سے پہلے دکنی اور دہلوی دونوں بولیوں میں بڑا فرق تھا۔ دونوں کا روزمرہ الگ الگ تھا۔ بہت سے الفاظ دکنی میں استعمال ہوتے تھے دہلی میں ان کا چلن نہ تھا۔ یہ الفاظ دکنی میں پڑی بولیوں سے آئے تھے دلّی کی صاف وشستہ زبان میں، جسے کھڑی کہتے ہیں ان کا استعمال قبیح سمجھا جاتا تھا۔ بلکہ خاص خاص لوگوں کو چھوڑ کر یہ الفاظ دلی کے عام باشندے سمجھتے تک نہ تھے۔ فارسی عربی الفاظ دکن میں غلط بولے جاتے تھے مگر دلی والے ان کا صحیح تلفظ کرتے تھے۔ حاتم کہتے ہیں، میں نے اپنے آخری کلام میں دو باتوں کا التزام کیا ہے اوّل یہ کہ عربی و فارسی الفاظ جو استعمال کئے ہیں ان کی صحت کا خاص خیال رکھا ہے اور ان کو اس تلفظ کے ساتھ استعمال کیا ہے جو دلّی میں رائج ہے۔ اس کی انھوں نے چند مثالیں دی ہیں۔ تسبی کی جگہ تسبیح۔ صحی کی جگہ صحیح۔ بگانہ کی جگہ بیگانہ۔ دوانہ کی جگہ دیوانہ، مرض (ساکن) کی جگہ مرَض (متحرک)۔ دوسرے ہندی لفظوں میں سے میں نے وہ الفاظ تو سرے سے استعمال ہی نہیں کئے جو بھاکا کے ہیں اور صرف دکنی میں استعمال ہوتے ہیں۔ مثلاً تین، جگ، نت وغیرہ اور جو ہندی الفاظ دکن میں کسی قدر مختلف لب ولہجے کے ساتھ استعمال ہوتے ہیں انھیں میں نے دہلی کے لب ولہجہ کے مطابق استعمال کیا ہے مثلاً ستی کو سے۔ اودھر کو اُدھر۔ کیدھر کو کدھر۔ اور پہ کو پر وغیرہ۔

اس کے بعد ان الفاظ پر نظر کیجیے جو میر و مرزا کی طرف منسوب ہیں۔ صغیر بلگرامی نے جو فہرست دی ہے اس میں کل نوّے الفاظ و محاورات ہیں۔ ان میں

ذیل کے اکیس الفاظ کی جگہ فارسی الفاظ کو دی گئی ۔ ساجن، پیتم ۔ پیو ۔ پیا ۔ سریجن موہن (معشوق) من (دل) نین (چشم) کال (مصیبت) سنسار (دنیا) برہا (جدائی) درشن (دیدار) جگ (دنیا) باج (بغیر) ماس (گوشت) دستا (مانند) پرت (بغیر) نسدن (ہمیشہ) درپن ۔ آرسی (آئینہ) باقی الفاظ و محاورات یا تو ہندی کے ہیں اور ان حضرات نے ان کے تلفظ و املا کو بدل دیا ہے یا عربی و فارسی کے جو دکن میں غلط بولے جاتے تھے لیکن دلّی والے ان کو صحیح بولتے اور لکھتے تھے ۔ ان میں سے چند درج ذیل ہیں ۔

تبدیل میر و مرزا	محاورہ و تلفظ وقت دلّی	تبدیل میر و مرزا	محاورہ و تلفظ وقت دلّی
نزدیک	نزک	اوّل	آدل
آنکھیں	انکھیاں	کبھی	کدھی
اتنا	اِتّا	مت کر	کا رمت
سے	سین ۔ سوں ۔ سیتی	تمھارا	تما
جیسے	جو	کو	تئیں
ہے	اچھن	مجھ کو	مجھ
تک	لگ	پاس	کنے
جاری کیا ہے میں نے	جاری کیا ہوں	نغمہ کرنا	نغمہ بولنا
آنسو	انجھو	سرخرو یوں	سرخرد یاں
دی ہے طبع رسا	دیا ہے طبع رسا	کیا	کیتا

اس فہرست میں الفاظ و محاورات بھی ہیں اور نحوی و صرفی تصرفات بھی یہاں بھی وہی دو اصول ملحوظ رکھے گئے ہیں جن کا ذکر حاتم کے الفاظ میں اوپر کیا گیا ہندی الفاظ جو سرے سے چھوڑ دئے گئے ہیں اور ان کی جگہ فارسی الفاظ استعمال

کئے گئے ہیں دراصل بھاکا کے ہیں جو دکن میں تو بولے جاتے تھے لیکن دلی میں اس وقت ان کا رواج نہ تھا۔ شاعری کو دلی کے روزمرہ میں ڈھالنے کا مطلب یہ تھا کہ ان الفاظ کو ترک کر دیا جائے اور ولی وغیرہ دکنی شعرا کی تقلید میں ان کو رواج نہ دیا جائے۔ اس کی تائید ہندی کے ان الفاظ سے ہوتی ہے، جو کسی قدر بدلی ہوئی صورت میں حاتم وغیرہ دہلوی شعرا کے یہاں استعمال ہوئے ہیں۔ یہ الفاظ دلی میں جس شکل و صورت کے ساتھ اس وقت مستعمل تھے اسی شکل و صورت میں باقی رکھے گئے اور ان کی دکنی صورت کو متروک قرار دیا گیا۔ مثلاً سے، دکن میں سین اور سوں سیتی بولا جاتا تھا۔ دہلی میں اس کی یہ تینوں صورتیں متروک تھیں۔ تک کو لگ بولتے تھے اور آنسو کو انجھو۔ سرخرو کی جمع سرخرویاں اور آنکھ کی جمع انکھیاں ہو سکتا ہے کہ حاتم سے پہلے دہلی میں رائج ہو لیکن حاتم کے زمانے میں اس کا چلن نہ تھا۔ یہی حال قریب قریب دوسرے ہندی الفاظ و مشتقات کا ہے۔ وہ کم سے کم اس عہد کی دہلوی زبان میں رائج نہ تھے۔ اس لئے ان کو متروک قرار دیا گیا اور ان کی جگہ رائج الوقت ٹکسالی الفاظ لائے گئے۔ یہ سمجھنا کہ ہندی زبان کے الفاظ تھے، اس لئے چھوڑ دئے گئے۔ خلاف واقع ہے۔ اس لئے کہ ان کی جگہ جن الفاظ کو دی گئی وہ بھی ہندی بھاشا کے ہیں۔ مثلاً تک، آنسو، کو، پاس وغیرہ الفاظ جو میر و مرزا کے یہاں لگ، انجھو، تئیں یا کون، کنے وغیرہ کی جگہ استعمال ہوئے ہیں۔ سب جانتے ہیں ہندی بولی یا کھڑی بولی سے لئے گئے ہیں۔

ناسخ کی اصطلاحات تقریباً ہر دور کے متروکات پر حاوی ہیں اس لئے ان کو زیادہ جامع سمجھنا چاہیے اور شاید اسی لئے ناسخ کو مصلحین زبان میں اولیں درجہ دیا گیا ہے۔ یہ بہر حال پیش نظر رہے۔ جیسا کہ میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں، کہ ناسخ دوسرے مصلحین کی طرح اس کا خاص اہتمام و التزام رکھتے تھے کہ کوئی قدیم متروک، غلط نامانوس

اور غریب لفظ یا محاورہ ان کے کلام میں راہ نہ پائے اور ان کا کلام زبان و بیان کے لحاظ سے کم سے کم صاف واضح اور شستہ ہو اس لیے انھوں نے ان تمام الفاظ و محاورات کی ایک فہرست تیار کی جو اس عہد کی زبان سے، یا یوں کہیے شستہ اور شائستہ زبان سے نکالے جا چکے تھے اور شعر کہتے وقت اس کا خیال رکھا کہ وہ ان الفاظ کو استعمال نہ کریں۔ ان کی اس فہرست میں وہ الفاظ بھی ہیں جو پہلے مصلحین زبان کی اصلاحی کوششوں کے باوجود کسی نہ کسی طرح شعراء کی زبان پر باقی رہ گئے تھے اور وہ الفاظ بھی ہیں جو ہر چند ناسخ سے پہلے رائج تھے لیکن ناسخ کا زمانہ آتے آتے متروک ہو گئے۔ حقیر بلگرامی نے جلوہ خضر میں ان الفاظ و محاورات کی ایک مکمل فہرست دی ہے۔ یہ ۱۶۱ الفاظ ہیں۔ ان میں صرف ذیل کے الفاظ ہندی کے ہیں۔ نپٹ (بہت)۔ جگ (دنیا)۔ سجن (محبوب)۔ پون (ہوا)۔ اور (طرف) ٹک (ذرا)۔ جون (مثل)، بن (بغیر)۔ ندان (ہمیشہ) کھوج (جستجو)۔ دیا (چراغ) نت (ہمیشہ)۔ بستار (شہرت)۔ تنک (ذرا)۔ نگر (شہر) سمیت (ساتھ)۔ یہ سولہ الفاظ ہیں جن میں دو یعنی جگ اور سجن۔ میر و مرزا والی فہرست میں بھی آ چکے ہیں۔ ان دو کو نکال کر ۱۴ الفاظ رہ جاتے ہیں جو متروک الفاظ و محاورات کا تقریباً پانچ فی صدی ہیں۔ اس فہرست میں ذیل کے الفاظ خالص عربی و فارسی کے ہیں جو متروک قرار دیے گئے۔ نمط۔ عاقبت۔ چشم (امید) طرف (طرفداری)، لیک۔ ہمسایگان۔ ولے۔ عدو (غیر) بردن۔ آخرش۔ زنجیری۔ پگاہ۔ دخت۔ تاک۔ باآنکہ۔ بلب حنا۔ بعض ان محاورات اور ترکیبوں کو بھی اس فہرست میں متروک قرار دیا گیا ہے جو فارسی محاورے کا لفظی ترجمہ ہیں اور اس وقت عام بول چال میں مستعمل نہ تھے۔ مثلاً بے صبح سے تا شام۔ طرح غنچہ۔ سر کو فرو لانا (فرو آوردن) خواب لے جانا (خواب بردن)، شرح دینا (شرح دادن) قسمے کہ۔ چوں لبند ھن۔

ناسخ کی اصطلاحات کو ہندی بھاشا کی عداوت اور فارسی دوستی پر مبنی بتانا اس کے ساتھ انتہائی نامنصفی ہے۔ انھوں نے جہاں ہندی بھاشا کے نامانوس اور اجنبی الفاظ اور ترکیبوں کو متروک قرار دیا وہاں فارسی الفاظ، فارسی ترکیبیں اور فارسی بندشیں بھی اسی طرح نامناسب سمجھ کر چھوڑ دیں۔ صفیرؔ بلگرامی نے ناسخ کی اصلاحات کے جو اصول شمار کرائے ہیں وہ انہی کے الفاظ میں درج ذیل ہیں لے

(۱) عروض و قافیہ کے اصول سے وزن شعر درست ہو۔ (۲) معانی و بیان اور فصاحت و بلاغت کے اصول کا لحاظ رہے۔ تنافر، غرابت اور تعقید نہ ہو۔ (۳) لغات صحت کے ساتھ استعمال کئے جائیں۔ (۴) غیر زبان کے حروف دبنے نہ پائیں۔ (۵) قافیہ کے اصول سب برتے جائیں۔ (۶) بندش چست ہو الفاظ زائد، حشو و بلا ضرورت نہ آنے پائیں۔ (۷) جتنے کم الفاظ میں مطلب ادا ہو سکے اتنی ہی فصاحت و بلاغت کے اصول کی پابندی ہو گی (۸) ذم و ابتذال کا پہلو شعر میں نہ نکلنے پائے۔

لسانیات کے اعتبار سے ناسخ کی اصلاحات بہت اہم ہیں۔ ان سے ناسخ کے لسانی تبحر اور صلاح کا اظہار ہوتا ہے۔ میں چند اصول استنباط کر کے ذیل میں دے رہا ہوں۔

(۱) اس سے پہلے مونث کے لئے فعل کو "ان" کے لاحقے سے جمع بنایا جاتا تھا۔ مثلاً گھٹائیں چھائیاں۔ ندیاں بہتیاں ہیں۔ ناسخ نے اسے متروک قرار دیا۔

(۲) فارسی کی طرح اسم کی جمع "ان" کے اضافے سے بنتی تھی۔ مثلاً سرخ رویان ہوا خواہاں۔ خواریاں وغیرہ ناسخ نے "دن" سے جمع بنائی۔ مثلاً ہمسایگان

لے جلوۂ خضر جلد اول ص ۲۹۷

سے ہمسایوں۔

(۳) اکثر، نے، کو، پر، وغیرہ حروف ترک کر دیے جاتے تھے۔ ناسخ نے اسے جائز قرار دیا۔ مثلاً ہم خواب دیکھا۔ دار کھینچنا۔ میں کہا۔ آنے کہا تھا کو ہم نے خواب دیکھا۔ دار پر کھینچنا۔ میں نے کہا۔ آپ نے کو کہا تھا۔ لکھا۔

(۴) مضارع پر، ہے، بڑھا کر فعل حالیہ بنا لیا جاتا تھا۔ مثلاً پھرے ہے۔ اُٹھے ہے۔ رہے ہے۔ چھپے ہے۔ کرے ہے۔ جائے ہے۔ ناسخ نے (تا ہے، بڑھا کر فعل حال بنایا۔ مثلاً پھرتا ہے۔ اُٹھتا ہے۔ رہتا ہے۔ چھپتا ہے کرتا ہے۔ جاتا ہے وغیرہ

(۵) ماضی معطوفہ اور امر میں کوئی فرق نہ تھا۔ ناسخ نے امر پر، کر، بڑھا کر ماضی معطوفہ بنائی مثلاً لگا سے لگا کر۔ دیکھ سے دیکھ کر۔ چھوڑ سے چھوڑ کر وغیرہ۔

(۶) اکثر الفاظ اس طرح کھینچ کر بولے جاتے تھے کہ اشباع سے واؤ، یا اور الف پیدا ہو جاتے تھے۔ ناسخ نے ان میں تخفیف کی۔ مثلاً اودھر، ایدھر، اوس، لوہو، ماٹی، جاگا اور لاگا کو، اُدھر، اِدھر، اُس، لہو، مٹی، جگہ، لگا، استعمال کیا۔

(۷) اس کے مقابلے میں کچھ الفاظ بے قاعدہ طور پر مخفف کر لئے گئے تھے، ان کو درست کیا۔ مثلاً دیوانہ سے دوانہ۔ پیالہ سے پالہ؛ بیچارے سے بچارہ، اوپر سے اُپر، ہوجیو سے ہوجو۔

(۸) کرنا مصدر سے امر کریو اور کرے کی بجائے کیجیو اور کیجیے بنایا۔

(۹) تجھ اور مجھ اضافی حالت میں بھی استعمال ہوتے تھے۔ مثلاً تجھ گھر اور مجھ پاس۔ ان کی جگہ میرا اور تیرا استعمال کیا۔

(۱۰) نے، علامت فاعل سے پہلے، س، کو، ن، سے مدغم کر دیا جاتا تھا۔ مثلاً اس نے کو اُن نے، کس نے کو کنے۔ جس نے کو جنے بولا جاتا تھا۔ ناسخ نے اس کی

اصلاح کی۔

(۱۱) فارسی اور عربی الفاظ جو غلط استعمال ہوتے تھے مثلاً متحرک کو ساکن یا ساکن کو متحرک، مخفف کو مشدد یا مشدد کو مخفف کر دیا جاتا تھا یا کسی لفظ کو دبا کر گرا دیا جاتا تھا ان کی تصحیح کی۔ طرَف کو طرْف، نشہ کو نشّہ، وداع کو وِداع،

(۱۲) کچھ ہندی زبان کے افعال ایسے تھے جن کے آخر میں ایک واو اضافہ کر دیا گیا تھا۔ مثلاً ہووے، دیوے، جاوے۔ ان کو ہوئے، دے، اور جائے بولا اور لکھا۔

(۱۳) ناسخ سے پہلے کچھ حروف و کلمات دکن و گجرات کے لہجے میں استعمال ہوتے تھے ناسخ کے عہد میں زبان کی خراد پر چڑھ کر سڈول ہو گئے تھے۔ ناسخ نے انھیں اپنے عہد کے لہجے کے مطابق استعمال کیا۔ مثلاً آگو کو آگے۔ بِن کو تو۔ ستی یا سیتی کو سے۔ کسو کو کسی۔ کبھو یا کدھی کو کبھی، جد کو جب، تد کو تب، تسپر کو اس پر۔

(۱۴) کچھ الفاظ سرے سے متروک اور غیر فصیح قرار دے کر چھوڑ دیئے۔ مثلاً جوں (مثل) تئیں (کو) بیچ (میں) تنک (ذرا) تنک (ذرا) نمط (طرح) دیا (چراغ) دارو (دوا) پگاہ (سحر) کھوج (نشان) بہت (بہت) بن یا باج (بغیر) جگ (دنیا) ندان (ہمیشہ) بستار (شہرہ) میاں (صاحب) نگر (شہر) عدد (غیر) گنے (پاس) ڈھب (طرح) لگن (محبت) عاقبت (آخر)

یہ اصول صفیر بلگرامی کی فہرست متروکات کو سامنے رکھ کر وضع کیے گئے ہیں، اور غالباً اب وہ اتنے جامع ہیں کہ اس فہرست کا کوئی لفظ، محاورہ، ترکیب یا بندش نہیں جو ان اصول میں سے کسی نہ کسی کے تحت نہ آگئی ہو۔ ان میں پہلے تیرہ اصول متروکات کی دوسری اور تیسری قسم میں شامل ہیں۔ ان کا تعلق خود ہماری زبان کے تصریفی قاعدوں اور نحوی ترکیبوں سے ہے۔ کچھ الفاظ ترک کر دیئے گئے ہیں لو

ان کی جگہ زبان ہی کے ذخیرے سے دوسرے لاحقے لے لئے گئے ہیں۔ کچھ الفاظ بدلی ہوئی صورت میں استعمال ہوئے ہیں۔ کچھ میں محض حرکت کا تغیر ہوا ہے۔ کچھ میں تخفیف کی گئی ہے۔ کہیں دو مختلف شکلوں یا حالتوں میں سے ایک شکل یا حالت اختیار کرلی گئی ہے۔ سب سے آخری اصول کا تعلق بیک وقت پہلی اور چوتھی قسم دونوں سے ہے۔ اس میں کچھ الفاظ سرے سے متروک ہیں۔ جیسے تیئں، بستار، ندان، تنک، کنے وغیرہ۔ جن کا اردو ہی نہیں بلکہ موجودہ ہندی میں بھی استعمال نہیں۔ اور کچھ ایسے ہیں جو فصیح اور شستہ زبان میں استعمال نہیں ہوتے یا یوں کہئے کہ غزل جیسی نازک اور لطیف صنف میں ان کی گنجائش نہیں، عامیانہ زبان اور اردو ادب کی دوسری اصناف میں ان کو استعمال کیا جاسکتا ہے۔ غزل کا مزاج ہی کچھ ایسا ہے کہ وہ ثقیل الفاظ اور ادق ترکیبوں کی متحمل نہیں ہوتی۔ وہ الفاظ ہندی کے ہوں یا فارسی کے۔ چنانچہ مذکورہ بالا فہرست میں ہندی کے قدیم ثقیل الفاظ کے پہلو بہ پہلو فارسی کے دشوار اور ناہموار الفاظ و محاورے بھی ہیں۔ اس اصلاح کو غزل اور اس کی زبان کی اصلاح کہنا چاہیے۔ جن اصحاب نے اس کو اردو زبان کی اصلاح کہا انھوں نے ہندی کے قدیم الفاظ اور فارسی کی ناہموار ترکیبوں تک سہل انگاری سے کام لیا ہے۔ خصوصیت کے ساتھ ناسخ کی اصلاح کا تعلق جس تحریک سے ہے اسے کسی طرح بھی ہندی دشمنی پر مبنی نہیں ٹھہرایا جاسکتا۔ اس اصلاح کا سلسلہ اردو ادب میں انشاؔ اور مصحفیؔ کی اصلاحات سے ملتا ہے۔ میر حسنؔ سے پہلے غزل کی زبان تو کافی منجھ چکی تھی مگر مثنوی کی زبان میں بدستور ناہمواری پائی جاتی تھی۔ اس وقت تک اس کا کوئی معیار قائم نہ ہوا تھا۔ اس میں ہندی الفاظ کے ساتھ ساتھ فارسی کی دشوار ترکیبیں بھی ہوتی تھیں۔ مولانا حالیؔ کو بھی اس کا اعتراف ہے انھوں نے اپنے مقدمہ میں لکھا ہے "میرؔ کے زمانے میں اگرچہ غزل کی زبان بہت منجھ گئی تھی

مگر مثنوی کی زبان صاف ہونے تک ابھی بہت زمانہ درکار تھا۔ اسی لئے میر کی مثنویوں میں فارسی ترکیبیں فارسی محاوروں کے ترجمے اور ایسے فارسی الفاظ جن کی اب اُردو زبان متحمل نہیں ہوتی اس انداز سے جو آجکل فصیح اُردو کا معیار ہے بلاشبہ کسی قدر زیادہ پائے جاتے ہیں۔ نیز اردو زبان کے بہت سے الفاظ جو اب متروک ہو گئے ہیں میر کی مثنوی میں موجود ہیں۔" مثنوی کی زبان صاف کرنے کا سہرا میر حسن کے سر ہے۔ میر حسن نے زبان و بیان کے لحاظ سے مثنوی کا ایک اچھا اور اعلیٰ معیار قائم کیا۔ لکھنؤ دبستان کا قیام کسی اور حیثیت سے نہ سہی زبان و بیان کے لحاظ سے اُردو کی تاریخ کا ایک شاندار واقعہ ہے۔ اس دور میں زبان کو نکھار کر اور طرز بیان کو سنوار کر ادب کا ایک ایسا پاکیزہ معیار قائم کر دیا گیا جس کی مثال پیش کرنا دشوار ہے۔ صاحب شعر الہند نے لکھا ہے۔" بایں ہمہ اس دور سے اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ اردو زبان قدیم ثقیل الفاظ اور فارسی کی ترکیبوں سے آزاد ہو کر نہایت شستہ صاف اور مقبول عام ہو گئی اور زبان کی اسی شستگی اور پاکیزگی نے اس دور میں مثنوی کا ایک بہترین نمونہ قائم کر دیا۔"

لکھنؤ کی زبان

(۱)

لکھنؤ کی زبان کا ایک مفہوم تو ادب میں ہے۔ یہ زبان کے ساتھ طرزِ بیان کو بھی شامل ہے۔ یہاں لکھنؤ کی زبان سے مراد زبان وبیان سے متعلق لکھنؤ والوں کا ایک خاص قسم کا رکھ رکھاؤ، ستھراپن، نرمی، تکلف اور رئیسانہ ٹھاٹ باٹ ہے۔ زبان کی اس کیفیت کو صناعی کہتے ہیں۔ آتش نے اس کو "نگوں کا جڑنا" کہا تھا۔ غالب نے شاید لکھنؤ کی زبان کو اس کے اس ستھرے پن ہی کی وجہ سے مستند قرار دیا ہے۔ لکھنؤ کی زبان کا ایک مفہوم اور بھی ہے جو خالص لسانیاتی ہے۔ اس مفہوم سے اس وقت بحث ہے۔

لکھنؤ کی زبان دلّی اور دوسرے مقامات کی زبان سے جہاں اردو بولی جاتی ہے، مختلف نہیں اور جو تھوڑا بہت اختلاف ان دو زبانوں میں ہے وہ اتنا اہم نہیں کہ دلّی اور لکھنؤ کی زبانوں کو اس کی وجہ سے جداگانہ اور مستقل حیثیت دی جا سکے اور یہ کہا جا سکے کہ لکھنؤ کی زبان دلّی سے الگ اور اس سے مختلف اور آزاد ہے۔ لسانیات میں زبان کی جداگانہ تشکیل

کے لئے کچھ شرطیں ہیں، کچھ خصوصیتیں ہیں۔ یہ شرطیں اور خصوصیتیں یہاں نہیں پائی جاتیں۔ اس لئے لکھنؤ کی زبان کو دلّی کی زبان سے الگ کوئی مستقل درجہ نہیں دیا جا سکتا۔ جنھوں نے زبان کے مسئلوں کا مطالعہ کیا ہے، وہ جانتے ہیں کہ دلی اور لکھنؤ کی زبان میں جو اختلاف ہے اس سے کہیں زیادہ اختلاف ان زبانوں میں ہے جو دو مختلف مقامات میں بولی جاتی ہیں لیکن اس اختلاف کی وجہ سے زبان کی پرکھ رکھنے والے ان مقامات کی زبانوں کو الگ الگ دو زبانیں نہیں ٹھہراتے۔ اس فن کے جاننے والوں نے لکھا ہے کہ ایک مقام کی زبان دوسرے مقام کی زبان سے اور ایک فرد کی زبان دوسرے فرد کی زبان سے مختلف ہوتی ہے، لیکن اس کے باوجود وہ ایک ہی زبان کہلاتی ہے۔ زبان تو بہت بڑی چیز ہے۔ ہم اس اختلاف کی وجہ سے ان دو مقامات کی زبان کو ایک زبان کی دو بولیاں بھی نہیں کہہ سکتے۔

اردو نے دلّی، میرٹھ اور اس کے نواح میں جنم لیا۔ اس کو قریب قریب فن کے سبھی ماہروں نے مانا ہے۔ لشکریوں کے ساتھ یہ زبان دکن اور گجرات پہنچی۔ یہاں کے لوگوں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا اور اس کی بڑی آؤ بھگت ہوئی۔ یہ عین فطرت کے مطابق ہے کہ جو جہاں رہتا ہے وہاں کے ماحول سے اثر لے، زبان بھی فطرت کے اس اصول سے باہر نہیں۔ دکن اور گجرات میں اردو نے پاس پڑوس کی زبانوں سے بہت کچھ اثر لیا۔ ان زبانوں کے الفاظ محاورے اور بہت سی نحوی خصوصیتیں اور استعمالات خاموشی کے ساتھ اردو میں راہ پا گئے، اور جیسا کہ عام قاعدہ ہے، کچھ زمانہ گزرنے پر وہ اردو کی اپنی چیز بن گئے۔ شمالی ہند میں فارسی کا طوطی

بول رہا تھا اور بے چاری اردو کو کوئی منھ نہ لگاتا تھا کہ دکن سے شاعری کا غلغلہ بلند ہوا۔ نئی زبان، نئی لے، نئے خیالات، نئے انداز، یہ طرز سب کو بھایا۔ محمد شاہ کے عہد میں ولی کا کلام دلی پہنچ چکا تھا۔ دلی والوں نے اسے آنکھوں سے لگایا۔ اور دل میں بٹھایا۔ گلی گلی ولی کا کلام پڑھا جانے لگا۔ قبول عام نے دلی والوں کو بھی شوق دلایا۔ انھوں نے بھی ریختہ میں شعر کہے، اردو شاعری سے دلی کی فضا گونجنے لگی۔ غالب لکھتے ہیں:۔

”تم نے دلی کے دیوان کا حال سنا ہوگا کہ دلی میں آیا تو جیسے کسی چیز پر لوگ گر پڑتے ہیں۔ اسی طرح اس کے کلام پر گر پڑے۔“

یہ عجیب سی بات ہے کہ اردو جب تک دلی میں رہی، بول چال کی زبان سے آگے نہ بڑھ سکی، اور کسی کو خیال تک نہ ہوا کہ یہ ایسی چونچال ہے کہ نازک خیالات اور لطیف جذبات کے اظہار کا ذریعہ بن سکتی ہے۔ لیکن جب دکن کے سفر سے دلی واپس آئی تو دلی والوں کو اس کی پوشیدہ صلاحیتوں کا احساس ہوا اور وہ اس کو وہ مقام دینے کے لئے تیار ہو گئے جس سے اب تک محروم چلی آرہی تھی۔ یہ دوسری بات ہے کہ اردو زبان دکن سے واپسی کے بعد اتنی بدل گئی تھی اور وہاں کی بولیوں نے اس کے مزاج میں اتنا دخل پالیا تھا کہ وہ ایک نئی زبان معلوم ہوتی تھی۔ دلی پہنچ کر زبان نے چولا بدلنا شروع کیا۔ دکنی الفاظ اور محاورے متروک ہونے لگے، نئے سرے سے زبان کو سنوارا جانے لگا۔ ولی کی بابت یہ نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ہر چند وہ دکن میں پیدا ہوئے۔ گجرات سے ان کا تعلق رہا۔ لیکن اردو کی اصلاح و تہذیب اور غیر ملکی زبانوں کے اثرات سے پاک کرنے میں انھوں نے بیش از بیش حصہ لیا۔ اردو میں اصلاحی تحریک کا آغاز ولی کے زمانے سے ہوا۔ یہ بات ولی کے آخری دور کے کلام پر ایک سرسری نظر

ڈال لینے سے واضح ہو جاتی ہے۔ قیاس کیا جاتا ہے کہ ولی کی شاعری کے اس دور کا آغاز ۱۷۰۰ء کے لگ بھگ اس وقت ہوا جب وہ پہلی مرتبہ دلی آئے، وہاں کے اہل دانش و بینش سے ملے اور انھوں نے دیکھا کہ وہ جس زبان میں نغمہ سنجی کر رہے ہیں دلی کی زبان ہوتے ہوئے بھی وہ دلی کی نہیں۔ اُردو زبان پر بیرونی اثرات اور ولی کی اصلاحی خدمات کا اعتراف دکن و گجرات کے اہل علم کو بھی ہے۔ چنانچہ گجرات کالج احمد آباد کے استاد ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی فرماتے ہیں:-

"سلاطین گجرات و دکن اور صوفیاء کے بعد اورنگ زیب کے زمانے میں ولی کا دور آتا ہے۔ تاریخ ادب اُردو میں یہ ایک انقلابی دور ہے اُس دور تک گجرات و دکن میں اردو دوسری مقامی زبانوں کے اثرات کے ساتھ بولی اور لکھی جاتی تھی اور کسی قسم کا ایک معیار مقرر نہیں تھا۔ مگر ولی ایک ایسا مصلح شاعر پیدا ہوا جس کی دور بین نگاہ نے زبان و ادب کی مشکلات اور مقامی دشواریوں کو پالیا، اور ان گتھیوں کو سلجھایا۔ اور ایک شاہراہ قائم کر دی اور اس طرح شمال، گجرات اور دکن کے فرق کو مٹا کر وحدت لسانی قائم کر دی اور زبان کا ایک معیار قائم کر دیا۔"[1]

ولی کی اصلاحی تحریک لسانی اعتبار سے کوئی بڑی تحریک نہیں۔ ولی اول اول خالص دکنی میں شعر کہتے تھے اور دکنی الفاظ اور محاورے کثرت کے ساتھ استعمال کرتے تھے۔ لیکن آخری زمانے میں انھوں نے یہ روش ترک کر دی۔ فارسی الفاظ، فارسی ترکیبیں اور فارسی محاورات کے اردو ترجمے وہ زیادہ استعمال کرنے لگے۔ اس کے سوا مجھے ان کے ابتدائی اور آخری کلام میں کوئی فرق نظر نہیں

---

[1] اردو جنوری ۱۹۴۷ء

آتا۔ اس زمانے میں بھی انھوں نے جو اردو الفاظ استعمال کیئے وہ دکنی محاورے اور گجراتی بول چال کے مطابق ہیں۔ صرف اتنی بات ہے کہ دکنی الفاظ اور محاورے اس میں کم استعمال ہوئے ہیں۔

اصلاح کا اصلی اور بنیادی کام مرزا مظہر جان جاناں رحمۃ اللہ علیہ سے شروع ہوا اور میر و مرزا کے عہد تک جاری رہا۔ ہمارے تذکرہ نگاروں نے اس کی تفصیلات دی ہیں، لیکن چونکہ یہ بزرگ اردو زبان کی تاریخ اس کے مزاج اور ارتقائی دوروں کو نظر انداز کر گئے اس لئے اردو میں اصلاحی تحریک کی اصل غایت کا پتہ نہ لگا سکے، اور اس کے لسانی پس منظر کی کوئی واضح اور روشن تصویر پیش کرنے میں ان کو کامیابی نہ ہوئی۔ اس سلسلے میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ اول یہ معلوم کیا جائے کہ اس اصلاحی تحریک کی نوعیت کیا ہے؟ کیا یہ مصلحین اردو کا استبدادی فعل تھا کہ وہ بغیر کسی لسانی جواز کے ہندی الفاظ اور دکنی محاورے ترک کرتے جا رہے تھے اور بعض لفظوں کی تراش خراش میں لگے ہوئے تھے اور انھیں حسب دل خواہ توڑ مروڑ رہے تھے یا اس کے لئے کوئی لسانی جواز بھی تھا۔ اور وہ یہ کہ شمالی ہندوستان میں اس وقت جو زبان عوام بول رہے تھے اس میں یہ متروک الفاظ اور محاورے رائج نہ تھے اور جن اسماء و حروف میں تراش خراش کی جا رہی تھی وہ عوام کی بول چال اور محاورے کے مطابق تھی۔ پہلی صورت تو ممکن نہیں۔ یہ بات لسانیات میں ثابت ہو چکی ہے کہ کوئی فرد خواہ وہ کتنی ہی بڑی شخصیت کا مالک کیوں نہ ہو۔ زبان کا دھارا بدلنے اور اس کا رخ موڑنے کی طاقت نہیں رکھتا۔ اس لئے اس کا تو سرے سے سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ صرف دوسری صورت رہ جاتی ہے وہ یہ کہ اردو جب شعر و شاعری کے روپ میں دلی پہنچی، تو دلی کے

محاورے کے مطابق نہ تھی، دکن و گجرات کی زبانوں نے اس کو مسخ کر دیا تھا۔ مصلحین زبان نے ترمیم و تنسیخ کے بعد اس کو اپنے محاورے کے مطابق بنایا اور باہر کی غیر صالح آمیزش سے پاک کر کے اس کو نکھارا۔ ان کا یہ کام فطرت کے مطابق تھا۔ عوام تو پہلے ہی دکنی الفاظ اور محاوروں سے آشنا نہ تھے، خواص البتہ دکنی شعراء کی پیروی میں ان متروکات کو کلیجے سے لگائے ہوئے تھے۔ وہ بھی ترک کرنے لگے، اور اردو زبان عوام کی روزانہ بول چال کے مطابق ڈھلنے لگی۔

مصلحین زبان نے جن الفاظ افعال اور محاورات کو متروک قرار دیا اور جن میں تراش خراش کی، ان کی ایک تشنہ سی فہرست صاحب جلوۂ خضر نے اپنے تذکرے میں درج کی ہے اور میں نے اپنی کتاب "اردو زبان کا ارتقا" میں ان الفاظ و حروف کی سرگزشت بتاتے ہوئے تفصیل سے لکھا ہے کہ یہ الفاظ و محاورات کہاں کہاں سے لیے گئے۔ اس مقام پر اس تفصیل کی گنجائش نہیں۔ میں نے اس بحث کو یہاں اس لئے چھیڑا ہے کہ یہ بتا سکوں کہ اردو کا اصلی مرکز دلی، میرٹھ اور اس کے نواح کے اضلاع ہیں۔ زبان کا کالبد یہیں تیار ہوا اور یہیں اس نے نشوونما پایا۔ اس کے بعد یہ زبان جہاں گئی وہاں کی کچھ خصوصیات اس نے اخذ کیں اور ان میں سے جو اس کے مزاج کو سازگار نہ تھیں اہل زبان نے ان کو قبول نہ کیا اور وہ ترک کر دی گئیں۔ اصلاحی تحریک کے سلسلے میں مظہر، حاتم، اور میر و مرزا کا ذکر میں کر چکا ہوں۔ دلی میں تحریک کے علم بردار یہی تھے۔ ان کی اصلاحی کوششیں ایک حد تک بار آور ہوئیں، لیکن جیسا کہ قاعدہ ہے کچھ الفاظ، محاورے، اسماء اور افعال زبان میں اچھی طرح جڑ پکڑ چکے تھے یہ باقی رہ گئے۔ ان میں سے بعض الفاظ و محاورات کو

زبان سے صاف کرنے اور بعض میں زبان کے مزاج کے مطابق مناسب اصلاح وترمیم کا کام ناسخ نے انجام دیا۔ ناسخ کی بابت میں ایک مضمون میں تفصیل کے ساتھ لکھ چکا ہوں کہ ان کی اصلاحی تحریک مظہر جان جاں اور ظہور الدین حاتم کے سلسلہ اصلاح کی ایک کڑی ہے اور اس کا تعلق کسی طرح بھی زبانوں کے اس حلقے سے نہیں جو لکھنؤ اور اس کے نواح میں بولی جاتی تھیں۔ اس بحث سے مجھے سرسری گزر جانا ہے۔

'آئے ہے' 'جائے ہے' فعل حال 'کا استعمال غالب کے یہاں بھی ہوا ہے یہ دلی کی زبان نہ تھی۔ دکنی ادب کی پیداوار سے بہت پہلے دلی والے 'جاتا ہے،' آتا ہے' بولتے تھے۔ امیر خسرو کے یہاں فعل حال کی یہی صورت ملتی ہے۔ ان کا ایک شعر ہے۔

بے گنہ ہم ساتھ عجب روٹھ ہے　　　یار نہیں دیکھتا ہے سوے من

شیخ فرید الدین گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ کا ایک مقولہ مولانا شیرانی نے سیر الاولیار سے نقل کیا ہے " پونوں کا چاند بالا ہوتا ہے" گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ امیر خسرو سے تقریباً دو سو سال پہلے ہوئے ہیں۔ 'میرا' اور 'تیرا' کی جگہ مجھ اور تجھ، 'کسی' کی جگہ کسو، 'آگے' کی جگہ آگو 'تو' کی جگہ تیں، ناسخ کے زمانے تک دہلی کے فصحا کی زبان تھی، کبھو، کبھی، جد تد، تس پر، تئیں، ٹک وغیرہ عام طور سے استعمال میں آتے تھے۔ ناسخ نے ان پر خط نسخ کھینچا۔ ناسخ کو صحت زبان کا خاص خیال تھا۔ ان کی شاعری جو بے جان سی ہے اس کی وجہ بعض اہل علم نے یہ بتائی ہے کہ وہ مضمون سے زیادہ زبان کی صحت اور لفظوں کی تراش خراش پر زور دیتے تھے۔ "تئیں" کی بابت غالب لکھتے ہیں" یہ پنجابی ہے، پنجاب کے احاطے سے دلی میں داخل

ہوا ایک بڑھیا ہمارے ہاں نوکر تھی وہ یہ لفظ بولا کرتی تھی تو بیبیاں اور لونڈیاں سب اس پر ہنستی تھیں۔"

حرف "نے" کے استعمال میں خصوصیت کے ساتھ بے تکاپن برتا جاتا تھا۔ مولوی عبدالحق کا بیان ہے کہ میر و سودا کے زمانے میں اس حرف کے استعمال میں بے قاعدگی پائی جاتی تھی۔ ان کے نزدیک اس کے استعمال کے قواعد حال میں منضبط ہوئے ہیں۔ اگرچہ یہ شرف ناسخ کو حاصل نہیں لیکن اس میں کوئی کافر ہی شبہ کر سکتا ہے کہ زبان کے اس پیغمبر نے "نے" کے صحیح اور باموقع استعمال سے اس کا ایک معیار قائم کیا۔

ناسخ کی اصطلاحات کا سلسلہ بہت طویل ہے۔ ان کی ان مساعی کو اس زمانے میں بھی سراہا گیا۔ اس کا بڑا ثبوت یہ ہے کہ زبان دانوں نے ان کی اصلاحات کو سر آنکھوں پر لیا اور ان الفاظ کے استعمال سے پرہیز کیا جنھیں ناسخ نے متروک قرار دیا تھا۔ آج مصلح زبان کے خطاب سے ان کو سرفراز کیا جاتا ہے کیوں؟ اس لئے اور محض اس لئے کہ ناسخ نے اردو زبان کو دوسری زبانوں کے اثرات سے جو اس کے مزاج اور سرشت کے موافق نہ تھے پاک کیا۔ ناسخ زبان کی شریعت کے مجدد ہیں۔ ان کی لسانی تجدید نے اردو زبان کو نکھار کر نیا رنگ روپ دیا اور اس کو نئی زندگی بخشی۔

لکھنؤ اردو کا وطن نہیں۔ نہ وہ اس کا مولد ہی ہے اور نہ منشا ہی۔ میرا خیال ہے کہ اس میں دو رائے نہیں ہو سکتیں۔ لکھنؤ نے اردو کو جگہ دی اور اس کو اپنے خیالات و جذبات کے اظہار کا آلہ بنایا۔ اردو کی یہ بڑی خوش بختی ہے کہ وطن سے دور اکثر پردیس میں اس کو پھلنے پھولنے کے مواقع ملے۔ دکن میں یہ لشکریوں کے ساتھ پہنچی اور لکھنؤ امیروں، شریفوں اور شاعروں کے

ساتھ۔ لکھنؤ کی زبان میں جو ایک طرح کا بانک پن اور رئیسانہ تکلف پایا جاتا ہے وہ اردو زبان کے لکھنوی مربیوں کی تہذیبی قدروں کا نتیجہ ہے۔ لکھنؤ کی زبان ادب کی طرح لکھنؤ کی تہذیب اور اس کی آن بان کی آئینہ دار ہے۔ ایک پہلو تو اس مسئلے کا یہ ہے اور اس کی طرف میں پہلے اشارہ کر آیا ہوں اس کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے اور وہ یہ کہ ہر چند لکھنؤ کی زبان امیر زادوں کی گود میں پلی اور محلوں میں پروان چڑھی۔ لیکن لکھنؤ اور اس کے آس پاس کا علاقہ اودھی اور اس کے حلقے کی دوسری بولیوں کا علاقہ ہے۔ یہاں کے عوام کی زبان اور بولی ٹھولی اردو نہ تھی۔ یہ پوربی بولتے تھے۔ گھروں میں اور گلیاروں میں اسی کا سکہ چلتا تھا۔ دربار میں اردو بولنے والوں کے گھر کی زبان پوربیا تھی۔ جس طرح دکن میں اردو مقامی بولیوں سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی لکھنؤ میں بھی اس نے اودھی کی بہت سی خصوصیات کو شعوری یا غیر شعوری طور پر اختیار کر لیا۔ لکھنؤ مدتوں اردو کا مرکز رہا تھا۔ اس کی خاک سے بڑے شاعر کم اور اچھے فن کار زیادہ اٹھے جنھوں نے اردو میں اپنے فن کے قابل قدر نمونے یادگار چھوڑے۔ کچھ ان فن کاروں کی عظمت اور بڑی شخصیت کی وجہ سے اور کچھ اس وجہ سے کہ اردو میں کوئی دوسرا ناسخ نہیں ہوا، اودھی کے اثرات برابر اردو میں کام کرتے رہے اور آخر ایک زمانہ آیا کہ لکھنؤ کو دلی کے مقابلے میں ایک آزاد اردو مرکز کی حیثیت دے دی گئی اور دلی اور لکھنؤ کے درمیان حریفانہ رقابت کا سلسلہ قائم ہو گیا۔

یہ تو میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ دلی اور لکھنؤ کی زبان میں کچھ زیادہ فرق نہیں بلکہ جہاں تک زبان کے کینڈے کا تعلق ہے ان میں کوئی فرق ہی نہیں۔ اس سلسلے میں دو ایک رجحانوں کا ذکر میں کرنا چاہتا ہوں ان سے

آپ کو لکھنؤ کی زبان پر اودھی اثرات کا پتہ لگ سکے گا۔ سب سے زیادہ عام اور نمایاں رجحان لکھنؤ کی زبان کا یہ ہے کہ اس میں اسما اور الفاظ کی تذکیر و تانیث کا کوئی معیار نہیں۔ بہت سے الفاظ جو دہلی میں مذکر ہیں لکھنؤ والے ان کو مونث بولتے ہیں اور اس کے برعکس مونث کو مذکر۔ اس کی ایک بھونڈی صورت یہ ہے کہ عربی مونث الفاظ کی جمع کو بھی وہ مذکر بناتے ہیں۔ اردو میں ان مونث اسمار کی جن کا آخری حرف صحیح ہے فاعلی حالت میں جمع "یں" بڑھا کر بنائی جاتی ہے جیسے عورتیں آئیں، راتیں گزریں لکھنؤ والے یہ قاعدہ مذکر اسما میں بھی جاری کرتے ہیں اور لفظ کی جمع لفظیں، برس کی جمع برسیں، چھپت کی چھپتیں اور شعر کی شعریں بناتے ہیں۔ یوں تو دلّی میں بھی تذکیر و تانیث کا کوئی بندھا ٹکا اصول نہ پہلے تھا اور نہ اب ہے۔ لیکن اردو وہاں کی پیداوار ہے۔ وہیں کے آب و گل سے اس کا خمیر تیار ہوا۔ وہاں کے باشندے ہی اس کے مزاج شناس ہو سکتے تھے۔ وہ اس کی فطرت کو جانتے اور اس کی افتاد طبع پہچانتے ہیں وہ اپنے ذوق سے یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ کونسا لفظ اردو میں مونث ہے اور کونسا مذکر، ایک مزاج داں طبیب ہی بتا سکتا ہے کہ کونسا ان مریض کے انگ لگے گا اور کونسا نہیں۔

اس کے علاوہ لکھنؤ والے ویسے بھی لفظوں کی تذکیر و تانیث کا مذاق نہیں رکھتے۔ وہ اس کا صحیح احساس کر ہی نہیں سکتے۔ لکھنؤ کی بابت میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ وہ اودھی علاقے میں ہے۔ لسانی اعتبار سے یہ حلقہ مغربی ہندی اور بہاری کے درمیان میں ہے۔ بابو رام سکسینہ جنھوں نے اودھی پر تحقیقی کام کیا ہے لکھتے ہیں:۔

"جہاں تک اسما و صفات کی تذکیر و تانیث کا تعلق ہے

مغربی ہندی بڑی سختی کے ساتھ اس کی پابند ہے اودھی
اس میں کسی قدر نرم ہے رہی بہاری سو وہ اکثر و بیشتر مذکر و
مونث کا فرق نہیں کرتی۔"

اردو مغربی ہندی کے حلقۂ اثر کی زبان ہے۔ تذکیر و تانیث کا فرق اس کی گھٹی میں پڑا ہوا ہے۔ لکھنؤ اس حلقے سے باہر ہے وہاں کے رہنے والے تذکیر و تانیث کا شعور اگر رکھتے بھی ہیں تو وہ اس درجہ کا نہیں اس لئے اس کوچے میں آکر اُن کا بھٹک جانا تعجب کی بات نہیں۔

"نے" کی بابت میں اوپر لکھ آیا ہوں کہ اس کے استعمال کے قواعد مولوی عبدالحق کے نزدیک حال ہی میں منضبط ہوئے۔ گریرسن نے بھی کسی جگہ اس سے ملتی جلتی بات کہی ہے۔ اٹھارویں صدی عیسوی کے آغاز کو وہ "نے" کے صحیح استعمال کی تاریخ بتاتے ہیں۔ دلی اور اس کے نواح میں بھی "نے" کا صحیح استعمال کرنے والے لوگ بہت کم تھے۔ پنجاب میں آج بھی 'نے' کا استعمال برمحل نہیں ہوتا۔ اودھی میں تو سرے سے 'نے' کا وجود ہی نہیں۔ اس لئے کچھ زیادہ تعجب کی بات نہیں۔ اگر لکھنؤ والوں سے اس کے ترک و اختیار میں لغزش ہو جائے۔ حال ہی میں لکھنؤ کے بعض اہل قلم کے یہاں میں نے دیکھا کہ وہ فعل "بولنا" کی ماضی کے ساتھ جب وہ متعدی ہو اور اس کا مفعول بھی مذکور ہو 'نے' نہیں لاتے مثلاً وہ یوں لکھتے ہیں:-

"مرد جھوٹ بولا، عورت جھوٹ بولی، وہ دو جملے بولا وغیرہ۔"

دہلی اور اس کے نواح میں اس نے جھوٹ بولا اور اس نے دو جملے بولے یوں کہتے ہیں۔ میں یہ سمجھے ہوئے تھا کہ یہ لکھنؤ کی کوئی خصوصیت نہیں شاید

ان اہل قلم کی بے خبری ہے جن کے یہاں میں نے یہ جملے استعمال ہوتے دیکھے۔ لیکن میرے ایک رفیق کے دریافت کرنے پر جب پروفیسر مسعود حسن رضوی۔ نے جن کا شمار لکھنؤ کے مستند اہل قلم اور اہل زبان میں ہوتا ہے اس نے دو جملے بولے کو غیر فصحا کی زبان بتایا تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی اور میں یہ سمجھنے پر مجبور رہا کہ یہ لکھنؤ کی زبان ہی کی خصوصیت ہے کہ بولا فعل متعدی کے ساتھ "نے" نہ لایا جائے۔ اگر یہ صحیح ہے تو اس کو بھی اودھی کا اثر سمجھنا چاہیئے۔ بولنا اردو میں لازم بھی ہے اور متعدی بھی۔ وہ بولا (لازم) اس نے جھوٹ بولا (متعدی) متعدی کے ساتھ نے آنا چاہیئے جو در اصل نائب فاعل یعنی (AGENT) کی علامت ہے۔ اردو کا یہ استعمال سنسکرت کے جس استعمال سے لیا گیا ہے اسے کرمنی پرلوگ (مجہولی استعمال) کہتے ہیں۔ اس میں فعل مفعول کے مطابق ہوتا ہے اور فاعل جس پر "نے" آتا ہے فعل کے صدور کا ایک آلہ اور ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔ یہ استعمال فعل متعدی کے ساتھ مخصوص ہے اور مغربی ہندی کے حلقے کی زبانوں میں دیکھا گیا ہے۔ لکھنؤ والوں کو اس کے استعمال میں اشتباہ دو وجہ سے ہوا ایک تو اس فعل کے اردو میں بکثرت لازمی استعمال سے۔ کثرت استعمال سے اس کی ایک خاص وضع کا زبان پر چڑھ جانا اور طبیعتوں کا عادی ہو جانا معمولی سی بات ہے۔ دوسرے اس وجہ سے کہ اردو میں وہ بولی بولا وہ بولی بولا یہ جملے بھی ہیں۔ سمجھا یہ گیا کہ بول اور بولی مفعول بہ ہیں اور بولا ان جملوں میں متعدی ہے اس کے باوجود "نے" کے بغیر استعمال ہوا ہے حالانکہ بولی اور بول ان جملوں میں مفعول بہ نہیں بلکہ مفعول مطلق ہیں جو بولنا سے لئے گئے ہیں اور اسی مادے کے مصدر

یا حاصل مصدر ہیں۔

میں محسوس کر رہا ہوں کہ بحث خشک ہوتی جا رہی ہے۔ لیکن مجبوری ہے لکھنؤ کی زبان پر اودھی اثرات دکھانے کے لئے یہ صرفی اور لسانی بحثیں ضروری ہیں۔ اُردو میں تاکید و حصر کے لیے 'ہی' استعمال ہوتا ہے جیسے وہی اور انہی وغیرہ۔ جب کسی بات پر زور دینا مقصود ہوتا ہے یا حصر کا اظہار کرنا چاہتے ہیں تو کلمے کے آخر میں "ہی" اضافہ کر دیتے ہیں۔ اس میں مفرد یا جمع کی تفریق نہیں۔ 'وہ' پر کبھی 'ہی' اضافہ کیا جاتا ہے اور 'ان' پر بھی۔ لکھنؤ والوں نے اودھی کے زیر اثر جمع کی صورت میں 'ہی' کو 'ہیں' بنالیا۔ وہ 'ان ہی' کو انھیں اور 'ہم ہی' کو ہمیں کہتے ہیں۔ ایک تو اُردو میں 'ہیں' علامت حصر نہیں۔ دوسرے سنسکرت یا پراکرت میں کوئی کلمہ نہیں جسے اس کی اصل قرار دیا جا سکے۔ البتہ قدیم اودھی ادبیات میں ہیں استعمال ہوا ہے۔

آخر میں ایک نقطہ کی طرف اہل علم کو توجہ دلانا ضروری ہے۔ اردو علامت مصدر نا کا استعمال اردو میں بطور استقبال بھی ہوا ہے جیسے مجھے سبق پڑھنا ہے روٹی کھانی ہے یہ 'نا' سنسکرت (انی [illegible]) کے قائم مقام ہے۔ سنسکرت میں یہ صفت یا فاعل کی علامت ہے۔ فارسی 'نی' بھی اسی سے ہے۔ گردنی کرنے کے قابل جو آئندہ کیا جائے۔ کرنا اصل میں کرنی تھا 'ی' کو تانیث کی علامت سمجھ کر نا اس کا مذکر بعد میں تراش لیا گیا۔ دہلی والے کھانا کرنا وغیرہ کو قاعدے کے مطابق اور اصل کے لحاظ سے مونث اسم کے ساتھ مونث اور مذکر کے ساتھ مذکر استعمال کرتے ہیں لکھنؤ والے اس کو مصدر سمجھتے ہیں اور ہر حال میں بصورت مذکر کھانا لانا بولتے

ہیں۔ یہ ان کی اپج سہی لیکن اصلیت سے دور ہے۔

لکھنؤ کی زبان پر اودھی اثرات کا یہ مختصر سا جائزہ ہے۔ اردو دلی کی زبان ہے۔ دلی والے ہی دراصل اہل زبان ہیں جس طرح وہ بولتے یا لکھتے ہیں وہ سند ہے، میر انیس ایسے ہی موقع کے لئے فرمایا کرتے تھے:۔

"یہ میرے گھر کی زبان ہے، حضرات لکھنؤ یوں نہیں بولتے۔"

لکھنؤ کی زبان

(۲)

میں نے لکھا تھا کہ اردو دہلی اور میرٹھ کی زبان ہے۔ یہیں اس نے جنم لیا اور یہیں نشو و نما پایا۔ لکھنؤ اس کا وطن نہیں۔ یہ وہاں امیروں، شریفوں اور شاعروں کے ساتھ پہنچی۔ لکھنؤ اور اس کے آس پاس کا علاقہ اودھی (پوربی) اور اس کے حلقے کی دوسری بولیوں کا علاقہ ہے۔ یہاں کے عوام کی زبان اس زمانے میں اردو نہ تھی (انہی کو میر نے "پورب کے ساکنو" کہہ کر خطاب کیا تھا) اس پر میں نے ذیل کی تفریعات کی تھیں۔

(۱) اردو تذکیر و تانیث کے باب میں کسی قدر نرم ہے اس لئے لکھنؤ والوں میں تذکیر و تانیث کا شعور دہلی والوں کے برابر نہیں۔ بنگال کا حال بھی یہی ہے۔ یہاں بقول غالب "ہتھنی آئی" کو "ہتھنی آیا" کہتے ہیں۔

(۲) حرف "نے" اودھی میں نہیں اس لئے اس کے ترک و اختیار میں لکھنؤ والوں سے اکثر لغزش ہوئی ہے۔

(۳) اردو میں "ہی" تاکید و حصر کے لئے ہے۔ اودھی میں اس کا روپ "ہیں"

ہے۔ اہل لکھنؤ "انہی" کو "انہیں" اور "ہمی" کو "ہمیں" کہتے ہیں۔ یہ اودھی کا اثر ہے۔ اس بحث کے بعد یہ نتیجہ نکالا گیا تھا کہ دہلی والے ہی دراصل اہل زبان ہیں جس طرح وہ بولتے یا لکھتے ہیں وہ سند ہے میر انیس مرحوم کا یہ قول نقل کر کے۔ "یہ میر کے گھر کی زبان ہے۔ حضرات لکھنؤ یوں نہیں بولتے" زبان دانان لکھنؤ کو انتباہ کیا گیا تھا کہ اگر کسی لفظ یا محاورے یا استعمال میں لکھنؤ اور دہلی کا اختلاف ہوا تو خود فصحاء لکھنؤ نے بھی دہلی کی زبان کو فصیح سمجھا اور لکھنؤ کی زبان پر اسے ترجیح دی۔

اردو نے دہلی میرٹھ اور اس کے نواح میں جنم لیا اس کو فن کے سبھی ماہروں نے مانا ہے۔ میں صرف دو حوالوں پر اکتفا کروں گا۔

(۱) اردو اصل کے اعتبار سے مغربی ہندی کی ایک شاخ ہے جو صدیوں تک دہلی اور میرٹھ کے نواح میں بولی جاتی رہی (تاریخ ادب اردو سکسینہ مقدمہ ص۲)

(۲) جس زبان سے اردو ارتقا پاتی ہے وہ نہ برج ہے نہ ہریانی اور نہ قنوجی۔ بلکہ وہ زبان ہے جو صدیوں تک دہلی اور میرٹھ کے نواح میں بولی جاتی رہی ("پنجاب میں اردو" پروفیسر محمود شیرانی مقدمہ ص۲)

امراء اور شرفا کے ساتھ اردو لکھنؤ پہنچی یہ بھی مانی ہوئی بات ہے۔

مولانا نظم طباطبائی کے افادات سے دو اقتباس درج کئے جاتے ہیں۔

(۱) اصل یہ ہے کہ اہل لکھنؤ کی زبان دونوں جگہ بولی جاتی ہے جس کو دہلی کے تمام امراء و شرفاء اپنے ساتھ لے کر لکھنؤ آئے تھے۔

(۲) حقیقت امر یہ ہے کہ لکھنؤ کی جو زبان ہے یہ دلی ہی کی زبان ہے ۱۱۵۲ھ سے ۱۱۷۰ھ اٹھارہ برس کے عرصے میں تین دفعہ دلی تاراج و برباد ہوئی، وہاں

کے لوگ فیض آباد و لکھنؤ میں صفدر جنگ و شجاع الدولہ کے ساتھ آئے تھے۔[1]

سید انشاء نے بھی یہی کہا ہے۔

"در لکھنؤ از سبب قرب تمام شاہجہاں آبادیاں فصیح وغیر فصیح جمع شدہ اند و ایں شہر جہاں آباد شدہ است۔ لکھنؤ نماندہ است"

اُردو دہلی کی زبان ہے جیسے دہلی والے اپنے ساتھ لے کر لکھنؤ گئے۔ بجا اور درست! لیکن لکھنؤ کی اپنی زبان کیا ہے جو اس وقت لکھنؤ میں بولی جاتی تھی میں نے عرض کیا کہ لکھنؤ کی اپنی زبان پوربی ہے۔ جب اردو لکھنؤ پہنچی یہ گھروں میں راج کرتی تھی۔ بازاروں میں اس کا سکہ چلتا تھا۔ دربار میں اردو بولنے والوں کے گھروں میں بھی پوربی ہی بولی جاتی تھی۔

اُردو ان لوگوں کی زبان تھی جو دہلی سے آئے۔ لیکن لکھنؤ میں صرف یہی شرفاء تو نہ تھے۔ وہاں کے اصلی باشندے یعنی بقول میر پورب کے ساکن بھی تھے۔ یہ پوربی بولتے تھے اور ان کے ساتھ دہلی سے جانے والے صاف اور شستہ اُردو میں بات نہ کر سکتے تھے۔ اس لئے پوربی زبان کے بہت سے الفاظ اور محاورے گونا دانستہ سہی ان کی زبان پر چڑھ گئے اور لکھنؤ کی شاخ اپنے اصل یعنی دہلی کی اُردو سے ذرا ہٹ گئی۔ اثر صاحب فرماتے ہیں۔ بالکل غلط! انشا نے دریائے لطافت میں لکھا ہے اور یہ ان کا چشم دید بیان ہے کہ "در لکھنؤ تمام شاہجہاں آبادیاں جمع شدہ اند" لکھنؤ میں تمام شاہجہاں آبادی جمع ہو گئے ہیں اس کا مطلب یہ کیسے اور کس منطق سے ہوا کہ لکھنؤ میں کوئی لکھنؤ والا نہ رہا، سب مر کھپ گئے۔ دہلی ساری اُٹھ کر لکھنؤ چلی آئی۔ اور لکھنؤ والے لکھنؤ چھوڑ کر بھاگ گئے یہاں تک کہ سارا شہر ان کے

---

[1] بحوالے "نگار" اپریل ۱۹۶۳ء سے لئے گئے ہیں۔

وجود سے خالی ہوگیا۔ ان میں سے کوئی بات صحیح نہیں۔ سید انشا بتاتے ہیں کہ لکھنؤ اس وقت بھی پورب والوں سے آباد تھا۔

"یہاں والے (لکھنؤ کے وہ باشندے جو دہلی سے آ بسے) اس بات کا بہت خیال رکھتے ہیں کہ ہم پورب میں ہیں کہیں ایسا نہ ہو کہ یہاں کے آدمیوں (لکھنؤ کے اصلی باشندوں) کی زبان کی عادت پڑ جائے (دریائے لطافت ص۶۷)

اور دیکھئے "ان سے یہ کہنا ہے کہ وہ لکھنؤ میں پیدائش کے باوجود اپنے کو دہلوی سمجھیں اور وہاں کے قدیم باشندوں کو پوربی" (ص ۱۱۴)

لکھنؤ کے اصلی باشندے ہر لحاظ سے پورب کے ہیں۔

"ان کے ہر چھوٹے بڑے کی پوربی اصل ٹپکی پڑتی ہے خواہ وہ تمام جملہ پورب کی زبان میں ادا کریں خواہ شاہ جہاں آباد کی صحبت کے اثر سے اپنے وطن شریف کے بعضے الفاظ ترک کر دیں" ص۱۲

انھوں نے دہلی سے جانے والوں پر اثر ڈالا اور ان کی زبان بدل گئی گو خفیف ہی سہی۔

"ان کی (یعنی لکھنؤ کے ان باشندوں کی جو دہلی سے لکھنؤ آ بسے) زبان ایک دو لفظوں میں دہلویوں سے مغایرت رکھتی ہے" ص۶۷

ساری دہلی لکھنؤ اٹھ کر نہیں آئی بلکہ چند اونچے گھروں کے لوگ آئے

"افلاس کی وجہ سے بہت سے اونچے گھروں کے لوگ اور فصیح اشخاص مدت ہوئی دار الخلافہ (دہلی) سے نکل آئے ہیں اور پورب کے شہروں میں آباد ہو گئے ہیں" ص۶۷

اثر صاحب فرماتے ہیں: "دیہاتیوں کی زبان پر شہر والوں کے الفاظ چڑھ جاتے ہیں نہ کہ شہر والوں کی زبان پر دیہاتی بولی قبضہ جمائے" میں اسکا

مطلب نہیں سمجھا۔ یہاں شہر اور دیہات کی زبان کا کیا سوال ؟ سوال اُردو اور اودھی کا ہے۔ جب یہ دو زبانیں سرزمین لکھنؤ میں ملیں تو ایک نے دوسری کو متاثر کیا۔ کچھ اس نے اس سے لیا اور کچھ اس نے اِس سے۔

اس بنیادی بحث کے بعد تفریعات کو لیجیے۔ میں نے عرض کیا تھا کہ اہل لکھنؤ تذکیر و تانیث کا صحیح اور فطری شعور نہیں رکھتے۔ لکھنؤ کا تعلق اودھی سے ہے جو بقول ڈاکٹر بابو رام سکسینہ[1] جنس کے باب میں کسی قدر نرم ہے۔ لکھنؤ والوں کا اس کوچے میں آکر بھٹک جانا تعجب کی بات نہیں۔

(۱) بہت سے الفاظ دہلی میں مذکر ہیں۔ لکھنؤ والے ان کو مؤنث بولتے ہیں اور اس کے برعکس مؤنث کو مذکر کہتے ہیں۔

(۲) عربی مؤنث الفاظ کی جمع کو وہ مذکر بتاتے ہیں۔

(۳) مذکر الفاظ کی جن کے آخر میں حرف صحیح ہے، فاعلی حالت میں جمع نہیں بنائی جاتی۔ اہل لکھنؤ "یں" لگا کر ان کی جمع بنا لیتے ہیں۔ جیسے برس سے برسیں۔ شعر سے شعریں وغیرہ۔

(۴) "نا" (علامت استقبال) اردو میں منصرف ہے جو قاعدے کے مطابق مذکر میں "نا" اور مؤنث میں "نی" ہو جاتی ہے۔ جیسے مجھے روٹی کھانی ہے۔ اسے سبق پڑھنا تھا۔ اہل لکھنؤ ہر حالت میں "نا" کہتے ہیں۔

ان میں سے عربی مؤنث الفاظ کی بابت اثر صاحب نے لکھا کہ "یہ متاخرین اہل لکھنؤ کی اپج ہے اور میرے ہوش کی بات ہے۔ میں خود ان لوگوں میں ہوں جو اس قاعدے کی سختی سے پابندی نہیں کرتے۔" ظاہر ہے کہ اس کا

---

[1] مسٹر بابو رام سکسینہ پروفیسر سنسکرت و پراکرت الہ آباد یونیورسٹی جنھوں نے اودھی پر ایک تحقیقی مقالہ "اودھی کا ارتقا" تحریر فرمایا ہے

مطلب اس کے سوا کیا تھا کہ اہل لکھنؤ کی یہ حرکت بے جا ہے۔ اسے ترک کر دینا چاہیے۔ چنانچہ میں نے ان کی فراخ دلی کو سراہا اور اعتراف حق پر انکو مبارکباد دیتے ہوئے لکھا۔ کیا اچھا ہو کہ وہ لکھنؤ کی دوسری بدعتوں سے بھی اسی طرح بیزار ہو جائیں۔ اس پر اثر صاحب خفا ہیں۔ فرماتے ہیں۔ واہ صاحب! میں نے یہ کب کہا کہ میں بالکل پابندی نہیں کرتا۔" میں نے صرف اتنا کہا ہے کہ سختی سے پابندی نہیں کرتا۔" من چہ می سرایم و طنبورہ من چہ می سراید"۔ اسی کا نام ہے۔" لیکن بندہ پرور! میں نے کہاں لکھا کہ آپ بالکل پابندی نہیں کرتے میں نے تو یہ لکھا ہے کہ آپ اسے اپج بتاتے ہیں اور پسند نہیں فرماتے۔ یعنی اس سے بیزار ہیں۔ اگر آپ اسے پسند فرماتے اور اس سے بیزار نہ ہوتے تو آپ اسے لکھنؤ والوں کی اپج نہ قرار دیتے۔ اور سختی کے ساتھ اس کی پابندی بھی فرماتے۔

"نا" علامت مصدر و استقبال کے بارے میں بھی صحیح اور سچی بات یہ ہے کہ حضرت اثر نے مان لیا ہے کہ یہ حضرت جلال لکھنوی کی اپج ہے۔ تمام فصحاء لکھنؤ اس پر متفق نہیں۔

مذکر اسماء کے باب میں حضرت اثر نے عجیب و غریب روش اختیار کی، نورالحسن صاحب ہاشمی کو جواب دیتے ہوئے" شاعر" اکتوبر ۱۹۵۶ء میں لکھا۔ "ہاشمی صاحب فرماتے ہیں کہ لکھنؤ میں برس کی جمع برسیں ہیں حالانکہ صحیح جمع برسوں ہے۔ صرف ایک جملے میں جو عوام بولتے ہیں" برسیں ہو گئیں" برسیں آیا ہے۔ اس میں بھی غور کیجئے تو برسیں برس کی جمع نہیں برسوں کی تانیث ہے" اس کے بعد معارف میں صاف انکار کر دیا کہ میں نے کسی ثقہ کو برسیں اور شعر میں بصیغۂ جمع بولتے نہیں سنا۔ لفظ کی جمع لفظیں بیشک مستعمل ہے لیکن وہ مؤنث

ہے۔" میں نے اس پر دو اعتراض کئے۔

(۱) زبان بھی کوئی روایت حدیث ہے۔ یہاں تو عوام ہی سب کچھ ہیں انہی کے دربار سے لفظوں کو چلن ملتا ہے۔ اگر لکھنؤ کے عوام برسیں بولتے ہیں تو آپ یہ کیسے کہتے ہیں کہ میں نے کسی ثقہ کو برسیں بولتے نہیں سنا۔

(۲) اگر "برسیں" "برسوں" کی تانیث ہے تو عورتیں بھی عورتوں کی تانیث ہونی چاہیے۔"

تذکیر و تانیث الفاظ کے سلسلے میں اثر صاحب کا اعتراض تھا کہ اہل دہلی بھی تو بعض الفاظ کی تذکیر و تانیث میں اختلاف رکھتے ہیں۔ یہ کیوں ہے؟ میں نے اس کے تین جواب دیئے۔ یہ اختلاف گنے چنے لفظوں میں ہے۔ دوسرے لفظ کے مختلف معنی کے اعتبار سے ہے۔ مثلاً سانس آہ کے معنی میں مؤنث ہے۔ تیسرے یہ زمانے کا اختلاف ہے۔ آج سے پہلے ایک لفظ مذکر تھا آج مؤنث ہے۔ اس بحث کا نچوڑ یہ تھا کہ اہل دہلی کا الفاظ کی تذکیر و تانیث میں اختلاف کچھ اور نوعیت کا ہے اس لئے اہل لکھنؤ کے مقابلے میں ہیچ ہے اور نہ ہونے کے برابر ہے۔ اس پر اثر صاحب نے سید احمد دہلوی کے رسالہ مرقع زبان و بیان سے چند الفاظ لکھے ہیں جن کی تذکیر و تانیث میں دہلی کے اہل قلم کا اختلاف ہے۔ یہ بھی گنے چنے لفظ ہیں یعنی کل سات ہیں۔ دوسرے اثر صاحب یہ بھول گئے کہ ان الفاظ کی نوعیت "لفظ" اور "مالا" جیسی نہیں۔ "لفظ" کسی منطق سے بھی مؤنث نہیں اور "مالا" میں الف تانیث کا ہے۔ اسے مذکر کیسے کہا جا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں یہ بھی پیش نظر رہتا تو اچھا تھا کہ دہلی میں یہ اختلاف اس وقت رونما ہوا جب بقول حضرت اثر لکھنؤ میں نفیس اور دل پذیر اختراعات کی ٹکسال قائم ہوئی اور یہاں کے ڈھالے ہوئے کھوٹے سکے چھپواں چوری دہلی کے

اردو بازار میں چلائے گئے۔ مولانا طباطبائی کا ارشاد ہے کہ ورے اور پرے کے باب میں میں نے داغ سے تحقیق چاہی تو انہوں نے کہا آپ لوگوں کی خاطر سے میں نے ان لفظوں کو ترک کر دیا ہے۔

لفظ چھپوائی چوری پر ممکن ہے اثر صاحب ناک بھوں چڑھائیں لیکن یہ ایک حقیقت ہے جس سے انکار ممکن نہیں۔ اس کا انکشاف فصیح الملک حضرت داغ نے خود کیا ہے۔ مولانا طباطبائی فرماتے ہیں کہ میں نے اہل دہلی کی تحریر و تقریر میں "طرز" بتذکیر دیکھا ہے۔ "نگار" میں اس پر ایک حاشیہ دیا ہے جس میں داغ کا یہ مصرعہ اس کے ثبوت میں پیش کیا گیا ہے "طرز اپنا ہے جدا سب سے جدا کہتے ہیں" اس مصرعے کی حقیقت خود داغ کی زبانی سنئے۔ وہ ایک استفسار کے جواب میں لکھتے ہیں: "یہ لکھنو والوں نے اصلاح دے کر چھاپا ہوگا۔ میں نے جو اس وقت آفتاب داغ دیکھا تو اس میں " طرز اپنی ہے جدا" لکھا ہے۔ طرز مؤنث ہے ہرگز مذکر نہیں (انشائے داغ ص ۱۳۵)

میر نے حشر، گلزار اور خواب کو مونث نظم کیا ہے اور آج یہ الفاظ بالاتفاق دہلی میں مذکر ہیں۔ اس سے میرے تیسرے جواب کی توثیق ہوتی ہے کہ بعض الفاظ کی تذکیر و تانیث میں اختلاف امتداد زمانے کی وجہ سے ہے۔ بقول حضرت اثر

"بدلتے ہوئے زمانے کے ساتھ زبان میں بھی تغیرات ہوتے رہے"

میں نے لکھا تھا کہ سانس آہ کے معنی میں مونث ہے جیسا کہ ظفر کے اس مصرعے میں: "ٹھنڈی ٹھنڈی جو کوئی سانس ہے آتی جاتی" اس پر حضرت اثر نے طنز کیا ہے آہ بھی سانس کی طرح آتی جاتی ہے۔ جی ہاں! آہ سانس کی حالت کا نام ہے۔ سرد یا گرم۔ یہاں سانس کو ٹھنڈا کہا گیا ہے۔ اور یہ شان آہ کی ہے۔ آہیں بھرنا اور ٹھنڈی ٹھنڈی سانسیں لینا کیا کبھی حضرت اثر نے نہیں سنا۔ سانس کی مناسبت سے

آنا جانا ہے اور آہ کی نسبت سے ٹھنڈا ہونا۔ غالب کا مصرعہ ہے "ضعف سے گریہ مبدل بہ دمِ سرد ہوا۔"

حضرت اثر نے مالا کی تذکیر کی جو وجہ بتائی ہے اس سے اس خیال کی تائید ہوتی ہے کہ لکھنؤ کی زبان محدود بھی ہے اور مصنوع بھی۔ لکھنوی ادیب اور شعراء نے زبان کو خانہ ساز سمجھ رکھا ہے۔ وہ موم کی ناک ہے جس طرف چاہا موڑ لیا اور جیسا چاہا اس میں تصرّف کر دیا۔ میرا اعتراض تھا کہ اہل لکھنؤ مالا اور پوجا وغیرہ الفاظ کو مذکر بولتے ہیں۔ شاید اس لئے کہ ان کے آخر میں الف ہے حالانکہ ان کلمات میں الف تانیث کا ہے اور اس کا سب سے اچھا قرینہ یہ ہے کہ اُردو میں الف علامت تذکیر غیر فاعلی حالت میں (یعنی جب اسم کے بعد کوئی حرف معنوی ہو) "ے" ہو جاتا ہے۔ جیسے بگلا اُڑ رہا ہے اور بگلے کے پر سفید ہوتے ہیں۔ اگر مالا اور پوجا کا الف علامت تذکیر ہوتا تو غیر فاعلی حالت میں "ے" ہو جاتا اور اس مالا کی قیمت کیا ہے۔ اس جملے کو یوں کہا جاتا اس مالے کی قیمت کیا ہے۔

اثر صاحب کے نزدیک شعرائے لکھنؤ نے لفظ "مالا" کو مونث استعمال کرنے سے اس لئے اجتناب کیا ہے کہ مذکر کی حالت میں "مالے" جمع بآسانی بن جاتی ہے۔ مونث کی حالت میں مالائیں جمع ہوگی جس میں نصف رکن بڑھ جاتا ہے۔

لکھنؤ کی زبان اگر یہی ہے کہ جس نے چاہا اپنی آسانی کے لئے کسی رکن سے ایک لفظ کاٹ کر کم کر دیا اور جس نے چاہا تحسین کلام کے لئے ایک رکن بڑھا دیا۔ تو پھر اس کے مصنوع ہونے میں کیا شبہہ رہا۔

اس بحث کے سلسلے میں اثر صاحب نے اہل لکھنؤ کے ذوق تذکیر و تانیث کا ثبوت اس طرح پیش کیا تھا کہ انھوں نے اس کے متعلق کتابیں تصنیف کیں اور اصول مقرر کئے۔ آپ نے کیا کیا؟ میں نے جواب دیا کتابیں تصنیف کرنا اور اصول

مقرر کرنا اس بات کی دلیل نہیں کہ کتابیں لکھنے والے اور اصول مقرر کرنے والے تذکیر و تانیث کا صحیح فطری ذوق رکھتے ہیں۔ بلکہ اس کے برعکس یہ اس بات کی علامت ہے کہ یہ لوگ "تذکیر و تانیث کی تمیز میں اصول اور قاعدوں کے محتاج ہیں۔ اس پر حضرت اثر نے کیسی پر مزہ بات کہی ہے:" جو لوگ اصول سے واقف نہیں وہ اصول بھی منضبط کرتے ہیں۔" بغیر اصول کے مذکر و مونث میں تمیز نہیں کر سکتے اور اصول سے ناواقف ہیں کیا دونوں باتیں ایک ہوئیں اصول منضبط کرنا ہرگز اس امر کا ثبوت نہیں کہ اصول بنانے والے زبان کا فطری ذوق رکھتے ہیں یعنی اہل زبان ہیں۔ اکثر اجنبی لوگوں نے یہ اصول منضبط کئے ہیں۔

اور سنیئے۔ مارچ کے معارف میں مجھ سے پوچھا جا رہا تھا کہ آپ نے (دہلی والوں نے) کیا کیا؟ اور اب ارشاد ہوتا ہے کہ انشا دہلوی نے دریائے لطافت لکھی۔ مولوی سید احمد دہلوی نے فرہنگ آصفیہ لکھی۔ تذکیر و تانیث کے اصول بنائے۔ کیا انہوں نے جھک مارا؟ ہرگز نہیں۔ جھک انہوں نے مارا ہوگا جنھوں نے ان بزرگوں کے کارناموں پر خاک ڈالنا چاہی یا جنھوں نے یہ سمجھا کہ اہل زبان لغت یا گرامر لکھا ہی نہیں کرتے۔ اہل زبان نہ گرامر کے محتاج ہوتے ہیں اور نہ لغت کے۔ اثر صاحب اپنے تئیں "اہل زبان" سمجھتے ہیں۔ جبھی تو فرماتے ہیں:" میں زبان کے لئے لغت کا محتاج نہیں۔" (ملاحظہ فرمائیں معارف اگست ص ۱۴۱) جب آپ لغت کے محتاج نہیں۔ میں لغت کا محتاج نہیں تو آپ ہی بتائیں سید احمد دہلوی نے فرہنگ آصفیہ اور نور الحسن کاکوروی نے نور اللغات کس کے لئے لکھی اور کیوں لکھی

تذکیر و تانیث کے بعد "نے" کی بحث آتی ہے۔ یہ سب جانتے ہیں کہ اودھی میں "نے" نہیں۔ یہ خاص اردو کی چیز ہے (پنجابی اور گجراتی میں بھی یہیں سے گیا ہے) اہل لکھنؤ اکثر اس کے استعمال میں غلطی کرتے ہیں۔ "بولنا" کی ماضی کے ساتھ کوئی

لفظ (جھوٹ یا جملہ وغیرہ) بطور مفعول ہو تو "نے" آنا چاہیے۔ اہل لکھنؤ ترک کر دیتے ہیں اور "اس نے جھوٹ بولا" کو "وہ جھوٹ بولا" کہتے ہیں۔ "پڑھنا" متعدی ہے اس کو بھی یہاں کے فصحا "نے" کے بغیر استعمال کرتے ہیں اور اس نے خوب پڑھا کی جگہ "وہ خوب پڑھا" کہتے ہیں۔ اثر صاحب گھبرائے ہوئے ہیں اور باوجود "وہ من عقل وبیک من علم" ان سے اس کا جواب نہیں بن پڑ رہا ہے۔ مارچ کے معارف میں انھوں نے یہ بے سروپا بات لکھی تھی کہ فرق دراصل "وہ" اور "اس" کا ہے "وہ" کے ساتھ "نے" آ ہی نہیں سکتا۔ جب انھیں بتایا گیا۔ اجی حضرت یہ کیا؟ "وہ" سے آپ کو کیا محبت ہے "اس" کہیے اور اس کے ساتھ "نے" لائیے تو جھٹ اس تنکے کا سہارا چھوڑ مولوی عبد الحق صاحب دہلوی کا دامن پکڑ لیا۔ فرماتے ہیں مولوی صاحب نے وہ جھوٹ بولا کو بھی صحیح بتایا ہے۔ مولوی عبد الحق صاحب کے نزدیک صحیح اور فصیح "اس نے جھوٹ بولا" ہے۔ آپ کی خاطر سے انھوں نے "وہ جھوٹ بولا" کو بھی صحیح لکھ دیا۔ آخر داغ نے بھی تو آپ کا دل رکھنے کے لئے ورے اور پرے کو ترک کر دیا تھا۔ آپ فصاحت کے بڑے پارکھ ہیں۔ بتلایئے آپ کسے فصیح سمجھتے ہیں اور کیوں؟

حضرت آزاد نے کہیں لکھنویوں کا یہ محاورہ ان کے لفظوں میں نقل کر دیا تھا کہ "جب کوئی (لکھنوی) آکر تعریف کرتا ہے کہ آج (میر انیس) فلاں مجلس میں کیا خوب پڑھے ہیں تو انہیں (میر خلیق کو) خوش نہ آتا تھا" اثر صاحب مولانا آزاد کے اس نقل "کفر" کو ان کے سر تھوپ کر فرماتے ہیں کہ پہلے اپنے بزرگوں سے مواخذہ کیجیے۔ مواخذہ تو میں اس وقت کروں جب مجھے معلوم نہ ہو کہ نقل کفر کفر نہ باشد۔

ترک "نے" کی تیسری مثال لیجیے۔ آپ نے اپنے تنقیدی مضامین میں ایک مقام پر لکھا ہے۔

"فراق صاحب نے ان سب کا قلع قمع کر دیا اور یہ نہ سوچے کہ سجدے میں الخ"
(اثر کے تنقیدی مضامین ص ۱۳۱)

یہاں "یہ نہ سوچے" غلط ہے" (انھوں نے) یہ نہ سوچا" چاہیے۔ اثر صاحب نے "اس نے" کی جگہ "وہ" فرض کر کے سوچے لکھا۔ کیا اب بھی وہ اس سے انکار کریں گے کہ لکھنوی زبان اودھی زدہ ہے اور اس پر اودھی کی کئی تہیں چڑھی ہوئی ہیں۔

"ہمیں" اور "تمھیں" کا جب کوئی جواب اثر صاحب سے نہ بنا تو میر و غالب کا سہارا لیا اور فرمایا کہ دہلی کے ان شعرا نے بھی "ہمیں" اور "تمھیں" باندھا ہے۔ میں نے جواب دیا بالکل غلط شعرا! "ہمی" اور "تمھی" (بغیر غنہ) لکھا۔ آپ نے "ہمیں" اور "تمھیں" پڑھا اور اپنی اس غلطی کو ان کے سر تھوپ دیا۔ میر کے آپ چاہنے والوں میں ہیں۔ اس نے "تم ہی" اور "ہم ہی" (بغیر غلط ہی) لکھا ہے "ہم ہی فارغ ہوئے شتابی سے"

یا اب چمن میں بلبل ہم ہی رہیں گے یا تو

غلط "ہی" کے بعد "تم ہی" "تمھی" ہوا اور "ہم ہی" "ہمی" "ن" (غنہ) کہاں سے ٹپک پڑا۔ ہاں! میر مہدی نے لکھنوی شعرا کے تتبع میں "ہمیں" لکھا تھا۔ اس کا کوئی اعتبار نہیں۔ اثر صاحب کو چاہیے تھا کہ متقدمین شعرائے دہلی کے ہاں اس کا استعمال دکھاتے۔ اس کی جگہ بہادر شاہ ظفر کا ایک شعر شہادت میں لاتے ہیں جن کی بابت خود ان کی رائے ہے کہ پنجابی ان کی زبان پر چڑھی ہوئی تھی۔ جس کی زبان پر پنجابی چڑھ سکتی ہے لکھنؤ کی اودھی زدہ زبان کیا اس پر سوار نہیں ہو سکتی۔

مولوی عبد الحق صاحب کے بارے میں میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ انھوں نے جو قواعد لکھی ہے وہ صرف دہلوی زبان کی نہیں بلکہ لکھنوی زبان کی بھی ہے اس میں انھوں نے وہ چیزیں بھی درج کر دی ہیں (کہیں بتصریح اور کہیں بغیر تصریح) جو لکھنوی زبان کے اختراعات یا بدعات میں شامل ہیں۔ تحقیق اور چیز ہے۔ میں پوست کندہ حقیقت بیان کر رہا ہوں اور آپ کے لسانی تصرفات کی قلعی کھول رہا ہوں۔ آپ

اگر اس میدان کے مرد ہیں تو آئیں اور طبع وقاد کے جوہر دکھائیں۔

ایک ضمنی بحث بھی آگئی تھی میں نے لکھا تھا کہ دہلی کی اردو دکن اور گجرات پہنچکر بدل گئی تھی۔ زبان کی فطرت ہے کہ وہ پردیسی زبانوں سے اثر لیتی ہے اور جہاں کہیں کچھ دیتی ہے وہاں لیتی بھی ہے۔ چنانچہ دکنی اردو کو گجراتی اور مرہٹی نے متاثر کیا اور لکھنوی اردو کو اودھی نے۔ دکنی اردو ولی دکنی کے ساتھ یا اس سے کچھ پہلے دہلی پہنچی۔ دہلی کے شعراء حاتم، آبرو، فغاں وغیرہ نے اول اول اس زبان میں شعر کہے اس وقت ان کے سامنے اردو شاعری کا کوئی نمونہ نہ تھا۔ اس کے بعد حاتم کو اس کا احساس ہوا۔ ولی دکنی کی تقلید میں جو بگڑی ہوئی زبان خاص شعراء کے طبقے میں اس وقت رواج پاگئی تھی اس کی اصلاح کا انھوں نے بیڑا اٹھایا۔ حاتم کے اس اصلاحی کام کو میر، مظہر اور مرزا نے جاری رکھا اور ناسخ نے انجام کو پہنچایا اس پر اثر صاحب نے پہلے بغیر سوچے سمجھے لکھا "کیا خوب! یہ بالکل جدید انکشاف ہے کہ ولی کا کلام دہلی۔ کے مصلحین زبان کی اصلاح سے مزین ہے اگر یہ حقیقت ہے تو دکن سے کس شاعری کا غلغلہ بلند ہوا تھا اور کس چیز پر لوگ لوٹ پڑے تھے" میں نے جواب دیا کہ مصلحین زبان نے ولی کے کلام کی اصلاح کی یہ آپ کی خوش فہمی ہے۔ ان مصلحین نے اس دکنی آمیز زبان کو سنوارا تھا جو ولی کے اثر سے دہلی کے شعراء میں رواج پاگئی تھی اور ساتھ ہی شاعری اور زبان کا فرق بتا کر لکھا کہ دہلی والوں کو ولی کی شعری اداؤں نے لبھایا تھا۔ زبان کی اجنبیت اور اس کے خاص خاص الفاظ اور استعمالات کے باوجود دہلی کے اداشناسوں کے لئے اس میں بڑی دلچسپی کا سامان تھا۔ میر کہتے ہیں

خوگر نہیں کچھ یونہی ہم ریختہ گوئی کے
معشوق جو تھا اپنا باشندہ دکن کا تھا

اس مرتبہ پھر اثر صاحب نے اس قضیہ کو اٹھایا ہے۔ فرماتے ہیں پہلی مرتبہ ۱۷۰۰ء میں ولی دہلی آئے تھے تو شاہ سعد اللہ گلشن نے انھیں مشورہ دیا تھا کہ ریختہ بطرز فارسی گویاں موزوں کرو۔ دوبارہ ۱۷۲۲ء میں جب گئے تو اپنا کلام ساتھ لائے اس میں فارسی الفاظ و تراکیب کی آمیزش تھی اس آمیزش نے دہلی والوں کو اردو غزل گوئی کی طرف مائل کیا اس کے بعد ارشاد ہوا ہے۔

"دہلی والوں نے ولی کی اس زبان کا تتبع کیا جو سعد اللہ گلشن کے امتثال امر میں اختیار کی گئی تھی۔ اس میں فارسی کا امتزاج تھا۔ اور یہ دہلی کی بول چال کے مطابق تھی"

اس میں ذیل کے اہم نقطوں کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔

(۱) ولی کی زبان اگر فارسی آمیز تھی اور دہلی کی بول چال کے مطابق بھی تو دہلی والوں نے ولی کی زبان کا تتبع کیا اس کا کیا مطلب؟ یوں کہیے انھوں نے اپنی زبان کا تتبع کیا۔ تذکرہ بے جگر میں ہے "بہ تتبع زبانش ہم زباں شدند"

(۲) ولی اپنا پرانا کلام (۱۷۰۰ء سے پہلے کا) کہاں چھوڑ آئے؟ اس کا کیا ثبوت ہے کہ دہلی والے اس پر ٹوٹ نہ پڑے۔

(۳) ولی نے ۱۷۰۰ء کے بعد فارسی آمیز زبان میں شعر کہے لیکن اسکے باوجود خالص اردو الفاظ انھوں نے دکنی زبان اور محاورے کے مطابق استعمال کیے۔

(۴) اس دور کے کلام میں ولی نے منے (میں) سیتی۔ سوں (سے) تیں (تو) مجھ کا (میرا) تس (اس) وغیرہ الفاظ استعمال کیے ہیں۔ یہ دکنی زبان کے ہیں۔

ولی سے پہلے شمالی ہندوستان میں دکنی اردو کا رواج ہو گیا تھا۔ اور یہاں

کے شعرا اس زبان میں شعر کہتے تھے۔ محمد افضل جھنجھانہ ضلع مظفر نگر کے ہیں ۱۶۲۵ء کے لگ بھگ انھوں نے ایک نظم بکٹ کہانی کے نام سے لکھی۔ اس کے متعلق فرانسیسی عالم دی تاسی کا قول پہلے نقل ہو چکا ہے کہ اس نے یہ نظم دکن کی اردو میں لکھی اس لئے کہ اس وقت اس کے سامنے شاعری کا کوئی نمونہ نہ تھا۔ اور ریختہ مقبول نہیں ہوا تھا۔ (اردو جلد سوم ص۵۱۷)

اس میں ذیل کے کلمات دکنی اردو کے ہیں۔

سیتی۔ سوں۔ (سے) منیں (میں) مجھ (مجھ کو) لاہی (لگی) تیں (تو) اجھوں لگ (اب تک) اپس کوں (اپنے کو)

قائم کا یہ شعر بھی میں پہلے لکھ چکا ہوں۔

قائم میں غزل طور کیا ریختہ ورنہ ایک بات لچرسی بزبانِ دکنی تھی

اثر صاحب کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ دکنی الفاظ کو دہلی والوں نے کس طرح قبول کر لیا اور نامانوس ہونے کے باوجود یہ ان کے دل میں کیسے گھر کر گئے۔ اس کا جواب قائم کی زبانی سنئے۔

"از عہد عبداللہ قطب شاہ گرفتہ تا زمانہ بہادر شاہ اول کسانے کہ شعر ریختہ گفتہ اند نسق کلام آنہا بسیار مربوط و معقول است ہر چند اکثر الفاظ غیر مانوس گوش ما حردم مستعمل الیشان است لیکن چونکہ موافق زبان دکن راست و درست است پیش ہمہ کس راہ بہ بود دارد۔" (مخزن نکات ص۱۳)

فرماتے ہیں کہ ہر چند یہ الفاظ دہلی کے محاورے کے خلاف ہیں لیکن زبان دکن کے موافق ہونے کی وجہ سے کانوں کو ناگوار نہیں ہوتے۔ اس کے بعد اثر صاحب کیا کہیں گے۔ اب تو یہ راہ بھی بند ہوئی۔

اثر صاحب کو اس سے بھی انکار ہے کہ حاتم اور ان کے رفقا نے دکنی الفاظ

اور محاورے استعمال کیے۔ وہ کہتے ہیں۔ واہ صاحب! یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ بیس پچیس برس تک ان کو یہ احساس نہ ہوا کہ "ہم جس زبان میں شعر کہہ رہے ہیں، وہ ہماری زبان کے روزمرہ کے خلاف ہے۔"

بات یہ ہے کہ ان حضرات نے دکنی الفاظ اور محاورے جان بوجھ کر استعمال کیے۔ انھیں اس کا احساس تھا کہ یہ دہلی کی زبان کے خلاف ہیں لیکن بقول قائم "زبان دکن کے موافق راست اور درست" سمجھتے اس لئے انھوں نے ان کو گوارا کر لیا اور جب تک ولی کا اثر رہا گوارا کرتے رہے لیکن جونہی یہ سحر ٹوٹا اور ان کے جوش عقیدت میں کمی آئی ان کا یہ احساس کہ وہ عوام اور خواص کے درمیان ایک خلیج حائل کر رہے ہیں زور پکڑ گیا اور حاتم و مظہر اصلاح زبان کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔

حاتم و آبرو وغیرہ نے اپنے قدیم کلام میں بہت سے کلمات و حروف استعمال کئے ہیں جو ٹھیٹ دکنی ہیں۔ یہ ولی کے ساتھ اور اس کے زیر اثر یا اس سے کچھ پہلے دہلوی شعراء کے یہاں آئے اور بعد میں حاتم اور مظہر جان جاں نے ان کے خلاف جہاد کیا اور ان کو اردو زبان سے نکالا۔ اس کے بہت سے قرینے ہیں کہ یہ الفاظ عوام شاہجہاں آبادیوں کی زبان پر نہ تھے۔ صرف شعراء اپنے کلام میں باندھتے تھے۔ اثر صاحب زبردستی انھیں اردوئے معلی کے سر منڈھے دے رہے ہیں۔ انشا نے دریائے لطافت میں میر و مرزا کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"انھوں نے کئی نامعقول الفاظ ترک کر دیے ہیں۔ جیسے "منے" بمعنی "میں" پہلے یہ لفظ شعروں میں آتا تھا، جیسا کہ میاں آبرو نے کہا ہے ؎

بر منے جامہ نہ تھا اک جھول تھی"

اس کے بعد یہ الفاظ ہیں :۔

"ریختہ کے باغ کو عیبوں کے کانٹوں اور کوڑے کرکٹ سے صاف کرنے والے یہی اصحاب ہیں۔ اس سے کیا ہوا کہ "سے" کے بدلے "سیتی" اور میرے دل کی بجائے "مجھ دل" مرزا رفیع کے کلام میں ملتا ہے۔" (صفحہ ۱۰۶)

"گلشن گفتار" میں حاتم کی ایک مثنوی ہے یہ "دیوان زادہ" میں نہیں اس میں حاتم نے ذیل کے دکنی الفاظ اور محاورے استعمال کئے ہیں (فہرست مکمل نہیں)

سیں۔ سیتی (سے) مجھ تن (میرا بدن) تج آستاں (تیرا آستاں) ست آپ سیں (ترک خودی کر) برہ (جدائی)

اس ساری بحث سے ذیل کے نتیجے برآمد ہوتے ہیں۔

(۱) مندرجہ بالا الفاظ اور محاورے دکنی اُردو کے ہیں اور دکنی شعرا کے یہاں استعمال ہوئے ہیں۔

(۲) متقدمین شعراء دہلی یعنی آبرو، حاتم اور میر و مرزا نے بھی انھیں استعمال کیا ہے

(۳) یہ دہلی کی عام زبان اور روزمرہ میں نہ تھے۔ صرف شعرا کی زبان پر تھے۔

(۴) ہمارے شعرا نے دکنی شعرا کی تقلید میں ان لفظوں کو استعمال کیا اور اس کے بعد انہی الفاظ اور محاورات کے خس و خاشاک سے باغ اُردو کو صاف کرنے کے لئے اصلاح زبان کی تحریک کا آغاز ہوا۔

اثر صاحب ہمارے شعرا کی اصلاحی تحریک کو مانتے ہیں۔ انھیں اعتراف ہے کہ زبان شعر کی اصلاح کا کام شاہ حاتم نے شروع کیا جسے میر و مرزا نے جاری رکھا اور تکمیل ناسخ نے کی ۔۔ لیکن زبان میں دکنی الفاظ کی آمیزش کی بنا پر اصلاح زبان کا آغاز ان کے نزدیک ایک افسانہ ہے۔ فرماتے ہیں۔

"بدلتے ہوئے زمانے کے ساتھ زبان میں تغیرات ہوتے رہے۔ اس اصول سے کوئی زبان بری نہیں۔"

زبان میں بدلتے ہوئے زمانے کے ساتھ اگر تغیرات ہوتے رہے۔ یعنی زبان کے کچھ الفاظ اور محاورے زمانے کی الٹ پھیر کے ساتھ خود بخود متروک ہوتے رہے تو ان کو ترک کرنے یا زبان میں اصلاح کرنے کا مطلب؟ آپ کہتے ہیں کہ زبان شعر کی اصلاح کا کام شاہ حاتم نے شروع کیا اور اسی سانس میں آپ یہ بھی فرماتے ہیں کہ بدلتے ہوئے زمانے کے ساتھ زبان میں بھی تغیرات ہوتے رہے۔ انصاف فرمایئے آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ دنیا بیوقوفوں سے تو آباد نہیں۔ آپ صاف صاف کہیے کہ جن الفاظ اور محاورات کا اوپر ذکر ہوا اور جنھیں انشا نے کوڑا کرکٹ بتایا وہ اس زمانے کی دہلوی زبان میں رائج تھے۔ یعنی عوام و خواص سب انھیں بولتے تھے یا صرف شعرا کی زبان پر تھے۔ اگر پہلی صورت تھی تو انھیں کوڑا کرکٹ بتاکر زبان سے کیوں صاف کیا گیا اور شاہ حاتم اور دوسرے مصلحین شعرا کا یہ استبدادی فعل زندہ زبان کے کس اصول پر صحیح بیٹھتا ہے؟ کیا یہ ممکن ہے کہ دو چار آدمی مل کر کسی زبان کے ذخیرے سے چند الفاظ نکال باہر کریں اور وہ نکل جائیں۔ یعنی دوسرے اہل زبان بھی ان کو چھوڑ دیں اثر صاحب نے یہ تو دیکھ لیا کہ شیکسپیر کے وقت کی انگریزی سے آج کل کی انگریزی بہت مختلف ہے لیکن انھوں نے یہ نہ بتایا کہ انگریزی میں حاتم اور مظہر کا کام کس نے انجام دیا اور اصلاح زبان کی تحریک وہاں کب اور کیسے شروع ہوئی۔

اور اگر دوسری صورت تھی تو پھر یہ الفاظ شعرا کی زبان پر کہاں سے آئے یہ الفاظ دکنی زبان میں تھے اور دکنی شعرا کا کلام دہلوی شعرا کا دل موہ چکا تھا۔ سیدھی سی بات ہے۔ ہمارے شعرا نے ہو بہو اس کی تقلید کی اور یہ الفاظ ان کے

کلام میں راہ پا گئے - دکنی الفاظ کی دہلوی شعراء کی زبان میں آمیزش افسانہ نہیں حقیقت ہے۔ ان میں سے چند الفاظ کا ذکر میں اوپر کر چکا ہوں۔ یہی الفاظ ہیں جن کے خلاف ہمارے شعراء نے جہاد کیا۔ برصغیر ہند و پاکستان کے مسلمانوں میں اس وقت دو عالم ہیں جو زبان کے مسئلوں سے واقفیت رکھتے ہیں۔ ایک محترمی ڈاکٹر عبدالستار صاحب صدیقی۔ دوسرے ڈاکٹر محی الدین صاحب قادری زور۔

زور صاحب اس مسئلے میں میرے ہم خیال ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں۔

"اول اول دکنی طرز کی پیروی کی گئی ...... دکنی طرز کی پیروی ان کے لئے غیر فطری تھی ...... اب انھوں نے اس بات کی کوشش کی کہ اپنی روزمرہ کی زبان میں فارسی اجزاء کی آمیزش کر کے شعر لکھیں ...... یہ تحریک کامیاب ہو گئی اور بہت جلد اردوئے معلی کی زبان میں شعر و شاعری ہونے لگی۔ اس رجحان کا آغاز جان جاں نے کیا اور اس کی ترقی ناسخ تک جاری رہی۔ حاتم نے اس تبدیلی کا ذکر اپنے "دیوان زادہ" کے دیباچے میں کیا ہے" (ہندوستانی ۳۲ء صـ۳۲۶)

"دیوان زادہ" کی اس عبارت کا میں نے اردو میں ترجمہ کر دیا تھا۔ اثر صاحب کو شکایت ہے کہ میں نے اس میں تحریف کی۔ ایک تو "دکنی الفاظ" قوسین میں اپنی طرف سے اضافہ کیا۔ دوسرے "اکثر الفاظ" کا ترجمہ "ان الفاظ" کیا۔ اثر صاحب کی شکایت بے جا ہے۔ انھوں نے "دیوان زادہ" کا اصل دیباچہ نہیں پڑھا۔ آب حیات میں دیباچے کی جو عبارت منقول ہے اس کے متعلق ڈاکٹر زور کی رائے ہے کہ وہ اصل دیباچہ ہے جس کا مخطوطہ لندن کے کتب خانے میں ہے اور جو خود حاتم کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے کئی امور میں مختلف ہے۔ میں نے ڈاکٹر

لہ ملاحظہ فرمائیے رسالہ ہندوستانی ۳۲ء صـ۹۶

اشپرنگر کی فہرست مخطوطات کتب خانہ اودھ کا حوالہ دیا تھا۔ اثر صاحب اس کو دیکھ لیتے تو کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہوتے۔ ان کا اعتراض "دکنی الفاظ" پر ہے۔ ان کا خیال ہے کہ حاتم نے در۔ بر۔ از وغیرہ الفاظ و حروف کی طرف اشارہ کرکے کہا۔

"از دہ دوازدہ سال اکثر الفاظ را از نظر انداختہ"

یہ غلط ہے۔ اثر صاحب نے دیباچے کی عبارت اس طرح نقل کی ہے

"ولفظ در۔ بر و از والفاظ و افعال دیگر کہ در دیوان قدیم خود تقید دارد درینولا از دہ دوازدہ سال اکثر الفاظ را از نظر انداختہ"

ڈاکٹر اشپرنگر کی فہرست میں یہ عبارت اس طور سے ہے اور یہی صحیح ہے۔ "ولفظ در و برو از و اوکہ فعل و حرف باشد بندہ در دیوان قدیم خود تقید دارد"

اس کے بعد وہ عبارت ہے جو اوپر نقل ہوئی۔ پہلی عبارت میں لفظ در، بر وغیرہ کا تعلق "از نظر انداختہ" سے ہے۔ دوسری عبارت میں "از نظر انداختہ" بالکل الگ ہے۔ اشپرنگر کی منقولہ عبارت کا لفظی ترجمہ یوں ہوا "در۔ بر۔ از" وغیرہ فارسی فعل اور حرف بندے نے قدیم دیوان میں استعمال کئے ہیں۔ دس بارہ سال سے اکثر الفاظ نظر انداز کرکے عربی اور فارسی زبان کے الفاظ جو قریب الفہم بھی ہیں اور کثیر الاستعمال بھی اور روز مرہ دہلی جس میں میرزایان ہند و فصیحان رند بات چیت کرتے ہیں اختیار کر لیا ہے" سوال یہ ہے کہ "اکثر الفاظ" جنھیں حاتم نے نظر انداز کیا ہیں، اثر صاحب کو اصرار ہے کہ از۔ در۔ بر وغیرہ ہیں۔ میں کہتا ہوں یہ بھی ہیں اور دکنی الفاظ بھی۔ اس کے دو بڑے قرینے ہیں۔ ایک تو نظر انداز کرنے کے بعد جو اختیار کئے گئے وہ عربی و فارسی کے کثیر الاستعمال الفاظ ہیں، اور روز مرہ دہلی۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ پہلے ان کی جگہ ہندی بھاشا کے

کے الفاظ اور دکنی روزمرہ نے لے رکھی تھی۔ حاتم نے ان کو ترک کیا۔ دوسرے اسکے بعد ہی یہ عبارت ہے۔

"زبان ہر دیار تا بہندی کہ آنرا بھاکا گویند موقوف نمودہ فقط روزمرہ کہ عام فہم و خاص پسند بودہ اختیار کردہ" (اشپرنگر ص ۲۱۱ و ہندوستانی سے ۳۲ ص ۴۳)

یہ عبارت بہت واضح ہے۔ حاتم کہتے ہیں۔ میں نے ہر ملک کی زبان یہاں تک کہ ہندی بھاکا تک موقوف کر کے فقط روزمرہ جو عام فہم بھی ہے اور خاص پسند بھی اختیار کر لیا ہے۔ یہاں "ہندی بھاکا" سے دکنی الفاظ مراد ہیں۔ یہ الفاظ زیادہ تر ہندی کے ہیں۔ "زبان ہر دیار" سے ظاہر ہوتا ہے کہ دکن، برج وغیرہ علاقوں کی زبان کے خاص خاص الفاظ اور محاورے ترک کر دئے گئے "عام فہم" اس طرف اشارہ ہے کہ اجنبی زبان کے نامانوس الفاظ عوام کے فہم سے باہر تھے۔ اثر صاحب نے جو عبارت نقل کی وہ ناقص ہے۔ اس میں "ہر دیار" نہیں۔ اور "تا بہندی" کو ہندی لکھا ہے۔ کیا دیانت کا تقاضا یہی تھا کہ کٹی پھٹی اور مخدوش عبارت آب حیات سے نقل کر دی جائے اور اصلی ماخذ کو نظر انداز کر دیا جائے۔

ڈاکٹر زور کے سامنے "دیوان زادہ" کا صحیح اور مکمل نسخہ تھا۔ اس کے دیباچے کا آخری جملہ ہے۔

"دیوان زادہ" میں قدیم یعنی دکنی طرز کے اشعار میں نے درج نہیں کئے ہیں۔ اگر کوئی مل جائے تو مجھے معاف کریں۔

اشپرنگر نے اسے اس طرح نقل کیا ہے۔ "اگر اتفاقاً در اشعار دیوان جدید (؟) بر غذ ما صفا و دع ما کدر نمودہ از خطا درگزرند"۔ اشعار دیوان جدید کے بعد میں نے استفہامیہ نشان دیا ہے۔ یہاں سے کچھ الفاظ چھوٹ گئے ہیں اور غالب خیال یہ ہے

کہ یہ وہی الفاظ ہیں جن کا ترجمہ ڈاکٹر زور نے "دکنی طرز کے اشعار" کیا ہے۔

اثر صاحب نے آخر میں دریائے لطافت سے چند اقتباسات پیش کر کے یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ پنجابی زبان نے دہلی کی اُردو کو متاثر کیا۔ وہ بھول جاتے ہیں کہ:۔

(۱) انشاء کے نزدیک اُردو کئی زبانوں سے مل کر بنی ہے۔ جن میں عربی، فارسی کے ساتھ ترکی اور پنجابی بھی ہے۔

(۲) پنجابی، پوربی یا دکنی کے جو الفاظ و محاورات زبردستی اُردو میں ٹھونسے گئے اور ان میں کھپ نہ سکے اہل دہلی نے ان کو نکال باہر کیا۔ یہی اردو کی اصلاحی تحریک ہے۔

(۳) پنجابی، ہریانی اور اردو (کھڑی) بہنیں بہنیں ہیں۔ پوربی اردھ ماگدھی گھرانے کی ہے۔ اردو کا پوربی سے کیا تال میل۔

(۴) دہلوی اردو اس زبان کا نام ہے جو قلعہ مبارک شاہی سے لے کر ملکۂ آفاق کی حویلی تک اور چتلی قبر سے ترکمان دروازے اور دہلی دروازے تک بولی جاتی ہے۔ یہ علاقہ ایک ضلع کی برابر ہے اور بقول انشا "یہاں کے در و دیوار سے فصاحت برستی ہے"۔

"مرقع زبان دہلی" سے حضرت اثر نے ایک عبارت نقل کی ہے۔ جس میں عورتوں کی خاص زبان اور مردوں کی زبان کا فرق دکھایا گیا ہے اور اس کے بعد مجھ سے دریافت کیا ہے۔

"پروفیسر صاحب جو عوام کی زبان کا دم بھرتے ہیں ایسی زبان کو سرمایۂ ناز جانتے ہیں جس کا کوئی معیار ہی قائم نہ تھا"۔

مختلف طبقات کی زبان مختلف ہوتی ہے۔ کچھ محاورے، عورتیں استعمال کرتی ہیں اور کچھ ایسے ہیں جو مردوں کے ساتھ خاص ہوتے ہیں۔ یہ ہر زبان میں

ہوتا ہے اس سے زبان کے معیار پر اثر نہیں پڑتا۔ دہلوی زبان کی یہ خوبی ہے کہ اس میں عوام و خواص کی زبان کا وہ فرق نہیں جو لکھنؤ کی زبان میں ہے۔ میر ناصر علی خاں دہلوی نے لکھا ہے۔

"دہلی اور لکھنؤ کی زبان میں جو فرق میرے ذہن میں آیا یہ ہے کہ دہلی میں سقہ جو نل پر مشک بھر رہا ہے دوسرے سقے سے جس زبان میں باتیں کر رہا ہے اسی زبان میں لال قلعہ تک باتیں سنتے چلے آئے۔ اس لئے دہلی کی زبان میں بے تکلفی ہے۔ لکھنؤ میں خواص کی زبان اور ہے عوام کی زبان اور (بحوالہ داستان تاریخ اردو ص۱۳۸)

اثر صاحب کی زبان میں لکھنوی اور دہلوی کا مفہوم بھی واضح نہیں وہ ناسخ اور انیس کو لکھنوی سمجھ کر خوش ہیں اور مجھے طعنہ دیتے ہیں کہ زبان کی اصلاح کا سہرا ناسخ لکھنوی کے سر ہے اور انیس لکھنوی ہے لیکن آپ اسے اُچک لینا چاہتے ہیں۔ ہرگز نہیں! ناسخ اور انیس اثر صاحب کو مبارک رہیں۔ میں انھیں اچکتا نہیں اپناتا ہوں اور اثر صاحب کو بھی اپنانے کے لئے تیار ہوں۔ لیکن ایک شرط کے ساتھ۔ ان بزرگوں کی طرح وہ بھی دہلی کی زبان کا دم بھریں۔ دہلی یہاں کسی جگہ کا نام نہیں۔ ایک دبستان فکر ہے۔ ایک لسانی مرکز ہے۔ آپ جہاں چاہیں رہیں لیکن دہلی کی مرکزیت کے قائل ہوں۔ آپ دہلوی ہیں۔ سید انشا نے بھی دہلوی کے یہی معنی بتائے ہیں۔

"دہلوی وہ ہے جس کا روزمرہ وہ ہو جو دہلی والوں کا ہے اور جگہ والوں کا مانا ہو" (ص۶۲)

لکھنؤ سے دہلی کی رقابت کل کی بات ہے۔ انیسویں صدی کے آخر تک فصحائے لکھنؤ خود دہلی کی زبان کا تتبع کیا کرتے تھے اور کسی محاورے کی صحت پر

ان کا قول سند لاتے تھے، "اگر کوئی ان پر معترض ہوتا تھا کہ فلاں لفظ اردو محاورے کے خلاف ہے تو یہ جواب دیتے تھے کہ فلاں میر صاحب جو شاہ جہاں آباد میں شاہ بولا کے بڑ کے نزدیک رہتے تھے یہ لفظ گفتگو میں اکثر استعمال کیا کرتے تھے۔"
(دریائے لطافت ص ۱۱۵)

میر انیس جب تک بقید حیات رہے دہلی کی زبان کا دم بھرتے رہے۔ انھوں نے اپنے گھر میں لکھنؤ کی اودھی زبان کو قدم رکھنے نہ دیا۔

میں نے اثر صاحب کی تحریر میں زبان و بیان سے متعلق کچھ غلطیاں دکھائی تھیں۔ ان میں سے دو انہوں نے کاتب کے سر منڈھ دیں۔ فرماتے ہیں۔ میں نے "بغلیں جھانکنے کے سوا کچھ نہ بن پڑے" لکھا تھا۔ کاتب نے "سواء" کی جگہ "واسطے" لکھ دیا۔ "متاثر کرتے ہیں" یہ بھی کتابت کی غلطی ہے۔ اس کا بیّن ثبوت یہ ہے کہ دوسرے مقام پر "متاثر کہتے ہیں" صاف صاف درج ہے۔ چلئے بات ختم ہوئی۔ طویلے کی بلا بندر کے سر۔ لیکن کیا میں اثر صاحب سے پوچھ سکتا ہوں کہ میرے دسمبر کے مقالے میں صفحہ ۴۴ پر کاتب نے "آس پڑوس" لکھا تھا اور صفحہ ۴۸ پر بقول آپ کے صاف صاف "آس پاس" درج تھا۔ آپ نے یہ کیوں نہ سمجھا کہ "آس پڑوس" غلط الکاتب ہے اور آپ "بددیانتی" پر کیوں اتر آئے۔

"اُمنڈ کر لکھنؤ میں آباد ہو گئے" میرا اعتراض تھا کہ اُمنڈ کر آباد ہونا ممکن نہیں۔ اُمنڈ کر کہیں جاتے ہیں پھر آباد ہوتے ہیں۔ اثر صاحب اسے پست فقرہ بازی بتاتے ہیں۔

اثر صاحب نے لکھا تھا، "لکھنؤ کی اُردو کو اودھی کا پروردہ ثابت کرنے کو فرماتے ہیں" اس میں "کو" کی تکرار سخت ناگوار تھی۔ میں نے اس کی اصلاح کردی

اثرؔ صاحب فرماتے ہیں۔ "ایک جملے میں لفظ 'کو' کا دو مرتبہ آنا کوئی گناہ نہیں"۔ ادب کی شریعت میں کسی لفظ کی تکرار اگر ذوق سماعت پر بار ہے اور آسانی کے ساتھ اس سے اجتناب کیا جا سکتا ہے تو وہ معمولی گناہ نہیں "اثم کبیر" ہے۔ اثرؔ صاحب نے اس گناہ کا ارتکاب اس جملے میں بھی کیا ہے۔

"پروفیسر صاحب نے "کو" کی تکرار بچانے کو اپنے ایک جملے میں ایک 'کو' کو 'یا' سے بدل دیا ہے"

اور ایک ستم اور ڈھایا ہے۔ وہ یہ کہ "تکرار بچانے کو" سے آپ کی مراد ہے تکرار سے بچنے کو۔ تکرار عیب ہے اور اس سے بچتے ہیں۔ عزیز سمجھتے تو بچاتے اثرؔ صاحب کے جملے میں "کو" کی تکرار کانوں کو ناگوار ہے۔ اس سے بآسانی اجتناب کیا جا سکتا تھا۔ ملاحظہ فرمائیں۔

"کو" کی تکرار بچانے کو" اسے یوں لکھئے۔ "کو" کی تکرار سے بچنے کے لئے" ایک "کو" "کو" "یا" سے بدل دیا ہے۔ یہ یوں ہوتا ایک "کو" 'یا' سے بدل دیا ہے۔ "اردو کو اودھی کا پروردہ ثابت کرنے کو" اس طرح ہوتا "اردو کو اودھی کا پروردہ ثابت کرنے کے لئے"۔

اردو میں مصدر کے بعد "کو" بمعنی کے لئے ہوتا ہے۔ یہ عام اصول ہے۔

"سمونا" پر میرا اعتراض تھا کہ یہ متعدی ہے۔ آپ نے لازم استعمال کیا۔ "سمونا" اور "سمانا" ایک ہی مادے سے ہیں۔ پہلا متعدی ہے اور دوسرا لازم۔ اس کے جواب میں فرماتے ہیں "سمویا ہوا" کے ایک معنی مخلوط النسل کے بھی ہیں۔ ہوا کریں۔ اس سے کیا ہوتا ہے۔ اس کا استعمال بطور متعدی ہونا چاہئے اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے "جب ہندی پنجابی میں سموگئی تو زبان مخلوط ہو گئی۔ خود بخود "سموگئی" یا کسی نے سمویا۔ پہلی صورت لازم کی ہے۔ یہ غلط ہے۔ دوسری

صورت متعدی کی ہے "سمویا ہوا" (بمعنی مخلوط النسل) متعدی ہے۔ اس کے معنی ہیں جس میں آمیزش کر دی گئی ہو۔ "سمو گئی" غلط ہے۔ یہ ماضی ہے اس کے معنی ہیں حل گئی یا خلط ملط ہو گئی۔ اثر صاحب کمال کرتے ہیں۔ "سمویا ہوا" اور "سمو گئی" کو ایک بتاتے ہیں۔ "سمویا ہوا" کا ہم معنی ہے "سمو دیا گیا" "پانی سمو گیا" ہم نے نہیں سنا۔ پورب کے لوگ بولتے ہوں گے۔ ہم "پانی سمو دیا گیا" کہتے ہیں۔ یہی صحیح ہے اور آپ کے مطاع صاحب نور اللغات نے بھی اس کو متعدی بتایا ہے۔

پچھلا میرے خیال میں "دُم چھلّا" یا "پچھلّا" ہونا چاہیے۔ فرماتے ہیں نور اللغات میں پچھلّا لکھا ہے۔ گویا نور اللغات وحی آسمانی ہے۔ آپ نے بقول خود صاحب نور اللغات سے متعدد مقامات پر اختلاف کیا اور مجھ سے ایسی بات منوانا چاہتے ہیں جو کسی نے نہیں لکھی۔ پچھلّا بمعنی "دم چھلّا" نہ پلیٹس نے لکھا ہے نہ فیلن نے، نہ جلال لکھنوی نے، اور نہ سید احمد دہلوی نے اور صحیح پوچھو تو نور اللغات میں "پچھلّا" "دم گزا" کے معنی میں ہے۔ یہ پچھ (دم) اور الّ (پراکرت میں الحاقی کلمہ ہے) سے مرکب ہے اور اسم ہے۔ دم چھلا (دم۔ چھلّا) اور پچھلا (پن مخفف پونچھ + چھلا) اس سے مختلف ہیں۔ اصل لغت کے اعتبار سے ان کے معنی ہیں۔ چھوٹی سی چیز (چھلا = سنسکرت کشلّک) جو دم یا پونچھ میں باندھی جائے۔ مجازاً ان کے معنی ہوئے تابع اور مصاحب۔ پچھلا ہریانی یا برج کے زیر اثر پنچھالا ہوا (جیسے مٹی ماٹی بنی) سودا نے پنچھالا لکھا ہے۔ لیکن آج فصحا کی زبان پر پچھلا ہے (جیسے دم چھلا۔ دم چھالا کوئی نہیں کہتا) صاحب نور اللغات نے بھی یہی لکھا ہے۔ وہ فرماتے ہیں اب زبانوں پر پچھلا ہے (پچھلا کتابت کی غلطی ہے)۔ یہ مانتے ہیں کہ لغت کی کتابوں میں ڈھول جھونکنا درج نہیں۔ خاک جھونکنا

ہے۔ لیکن اس پر بھی اس کی صحت پر اصرار ہے فرماتے ہیں کہ "ہم نے خاک کا مرادف دھول لاکر مزید تنوع پیدا کر دیا" یہ حق آپ کو ہے۔ ہمیں نہیں۔ حالانکہ ہم اہل زبان ہیں۔ ہم پڑوس کے ساتھ اُس لگاکر تنوع پیدا کریں تو مطرود ہوں اور آپ اہل زبان کے محاورے میں تصرف کرلیں تو جائز ہو اور تنوع پھوٹ پڑے۔

بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بوالعجبی ست

میرا اعتراض تھا کہ "کس برتنے پر تتا پانی صحیح نہیں" اس برتے پر کہیے۔ اس پر اثر صاحب خوش ہیں۔ فرماتے ہیں آپ کے مطلع غالب دہلوی نے لکھا ہے۔ اس زمانے میں بولا جاتا ہو گا۔ آج اس "برتے پر تتا پانی" کہتے ہیں اور یہی صحیح ہے۔ "جامع اللغات" میں بھی اسی طرح ہے۔ غالب نے "چھٹویں" لکھا۔ کیا آپ یہ بھی مجھ سے منوائیں گے۔ میں اندھی تقلید کا قائل نہیں۔

اثر صاحب نے "عامی" کو عوامی کے معنی میں استعمال کیا تھا۔ میرے ٹوکنے پر اس طرح گوہر فشاں ہیں۔

"بات یہ ہے کہ یک من علم را دہ من عقل باید لہٰذا پڑھے لکھے جاہلوں اور عوام کو ایک ہی لاٹھے سے ہانکتے ہیں"

دہ من عقل کہاں سے لاؤں کہ اس جملے کا مطلب پاؤں۔ اتنی بات اثر صاحب کو بتائے دیتا ہوں کہ اس میں "پڑھے لکھے غلط ہے" "پڑھے لکھوں" چاہیے اس لئے کہ اس کے بعد "کو" حرف مغیرہ ہے۔

بحث بہت بڑھ گئی۔ میں داغ کے اس شعر پر اسے ختم کرتا ہوں۔

نہیں کھیل اے داغ یاروں سے کہہ دو
کہ آتی ہے اردو زباں آتے آتے

لکھنؤ کی زبان

(۳)

اثر صاحب یہ مانتے ہیں کہ :-

"زبان اُردو کا آغاز دہلی سے ہوا اور وہاں سے ہندوستان کے باقی حصوں میں پھیلی"

لیکن یہ ماننے کے لئے تیار نہیں کہ :-

"لکھنؤ کی اُردو اودھی سے متاثر ہے"

اگر حضرت اثر یہ بتانے کی زحمت گوارا فرماتے کہ دہلی کی اُردو جب لکھنؤ پہنچی تو اس وقت لکھنؤ میں کونسی زبان بولی جاتی تھی تو میرا خیال ہے بحث اتنی نہ بڑھنے پاتی اور اثر صاحب کو مان لینا پڑتا کہ لکھنوی اردو اودھی سے متاثر ہے۔ یہ اس لئے کہ لکھنؤ کی اپنی زبان اودھی ہے جو اُردو کے داخلے کے وقت وہاں بولی جاتی تھی اور جو بعد میں بھی باشندگانِ لکھنؤ کی ایک بڑی تعداد کی کم سے کم بول چال اور روزانہ کاروبار کی زبان رہی۔ اثر صاحب نے شروع میں اس سے انکار کیا کہ لکھنؤ کی اپنی زبان اودھی ہے اور دریافت فرمایا کہ جو لوگ دربار میں اُردو بولتے تھے ان کے گھروں

میں اودھی کیسے بولی جاتی تھی۔ میں نے جواب دیا اُردو دہلی سے جانے والے بولتے تھے۔ لکھنؤ کے اصلی باشندوں کی زبان اودھی تھی۔ جواب ملا۔ بالکل غلط۔ انشاء اللہ خاں کہتے ہیں "لکھنؤ میں سب دلی والے جمع ہیں" میں نے عرض کیا۔ اچھا اگر یہ مان لیں کہ دہلی والے سب اٹھ کر لکھنؤ چلے آئے۔ تب بھی لکھنؤ کے باشندے تو لکھنؤ میں رہے۔ یہ پوربی (اودھی) بولتے تھے۔ ان کی اس زبان کا لکھنؤ کی اردو پر اثر پڑا اور پڑنا چاہیئے تھا۔ اثر صاحب اس ساری بحث کو نظر انداز کر کے اور انشا کی عبارات سے صرف نظر فرما کر لکھتے ہیں:۔

"پروفیسر صاحب کا یہ دعویٰ از اول تا آخر بے دلیل اور تاریخی شواہد کے خلاف ہے کہ لکھنؤ میں اُردو زبان چند گھرانوں تک محدود تھی۔ باقی باشندگانِ شہر کی زبان اودھی تھی حیرت کا مقام ہے کہ اردو لشکری اور بازاری زبان ہونے کی وجہ سے ہندوستان بھر میں تو پھیل جائے۔ صرف بد قسمت لکھنؤ اس کے فیض سے محروم رہے۔"

اور انسائیکلو پیڈیا برٹینکا کے اس اقتباس کو:۔

"پورے خطہ ہندوستان کے شہروں کے باشندوں کی بالخصوص زبان ہے جس میں فارسی الفاظ اور جملوں کا ذخیرہ ہے اور جو فارسی رسم الخط میں لکھی جاتی ہے۔"

اپنے قول کا موید ٹھہرا کر شکایت فرماتے ہیں کہ پروفیسر صاحب نے اس تحریر کو ناقابلِ اعتنا سمجھا اور اس کی تردید میں ایک حرف سپردِ قلم نہیں کیا۔ اثر صاحب کی شکایت بے جا ہے۔ ان کی تحریر قابل اعتنا نہ تھی اور شاید اسی لئے میں نے ان کی اس حیرت پر کہ ہندوستان بھر میں اُردو پھیل جائے اور بد قسمت لکھنؤ اس کے فیض سے محروم رہے" معارف۔ مئی ۱۹۵۲ء کے

صفحہ ۳۰۴ پر بقول ان کے اپنے غم و غصہ کا اظہار کیا۔

"یہ کون کہتا ہے کہ اردو لکھنؤ کی نہ ہوئی (یعنی لکھنؤ اس کے فیض سے محروم رہا) ہوئی اور ایسی ہوئی کہ اس پر لکھنؤ کی آب و ہوا، تہذیب و تمدن، بول چال، مزاج و منہاج، رنگ و آہنگ ہر چیز کی ایک گہری چھاپ لگ گئی۔"

اب وہ اس بات کو دہراتے ہیں تو پھر سن رکھیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ اردو لکھنؤ نہیں گئی۔ یا لکھنؤ اس کے فیض سے محروم رہا یا اب لکھنؤ میں اردو نہیں بولی جاتی۔ میں شروع ہی سے کہہ رہا ہوں کہ اردو دہلی اور میرٹھ کی زبان ہے۔ (اثر صاحب فرماتے ہیں انھیں اس سے اتفاق ہے) یہ جس طرح ہندوستان کے دوسرے حصوں میں دہلی والوں کے ساتھ گئی۔ اسی طرح لکھنؤ بھی پہنچی۔ ان حصوں کی اصلی زبان اردو نہ تھی۔ وہاں دوسری بولیاں رائج تھیں جو اردو کے پہنچنے کے بعد یک بیک نہیں مٹیں، بلکہ کچھ عرصہ تک رائج رہیں۔ اس لئے ارتقاء زبان کے عام اصول کے مطابق اردو نے ان بولیوں سے اثر لیا۔ دکن میں وہ گجراتی اور مرہٹی سے متاثر ہوئی۔ پنجاب میں پنجابی سے، سندھ میں سندھی سے، بنگال و بہار میں بنگالی اور بہاری سے اور لکھنؤ میں اودھی سے مثلاً اگر پنجابی کہتا ہے کہ "میں نے گھر جانا ہے۔" اور اسے اردو بتاتا ہے تو دکھنی میں کہے " بولنے پر اصرار کرتا ہے۔ میں نے لکھنؤی اردو میں اودھی اثرات کا کھوج لگانے کے بعد لکھا کہ لکھنوی انشاپرداز کا " میں جھوٹ بولا" یا " وہ خوب پڑھے" کہنا اور اس کی صحت پر اصرار کرنا "پوربیاپن" ہے۔ یہ جملے دہلی کی زبان اور روزمرہ کے خلاف ہیں۔

انسائیکلوپیڈیا کی عبارت سے میرے خیال اور رائے کی تردید ہرگز نہیں ہوتی۔ میں نے گزشتہ زمانے کا ذکر کیا تھا۔ اس عبارت میں حال کا ذکر ہے۔ میرا کہنا تھا کہ اردو جب لکھنؤ پہنچی (۱۷۷۵ء میں یا اس سے کسی قدر پہلے) تو وہاں اودھی بولی جاتی تھی۔ انسائیکلوپیڈیا کے مقالہ نگار کا کہنا ہے کہ آج (۱۹۵۵ء)

میں جب یہ مقالہ قلم بند ہوا) بڑے بڑے شہروں کی زبان (اکثریت کی زبان جیسا کہ آئندہ کے حوالوں سے ثابت ہوگا) اردو ہے۔

اثر صاحب نے جو عبارت نقل کی ہے وہ مجھے انسائیکلوپیڈیا کے نویں ایڈیشن میں نہیں ملی۔ اس میں پلیٹس نے "ہندوستانی" کے عنوان سے ایک مقالہ لکھا ہے جس میں کئی باتیں اثر صاحب کے منشا اور خواہش کے خلاف ہیں۔ ایک تو یہ صحیح نہیں کہ پورے خطِ ہندوستان میں شہروں کے باشندوں کی زبان اردو ہے جیسا کہ اثر صاحب کا خیال ہے بلکہ اس کے برخلاف اس میں ہے "ہندوستانی (اردو) عام طور سے تمام بڑے شہروں میں تعلیم یافتہ طبقے کے لوگ بولتے ہیں ہندو ہوں یا مسلمان" اس کا صاف اور سیدھا مطلب یہ ہے کہ عوام الناس یعنی ان پڑھ اور عامی اردو نہیں بولتے۔ وہ کوئی دوسری مقامی بولی یا بگڑی ہوئی اردو بولتے ہیں۔ دوسرے "وہ زبان جس میں فارسی الفاظ اور جملوں کا ذخیرہ ہے اور جو فارسی خط میں لکھی جاتی ہے صرف اردو نہیں بلکہ اودھی بھی ہے جسے مسلمان بولتے ہیں۔ اس میں فارسی الفاظ کی قریب قریب اتنی ہی کثرت ہے جتنی بول چال اردو میں اور اردو کی طرح یہ بھی فارسی حروف میں لکھی جاتی ہے" تیسرے پلیٹس کے بقول اردو عوامی بولی سے بہت مختلف ہے "یہ عوامی بولی مذکورہ علاقے کے بعض حصوں میں مہذب زبان (اردو) سے (عربی و فارسی ذخیرہ الفاظ سے قطع نظر) کچھ یونہی سی مشابہت رکھتی ہے۔"

اب مختصر طور سے وہ دلائل ملاحظہ فرمائیں جن سے لکھنؤ کے چند اونچے گھرانوں کو چھوڑ کر باقی باشندگانِ شہر کی زبان کا پوربی ہونا ثابت ہے۔

(۱) اردو کا آغاز دہلی سے ہوا اور یہ وہاں سے لکھنؤ پہنچی۔ لکھنؤ اودھ میں ہے۔ جہاں اودھی بولی جاتی ہے۔ اردو کے لکھنؤ پہنچتے ہی لکھنؤ کی زبان (اودھی) نہ مٹ سکی (نہ مٹ سکتی تھی) اردو کے پہلو بہ پہلو بازاروں اور گلیاروں میں اس کا

سکہ بھی چلتا رہا۔

(۲) میر انشاء اللہ خاں کے زمانے تک لکھنؤ میں پوربی (اودھی) کا چلن تھا۔ ان کا بیان ہے :-

(الف) باشندگانِ اینجا (لکھنؤ) می دانند کہ ما در پورب سکونت داریم نہ شود کہ زبان سکنہ اینجا یاد گیریم (صـ۳۶)

(ب) بعضے صاحبان از کثرت صحبت ساکنان آں شہر (لکھنؤ) چند لفظ مخالف اردو نیز استعمال می کنند (صـ۲)

اگر اس زمانے میں لکھنؤ میں پوربی کا رواج نہ تھا تو اردو بولنے والوں کو یہ خطرہ کیسے ہوا کہ پوربی بولی ان کی زبان پر قبضہ نہ جما لے اور ان کی صحبت میں مخالف اردو الفاظ ان کی زبان پر کیسے آئے۔

اہل لکھنؤ کے بارے میں انشاء نے یہاں تک لکھا ہے۔

"از گفتگوئے خرد و بزرگ ایشاں (باشندگان لکھنؤ) اصالت پورب می بارد۔ خواہ تمام جملہ را بزبان پورب ادا کنند خواہ از صحبت شاہجہاں آبادیاں بعضے الفاظ وطن شریف ترک نمایند (صـ۷)"

(۳) گریرسن نے ہندوستان کی بولیوں کا جائزہ لیا ہے وہ لکھتا ہے :-

(الف) بہار کے بعض حصوں میں مسلمانی اودھی بولی جاتی ہے۔ یہ زبان لکھنؤ کے سابق مسلمانی کورٹ کی ایک دلچسپ یادگار ہے۔ (لسانی جائزہ جلد ۶ صـ۹)

(ب) شہر لکھنؤ کی عام اور بڑی زبان اردو ہے۔ (" " صـ۱۵)

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ گذشتہ زمانے میں جہاں اودھی کا لکھنؤ میں سکہ چلتا تھا وہاں آج بھی اس کا دور دورہ ہے۔ اردو لکھنؤ کی عام اور شائستہ زبان ہے۔ لیکن بول چال میں اودھی ہی مستعمل ہے۔

(۴) ڈاکٹر آر۔ بی۔ سکسینہ نے اودھی پر تحقیقی کام کیا ہے۔ ان کی رائے ہے

(الف) لکھنؤ، الہ آباد اور فیض آباد جیسے بڑے بڑے شہروں میں جہاں غیر اودھی علاقے کے تعلیم یافتہ لوگوں کی کثرت ہے تعلیم یافتہ طبقے کی زبان اُردو ہے (اودھی کا ارتقاء)

(ب) بڑے بڑے شہروں میں ایک لڑکی جس کی مادری زبان ہندوستانی (اُردو) ہے اپنی زبان برقرار رکھنے میں کامیاب ہو جاتی ہے اور اس کی اولاد جب بڑی ہوتی ہے تو وہ بھی ہندوستانی بولتی ہے۔ اودھی خاندان کے چند افراد بولتے ہیں۔ اس لئے ہندوستانی بولنے والی لڑکی کے بچوں کی زبان اودھی نہیں ہوتی۔ (اودھی کا ارتقاء)

ان اقتباسات سے معلوم ہوا کہ لکھنؤ میں صرف تعلیم یافتہ طبقے کی زبان اُردو ہے۔ جاہل اور ان پڑھ اودھی بولتے ہیں۔ ایک خاندان کے کچھ افراد اردو بولنے والے ہیں تو کچھ اودھی بولنے والے۔

اثر صاحب نے لکھنؤ آنے والے چند مسلمان خاندانوں کے نام گنا کر اور لکھنؤ کی چہل پہل اور فیض آباد کی بھیڑ بھڑکا دکھا کر نتیجہ نکالا ہے کہ لکھنؤ میں اردو قدیم زمانے سے ہے اور اودھی اس وقت رائج بھی تھی تو " اودھ کی معاشرتی ترقی کے بعد وہ بدل گئی اور اودھی نہ رہی۔"

"۱۰۳۰ء میں سید سالار مسعود غازی نے اودھ کا ایک بڑا حصہ فتح کیا۔ پہلے پہل جو مسلمان یہاں (اودھ میں یا لکھنؤ میں) آباد ہوئے وہ مسعود غازی کے ساتھ آنے والوں میں تھے" اس سے یہ کہاں ثابت ہوا کہ یہ سب اردو بولتے تھے۔ اُردو کا آغاز اگر دہلی سے ہوا تو فتح دہلی سے پہلے مسلمان اس زبان سے واقف تھے۔ دہلی ۱۱۹۳ء میں فتح ہوئی۔ اس لئے ۱۰۳۰ء میں مسعود غازی

کے ساتھ آنے والے مسلمان اُردو نہیں جان سکتے اور اگر یہ اردو جانتے تھے اور اردو بولتے ہوئے لکھنؤ (اودھ) آئے تھے تو آپ یہ کیسے کہیں گے کہ لکھنؤ میں صرف یہی لوگ آباد ہوئے اور کوئی متنفس نہ تھا۔ زیادہ سے زیادہ آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ اُردو بولنے والے بھی تھے اور اس سے نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ اُردو بولنے والے گھرانے لکھنؤ میں قدیم زمانے سے ہیں (معدودے چند سہی) لیکن یہ بحث سے خارج ہے۔ نہ اس سے میرے خیال کی تردید ہوتی ہے کہ لکھنؤ میں اردو زبان چند گھرانوں تک محدود تھی نہ آپ کی بات ثابت ہوتی ہے کہ ان کی موجودگی نے اودھی کو فنا کے گھاٹ اتار دیا۔ اردو بولنے والے تو بنگال میں بھی ہیں اور قدیم زمانے سے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود یہاں بنگلہ کا راج ہے اور اگر یہ مان لیں کہ اردو کے آتے ہی اودھی نے دم توڑ دیا تو اس میں ضرور کچھ وقت لگا ہوگا اور اس اثنا میں مرتے مرتے اس نے زیادہ نہیں دو چار وار کر کے اس کے چہرے کو داغدار بنا دیا ہوگا۔

اصل سوال یہ ہے کہ جب اردو بولنے والے لکھنؤ آکر بسے تو لکھنؤ اودھی بولنے والوں سے پٹا پڑا تھا۔ خورد و کلاں سب اودھی بولتے تھے۔ ہندو بھی اور مسلمان بھی۔ اثر صاحب اُودھی اور مسلمان میں بیر بتاتے ہیں اور فرماتے ہیں یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ مسلمان "کتب درسی عربی و فارسی میں پڑھتے تھے اور مطالب اودھی میں سمجھتے تھے۔" انھیں شاید یہ خیال نہیں رہا کہ مسلمان عربی و فارسی کے مطالب ہی اودھی میں نہیں سمجھتے تھے بلکہ اودھی میں کتابیں تصنیف کرتے تھے۔ شاعری کرتے تھے۔ فارسی کتابوں کو اودھی میں نظم کرتے تھے۔ ملک محمد نے "پدماوتی" لکھی یہ اودھی میں ہے۔ قطبن کی مرگاوتی اودھی کی قدیم ترین تصنیف ہے۔ نور محمد نے ۱۷۵۷ء میں اندراوتی کے نام سے ایک مثالی قصہ اودھی میں نظم کیا۔ شیخ نثار نے "یوسف زلیخا" کا اودھی میں منظوم ترجمہ کیا۔ شیخ عثمان کی چترادلی، شیخ نبی جونپوری کی گیان دیپ۔

قاسم شاہ دریا بادی کی جواہر سب اودھی زبان میں ہیں۔ آخر الذکر کتاب ۱۸۰۱ء میں تصنیف ہوئی۔ یعنی اس زمانے میں جب اردو اپنے شباب پر تھی اور اس میں نثر کی کتابیں کلکتہ جیسے دور افتادہ مقام سے شائع ہونے لگی تھیں۔

بڑا حیرت خیز ہے اثر صاحب کا یہ استعجاب کہ" معاشرتی ترقی کے باوجود لکھنؤ کی زبان نہ بدلنا تھی نہ بدلی (دیکھئے اثر صاحب یہاں" بدلنا تھی" فرماتے ہیں حالانکہ" بدلنی تھی" بقول ان کے یہاں کانوں کو بھلا لگتا ہے) اودھی ہی رہی" معاشرتی ترقی زبان کے عروج و ارتقار کا باعث ہوتی ہے۔ لیکن یہ کبھی نہیں دیکھا کہ تہذیب و تمدن کی ترقی کے ساتھ زبان کا چولا بدل جائے اور وہ کسی اور زبان میں نمودار ہو۔ انگریز نے ترقی کی تو کیا وہ انگریزی چھوڑ جرمن زبان بولنے لگے۔ اور جرمنوں نے جب علم و شائستگی کا علم بلند کیا تو ان کی زبان نے کونسا روپ اختیار کیا؟

یہ بھی غلط ہے کہ اردو بولنے والے مسلمان قدیم الایام سے لکھنؤ میں آباد ہیں ایک لکھنوی عالم اور انشا پرداز احمد علی یکتاؔ کی شہادت کافی ہے۔ وہ کہتے ہیں۔

" زبان مردمان لکھنؤ (لکھنوی اردو) کہ از قدیم الایام باشندہ آں بلدہ نیستند دنبو دند در زمان حال بفصاحت نزدیک تر، از دیگراں ست۔

(دستور الفصاحت صہ ۶)

فیض آباد کا ذکر آنا تھا کہ اثر صاحب اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکے۔ اور ان کی زبان قلم سے وہ الفاظ نکل گئے جن کی ان جیسے ذمہ دار اہل قلم سے ہرگز توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔ میں نے اپنے پچھلے مضامین میں میر انیس مرحوم کے بارے میں لکھا تھا کہ وہ دہلی کی زبان پر فخر کیا کرتے تھے اور لکھنؤ کی محدود و مصنوع زبان سے تبرا کرتے ہوئے فرمایا کرتے تھے" یہ میرے گھر کی زبان ہے

حضراتِ لکھنؤ یوں نہیں بولتے۔" حضرت اثر نے اس قول کی شرح کرتے ہوئے ایک ایسے امر کا انکشاف فرمایا ہے جس کی خبر ہمارے فرشتوں کو بھی نہیں، فرماتے ہیں۔ فیض آباد میں ایک سرکاری دفتر محاورات اور اصطلاحات کا تھا۔ میر حسن اسکے میر منشی تھے۔ اس کے بعد میر مستحسن خلیق کا تقرر ہوا۔ جب کوئی جدید محاورہ محلات سے تراش کر نکلتا دفتر میں قلمبند کر لیا جاتا۔ یہ ذخیرہ میر انیس تک پہنچا۔ اور وہ اس پر قابض ہو گئے۔ اس لئے فرماتے ہیں۔ "یہ میرے گھر کی زبان ہے" اثر صاحب مجھے اپنی اس دریافت کا یقین نہ دلا سکے لیکن میں انھیں یقین دلا سکتا ہوں کہ میر انیس مرحوم محلات کے گھڑے ہوئے محاورات کو اپنے گھر کی زبان نہیں بتاتے۔ دہلی کی نکھری ہوئی اور کوثر میں دھلی ہوئی زبان ان کے گھر کی زبان ہے۔ مختصر طور سے وجوہ حسب ذیل ہیں۔

(۱) محلات کے تراشے ہوئے محاورات اگر دفتر میں محفوظ کر لیے جاتے تھے تو عام نشر و اشاعت کے لیے یا ایک سرمایہ دار کے اندوختہ کی طرح محض ذخیرہ کرنے کے لیے۔

(۲) اگر ان محاورات کی اشاعت نہ ہو سکی تو یہ جزو زبان کب اور کیسے بنے اور میر انیس نے اس قسم کے غیر ٹکسالی الفاظ و محاورات کے استعمال پر فخر و مباہات کا اظہار کیسے کیا۔

(۳) یہ ذخیرہ صرف میر انیس تک پہنچا۔ میر حسن اور میر خلیق اس سے کیسے محروم رہے حالانکہ وہ اس خدمت پر مامور تھے۔ انھوں نے ان محاورات پر کبھی فخر نہیں کیا۔

(۴) محاورات تو گھڑے جائیں فیض آباد کے محلات میں اور زبان ہو میر انیس کے گھر کی۔ اثر صاحب چاہے نہ مانیں لیکن انیس مرحوم جانتے تھے اور مانتے بھی تھے کہ زبان کلیا کا گڑ نہیں کہ گھر میں پھوڑ لیا۔ جس لفظ یا محاورے کو قبول عام کے دار الضرب

سے چلن نہیں ملا وہ ٹکسال باہر ہے اور کسی ادیب کے لئے بھی اس کا استعمال جائز نہیں۔

اثر صاحب "خود ساختہ" ہونے کا الزام انیس مرحوم کی زبان پر لگانے سے نہیں چوکے۔ حالانکہ خود "حضرات لکھنؤ" کی زبان خود ساختہ ہے اور اس کا اعتراف قبلہ نواب صاحب کو بھی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ اہل لکھنؤ نے دہلی کی زبان میں تراش خراش کی "دل پذیر اختراعات" سے دلبری کی ادائیں سکھائیں اور لسانی اجتہادات کئے۔ لیکن زبان کے ایک اہم نکتہ کو وہ نظر انداز کر جاتے ہیں کہ زبان میں خود ساختہ اختراعات کی گنجائش نہیں۔ زبان ایک فطری چیز ہے۔ اس میں ٹھونس ٹھانس ممکن نہیں۔ ہم صرف پنیری جماتے ہیں۔ اس کا پھوٹنا اور سرسبز ہونا ہمارے اختیار سے باہر ہے۔ ناسخ کی اصلاحات پر اثر صاحب خوشی سے پھولے نہیں سماتے اور بار بار ان کا ذکر کرتے ہیں حالانکہ ناسخ کی اصلاحی تحریک کا لکھنؤ سے کوئی تعلق نہ تھا۔ میں اپنے پچھلے مضامین میں تفصیل سے بیان کر چکا ہوں کہ یہ تحریک حاتم، مظہر، اور میر و مرزا کے سلسلہ اصلاحات کی ایک کڑی ہے۔ اس کا جواز اس لئے مل آیا کہ دکھنی شعراء کے اثر سے متقدمین شعرائے دہلی کے یہاں ایسی ترکیبیں اور الفاظ استعمال ہونے لگے تھے جو دہلی کی زبان اور روزمرہ کے خلاف تھے۔ دوسرے ناسخ کا لکھنؤ دہلی سے الگ نہ تھا۔ دہلی کے شعراء کا اس زمانہ کے لکھنؤ میں ایک جمگھٹا تھا اور ہر چھوٹے بڑے مسئلے میں دہلی والوں کی طرف نظریں اٹھتی تھیں کہ دیکھئے یہ کیا کہتے ہیں۔ اثر صاحب کی "دل پذیر اختراعات" کا دور اس کے بہت بعد میں شروع ہوا۔ میری تحقیق یہ ہے کہ یہ اختراعات اودھی کے اثر سے ہوئیں اس لئے اردو کے دربار میں بار پا نہ سکیں۔ اہل زبان نے ان کو رد کر دیا۔ پنیری جمائی گئی۔ لیکن زمین شور تھی اس لئے وہ ٹھٹھر کر رہ گئی

اور پھل پھول نہ لاسکی۔

لکھنؤ کے اہل علم اس خوش فہمی میں مبتلا ہیں کہ اہل دہلی نے ان کی اصلاحات کو مان لیا اور لکھنؤ کی زبان دہلی میں رواج پاگئی ان حضرات نے جو الٹی گنگا بہائی ہے اس کی حقیقت دکھانے کے لئے وقت چاہیئے۔ میں بطور مثال صرف ایک اصلاح کا ذکر کردوں گا۔ دہلی میں فعل حال آئے، جا۔ ئے ہے کے پہلو بہ پہلو آتا ہے اور جاتا ہے بھی مستعمل ہے۔ دہلی والے آتا ہے اور جاتا ہے کو فصیح سمجھتے ہیں۔ نظم مرحوم فرماتے ہیں کہ عجب نہیں اس کا سبب یہ ہو کہ اہل لکھنؤ کا کلام کثرت سے دیکھا اور سنا تو اس کا یہ اثر پڑا۔ نواب صاحب نے ایک قدم آگے بڑھا کر فرمایا۔ آئے ہے جائے ہے دہلی کی زبان ہے (ملاحظہ فرمایئے۔ نظم امریکی بنجارہ نامہ پر اثر صاحب کا تبصرہ) اور آتا ہے جاتا ہے لکھنؤ کی۔ آرزو اور آبرو دہلی کے دور اوّل کے شاعر ہیں۔ اس زمانے میں شعر و ادب کے قلمرو میں لکھنؤ کا سکہ چلنا شروع نہیں ہوا تھا ذیل کے ابیات میں انھوں نے "آوتا ہے"، "جلتے ہیں" اور "ہوتے ہیں" فعل حال کے صیغے استعمال کئے ہیں۔

آرزو۔ ہر صبح آوتا ہے تیری برابری کو
کیا دن لگے ہیں دیکھو خورشید خاوری کو

آبرو۔ جلتے ہیں اور ہم سے جب مانگتے ہو پیالہ
ہوتے ہیں داغ دل میں جوں جوں کہو ہو لالا

ایک اور خوش فہمی کا ازالہ میں پہلے کر چکا تھا اس مرتبہ حضرت اثر نے اس کو پھر دہرایا ہے۔ اردو میں زبان طرز بیان کے معنی میں بھی ہے۔ مثلاً ہم عام طور سے کہتے ہیں۔ فلاں شخص زبان بڑی اچھی لکھتا ہے۔ یعنی اس کا اسلوب بیان اچھا ہے۔ زبان تو سب کی اردو ہے سب وہی الفاظ اور ترکیبیں استعمال کرتے ہیں جو اردو

میں رائج ہیں۔ طرز ادا اور اسلوب البتہ سب کا جدا جدا ہے۔ غالب نے کہیں اپنے خط میں لکھنؤ والوں کے طرز انشا کی تعریف کر دی تھی اور یہ لکھ دیا تھا کہ زبان لکھنؤ کی سند ہے اور خیال دہلی کا۔ اب حضرت اثر غالب کے اس قول کو حرز جان بنائے ہوئے ہیں اور میر انیس جیسے زباندان کا قول "یہ میرے گھر کی زبان ہے۔ حضرت لکھنؤ یوں نہیں بولتے" جب ان کو یاد دلایا جاتا ہے تو بے مزہ ہو کر اس کی ایسی شرح فرماتے ہیں کہ انجان کو بھی ہنسی آ جائے۔

بہر حال جب لکھنؤ میں اردو پہنچی تو وہاں اودھی رائج کرتی تھی۔ زبانوں کی تاریخ بتاتی ہے کہ جب کسی سرزمین میں دو زبانیں ملیں ایک نے دوسری کو متاثر کیا۔ دکن و گجرات میں اس سے پہلے اردو گجراتی اور مرہٹی کے زیر اثر بہت کچھ بدل گئی تھی۔ لکھنؤ میں وہ اودھی سے متاثر ہوئی۔ اس تاثر کا کھوج لگا کر میں نے بتایا۔

(۱) لکھنؤ والوں میں تذکیر و تانیث کے باب میں افراتفری دیکھی گئی ہے یہ اودھی کا اثر ہے۔ اودھی تذکیر و تانیث کا فرق کرنے میں بڑی نرم ہے۔

(۲) "نے" کے ترک و اختیار میں لکھنؤ والوں کا ٹھوکریں کھانا بھی اودھی کی وجہ سے ہے اس لئے کہ اس میں "نے" کا وجود نہیں۔

(۳) لکھنؤ والے "انہی" کو "انھیں" اور "ہمی" کو "ہمیں" کہتے ہیں۔ "ہی" کلمہ تاکید و حصر کے آخر کا "ن" اودھی سے ماخوذ ہے۔

تذکیر و تانیث کے باب میں حضرات لکھنؤ کی افراتفری یہ ہے۔

الف۔ وہ مذکر کو مونث بولتے ہیں اور مونث کو مذکر۔

ب۔ مذکر یا مونث الفاظ کی جمع مونث ہونی چاہئے لیکن وہ مذکر بتاتے ہیں۔

ج۔ صحیح الآخر مذکر اسمار کی جمع مونث اسمار پر قیاس کر کے "یں" لگا کر بناتے ہیں جیسے برسیں" اور لفظیں"۔

د۔ "نا" علامت استقبال کی تانیث "نی" ہے۔ یہ ہر حال میں "نا" بولتے اور لکھتے ہیں۔

تذکیر و تانیث الفاظ

تذکیر و تانیث کے سلسلے میں اثر صاحب نے دریافت کیا تھا کہ لکھنؤ والے اودھی ماحول کے زیر اثر مذکر و مونث کا صحیح شعور نہیں رکھتے۔ دہلی والوں میں تو یہ شعور ہے۔ پھر تذکیر و تانیث الفاظ میں ان کا اختلاف کیوں ؟ میں نے جواباً عرض کیا کہ دہلی والوں کا اختلاف بمقابلہ حضرات لکھنؤ نہ ہونے کے برابر ہے۔ اس لئے کہ ایک تو یہ اختلاف گنے چنے لفظوں میں ہے دوسرے اس کا امتداد زمانہ سے تعلق ہے - آج سے پہلے ایک لفظ مونث تھا آج مذکر ہے۔ تیسرے یہ اختلاف معنی کی وجہ سے ہے۔ مثلاً سانس دم کے معنی میں مذکر ہے۔ و آہ کے معنی میں مونث۔ اثر صاحب نے مولوی سید احمد دہلوی کی کتاب سے چند الفاظ لکھ کر مجھے توجہ دلائی کہ دیکھئے ان میں اہل دہلی کا اختلاف ہے۔ میں نے اپنا جواب دھرایا کہ یہ چند الفاظ ہیں۔ سب ملا کر سات سے زیادہ نہیں ہوتے۔ بحث یہاں ختم ہو گئی تھی۔ لیکن اثر صاحب نے ایک اور پہلو نکال لیا۔ فرماتے ہیں کہ ذوق۔ کے کلام میں سانس دم کے معنی میں ہے اور اس کے باوجود انھوں نے مونث نظم کیا ہے۔ اور " طرز" کے متعلق لکھا ہے کہ وہ بلا اختلاف دہلی میں مونث ہے مگر پروفیسر صاحب نے مذکر تحریر کیا ہے۔

اثر صاحب بھول گئے " سانس " انہی سات الفاظ میں سے ہے جن کا ذکر بحوالہ سید احمد دہلوی وہ کر چکے ہیں " طرز" بھی مختلف فیہ ہے۔ یہ تمام

الفاظ جن میں اہل دہلی کا اختلاف ہے (ان لفظوں کو چھانٹنے کے بعد جن میں یہ اختلاف امتدادِ زمانہ کی وجہ سے ہے یا اختلاف معنی کی وجہ سے) سات سے زیادہ نہیں۔

ذوق نے سانس کو دم کے معنی میں مونث لکھا۔ داغ کہتے ہیں کہ میر کی زبان پر یہ لفظ مونث تھا۔ میں نے جب سے ہوش سنبھالا سانس کا لفظ دہلی میں مذکر ہی بولتے سنا۔ سانس کی تذکیر و تانیث کا اختلاف اس حساب سے زمانہ کا اختلاف ہوا اور میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ اثر صاحب کے نزدیک بدلتے ہوئے زمانہ کے ساتھ زبان میں بھی تغیرات ہوئے۔ علامہ نظم طباطبائی اسے لکھنؤ کی زبان کا اثر بتاتے ہیں۔ فرماتے ہیں "ذوق کے کلام میں زبان لکھنؤ کا تتبع پایا جاتا ہے مثلاً فکر کو ذوق نے مونث نظم کیا ہے اور سانس کو بھی بتانیث باندھا ہے"۔ اس صورت میں اس اختلاف کی ذمہ داری لکھنؤ کی "ادھی تا تلانہ اداؤں پر" ہو گی اور شاعر کی ہمنوائی میں مجھے کہنا پڑے گا ؏

جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

اثر صاحب نے مجھے سخن پروری کا الزام دیا ہے کہ میں نے ظفر کے مصرع ؏ "ٹھنڈی ٹھنڈی جو کوئی سانس ہے آتی جاتی" میں کھینچ تان کے آہ کے معنی پہنا دیے۔ ذیل کا شعر بھی ظفر ہی کا ہے۔ اس میں کھینچ تان کر دم کے معنی پہنا دیں۔

ہمیشہ چپ ہی رہے ہم کبھی جو ٹھنڈی سانس
بھری بھی ہم نے تو ہو کر تبنگ جاں سے بھری

عربی مونث الفاظ کو جمع کی حالت میں مذکر بولنا انتہائی بد ذوقی کی بات تھی۔ اثر صاحب نے جلال مرحوم کے سر اس کی ذمہ داری رکھ کر اپنی برات کر لی کہ

یہ جلال کی اپج ہے۔ میں اس کا سختی سے پابند نہیں لیکن ساتھ ہی یہ بھی لکھ دیا کہ جو کچھ ہو اس پر عدم احساس تذکیر و تانیث کا الزام کیونکر عائد ہو سکتا ہے جب عربی لفظ متفقہ طور پر مونث ہے"۔ ایک طرف آپ عربی لفظ کو مونث بتاتے ہیں دوسری طرف آپ اس کو مذکر بولتے اور لکھتے ہیں۔ اس سے زیادہ فقدان۔ (یا نقصان) احساس اور کیا ہو سکتا ہے۔ حضرت اثر جلال کو اس قاعدے کا موجد ٹھہرا کر فرماتے ہیں۔ اس کے ماننے نہ ماننے کا ہر شخص کو اختیار ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر متاخرین اہل لکھنؤ میں اس کا رواج نہ تھا تو جلال نے یہ قاعدہ کس لئے وضع کیا اور ایسے لفظ کو جو باتفاق مونث ہے مذکر بولنے اور لکھنے کی تجویز کیوں پیش کی۔ قاعدہ استعمال اہل زبان کو دیکھ کر وضع کیا جاتا ہے۔ قاعدہ بنا کر اہل زبان کو اس کے مطابق بولنے پر مجبور نہیں کیا جاتا۔ اگر سچ مچ اس قاعدے کے وضع کرنے میں جلال کی اپج کو دخل ہے اور لکھنؤ اہل قلم کا استعمال اس کا موید نہیں تو حضرت اثر دبی زبان سے کیوں کہتے ہیں کہ میں سختی سے پابندی نہیں کرتا۔ انھیں صاف اور ڈنکے کی چوٹ اس کا اعلان کرنا چاہئے کہ میں اس قاعدے کا پابند نہیں۔

اثر صاحب نے حضرات لکھنؤ کا مذاق تذکیر و تانیث جتانے کے لئے لکھا تھا کہ انھوں نے تذکیر و تانیث کے اصول منضبط کئے اور رسالے لکھے۔ آپ نے کیا کیا؟ میں نے کہا اس سے یہ کہاں ثابت ہوا کہ اہل لکھنؤ تذکیر و تانیث کا صحیح فطری ذوق رکھتے تھے۔ اس قسم کے رسالے تو غیر زبان کے عالموں نے بھی لکھے ہیں۔ جیسے انگریز اور پرتگالی۔ تو کیا یہ بھی زبان کے مالک تھے۔ اور کیا اثر صاحب کے والد بزرگوار نے یہ نہیں کہا کہ انھوں نے کتابوں سے اردو سیکھ لی "اصل زبان اور محاورہ اور چیز ہے"۔ (شاعر۔ اکتوبر ۱۹۵۱ء صہ ۲۴)

اس پر ارشاد ہوا کہ دہلی میں بھی ایسی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ میں نے عرض کیا۔ آپ فرماتے تھے کہ آپ نے (دہلی والوں نے) کیا کیا اور اب آپ ہی انشا دہلوی اور سید احمد دہلوی کی مساعی کو سراہنے لگے۔ خیر یہ تو سخن گسترانہ بات تھی۔ اثر صاحب کی گتھی کو سلجھاتے ہوئے میں نے لکھا تھا "ان بزرگوں نے جب نہیں مارا جبکہ انھوں نے مارا ہوگا جنھوں نے یہ سمجھا کہ اہل زبان لغت یا گرامر لکھا ہی نہیں کرتے۔ بات صاف تھی۔ اصول وضع کرنا اور لغت تصنیف کرنا اہل زبان ہونے کا ثبوت نہ تھا۔ غیر اہل زبان نے بھی قواعد اور لغت کی کتابیں لکھی ہیں حضرت اثر نے سمجھا کہ گرامر یا لغت غیر اہل زبان ہی لکھا کرتے ہیں۔ اہل زبان کے اختیار سے باہر ہے۔ اس خوش فہمی کی داد دینے ہی والا تھا کہ حضرت اثر نے میرے اس جواب کے متعلق یہ تحریر فرما کر۔

"جب میں نے کہا کہ دہلی میں بھی ایسی کتابیں لکھی گئیں تو جواب دینے کے بدلے غیر متعلق بحث چھیڑ کر میرے سوال کو پس پشت ڈال دیا۔" داد کو میرے ہونٹوں پر گرہ بنا دیا۔

"برسیں" اور "لفظیں" پر میرا اعتراض تھا کہ یہ صحیح نہیں "یں" کے اضافے سے مونث الفاظ کی جمع بنائی جاتی ہے۔ جواب دیا گیا کہ میں نے کسی ثقہ کو 'برسیں' بصیغہ جمع بولتے نہیں سنا[1]۔ (بصیغہ جمع شاید اس لئے کہ برسوں کی تانیث کے طور پر یہ اثر صاحب کے نزدیک صحیح ہے) لفظ کی جمع لفظیں بے شک مستعمل ہے

---

[1] اثر صاحب کو اس سے بھی انکار ہے کہ چیت کی جمع چیتیں (لکھنؤ میں) ہے۔ دریائے لطافت میں یہ جمع موجود ہے۔ ملاحظہ فرمایئے ص ۱۳۲

لیکن وہ مونث ہے" برسیں" کے متعلق میں نے عرض کیا کہ شاعر اکتوبر ۱۹۵۱ء میں آپ تسلیم کر چکے ہیں کہ صرف ایک جملے میں جو عوام بولتے ہیں" برسیں" ہوگئیں برسیں آیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے کیا۔ معارف میں لکھتے وقت رسالہ شاعر میرے سامنے کھلا رکھا تھا" بے شک! رسالہ آپ کے سامنے نہ تھا۔ حافظہ کا اعتبار نہیں۔ بھول جانا ہی چاہیے۔ یہ میری غلطی تھی کہ میں نے آپ کی بھول کو مکرنے سے تعبیر کیا۔ لیکن یہ کیا فرمایا" ثقہ نہیں بولتے اور عوام صرف ایک جملے میں بولتے ہیں مجھے دونوں میں کوئی خاص فرق نظر نہیں آیا" آپ عوام کو ثقہ نہیں سمجھتے حالانکہ آپ کی زبان عوام کی زبان ہے۔ یہاں عوام ہی سب کچھ ہیں۔ انہی کے دربار سے لفظوں کو چلن ملتا ہے۔ رنگترہ اور رام رنگی جیسے الفاظ جو نواب. تورہے ایک طرف شاہوں کے وضع کردہ ہیں اردو میں رواج نہ پا سکے۔ عوام نے انھیں رد کر دیا۔ اس کے مقابلے میں ذیل کے الفاظ عوام نے بگاڑ کر غلط استعمال کئے اور وہ نواب اثر لکھنوی تک کی زبان پر ہیں۔

سہی (صحیح) شوردے چٹ (شور بے چٹ) افراتفری (افراط و تفریط) ہلہ (حملہ) مسالہ (مصالح) خیر صلا (خیر و صلاح) طعنے تشنے (طعن و تشنیع) وغیرہ وغیرہ۔

زبان اور چیز ہے اور لب و لہجہ اور چیز۔ اثر صاحب غالباً ان میں بھی فرق نہیں کرتے۔ جبھی تو فرماتے ہیں" عِلم قسم" بولئے۔ کیوں؟ عوام کی تقلید میں۔ لب و لہجہ میں نہ ہم عوام کی تقلید کرتے ہیں نہ خواص کی۔ نہ" عِلِم قسِم" بولتے ہیں اور نہ عین غین اور شین قاف کرتے ہیں۔

لفظ کے متعلق میں نے لکھا تھا کہ یہ کسی منطق سے بھی مونث نہیں۔ اسکے ساتھ" مالا" پیش کیا کہ اہل لکھنؤ اس کا آخری الف علامت تذکیر سمجھ کر اسے

مذکر بولتے ہیں۔ پورب والوں کے فسادِ ذوق کی یہ دو واضح مثالیں ہیں۔ "مالا" کو اثر صاحب غصہ کی طرح پی گئے "لفظ" کی بابت پوچھتے ہیں کہ مونث کیوں نہیں ہوسکتا۔ لفظ کی تانیث کی دو وجہیں ہوسکتی ہیں۔ یا اس میں تانیث کی علامت ہو یا اس کے ہم معنی کوئی لفظ اردو میں مونث ہو اور اسے اس پر قیاس کر لیا جائے۔ یہاں کوئی وجہ بھی نہیں۔ نہ اس میں علامت تانیث ہے اور نہ اس کے ہم معنی 'بول' اور 'شبد' میں سے کوئی لفظ مونث ہے۔ "لفظ" کی صوتی اور معنوی فخامت، کا تقاضا بھی یہی ہے کہ اسے مذکر بولا جائے۔ اصل میں یہ قصور اہل لکھنؤ کا نہیں۔ اودھی فضا اور آب و ہوا کا ہے۔ پورب کے شہروں میں غالب کے زمانے سے لفظ مونث بولا جاتا ہے۔ غالب نے ایک خط میں جو مرزا یوسف علی خاں عزیز کے نام ہے اس پر حیرت کا اظہار کیا ہے۔

"اے لو" لفظ "اس ملک کے لوگوں کے نزدیک مذکر ہے۔ اہل پورب اس کو مونث بولتے ہیں۔"

"نے" کا استعمال

اردو میں "نے" علامت فاعل (آلی) ہے اور یہ فعل متعدی کی ماضی (مطلق قریب بعید احتمالی) کے ساتھ مخصوص ہے۔ اودھی میں "نے" نہیں اس لئے جن علاقوں میں اودھی کا رواج ہے وہاں کے رہنے والے اس کا صحیح استعمال نہیں کرسکتے۔ تین افعال ایسے ہیں جن کی ماضی کے ساتھ "نے" آنا چاہئے۔ اہل دہلی لاتے ہیں مگر لکھنؤ والے اودھی کے زیرِ اثر ترک کر دیتے ہیں۔ بولنا متعدی (جب اس کے ساتھ کوئی لفظ "جھوٹ" یا "جملہ" وغیرہ بطور مفعول ہو) پڑھنا اور سوچنا۔

اثرؔ صاحب نے اوّل اوّل اس کا یہ جواب دیا کہ فرق دراصل " وہ " اور " اس " کا ہے۔ 'وہ' کے ساتھ ' نے ' نہیں آسکتا۔ میں نے بتایا کہ " نے " کے ساتھ 'وہ' خود بخود 'اس' ہو جاتا ہے۔ 'وہ' سے آپ کو کیا محبت ! " نے " لائیے اور 'وہ' کو 'اس' بنائیے تو فرمانے لگے کہ مولوی عبدالحق صاحب نے لکھا ہے۔ کہ " وہ جھوٹ بولا " بھی صحیح ہے۔ میں نے عرض کیا کہ مولوی صاحب کے نزدیک صحیح اور فصیح " اس نے جھوٹ بولا " ہے۔ آپ حضرات " نے " ترک کرکے " وہ جھوٹ بولا " کہتے ہیں۔ اس لئے انھوں نے لکھ دیا ہے کہ یوں بھی صحیح ہے۔ حضرات لکھنؤ اس طرح بولتے ہیں۔ لفظ " بھی " صاف بتا رہا ہے کہ مولوی عبدالحق صاحب بطریق تنازل اس استعمال کو صحیح سمجھتے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں، " بولنے کے ساتھ جب کوئی لفظ بطور مفعول ہوتا ہے تو " نے " لگا دیتے ہیں۔ جیسے اس نے جھوٹ بولا۔ مگر وہ جھوٹ بولا بھی صحیح ہے " اس پر اثرؔ صاحب کو اعتراض ہے کہ واہ صاحب ! ایک غیر صحیح بات ہماری خاطر سے صحیح کیوں ہوئی اور یہ بات چپکے سے پروفیسر صاحب کے کان میں کہہ دی گئی۔ مولوی صاحب نے ایک مختصر قواعد اردو دہلی اور لکھنؤ کے لسانی اختلافات سے بچ کر لکھی تھی۔ اس میں کسی اختلافی بحث کو چھیڑنا مناسب نہ تھا اس لئے کتاب کی افادیت کو نقصان پہنچ سکتا تھا۔ رہا کان میں چپکے سے کہنا سو اس کی ضرورت نہ تھی مولانا کا اسلوب بیان ڈنکے کی چوٹ اس کا اعلان کر رہا ہے سننے والے کان چاہئیں اور سمجھنے والے دل۔

ایک لطیفہ سنئے۔ میں شروع سے کہتا آیا ہوں کہ " بولا " متعدی کے ساتھ جب کوئی لفظ (جھوٹ یا جملہ وغیرہ) بطور مفعول ہو تو " نے " آنا چاہئے۔ اثرؔ صاحب قاموس الاغلاط کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ میر انیس نے بغیر " نے "

استعمال کیا ہے اور ثبوت میں جو دو شعر نقل ہوئے ان میں "بولا" کے ساتھ کوئی لفظ بطور مفعول نہیں۔ ملاحظہ فرمائیں۔

بولی یہ سکینہ کہ چچی تم سے کہوں کیا — روتے ہیں کمر پکڑے ہوئے ہاتھوں سے بابا
تیغ و سپر کو پھینک کے بولا وہ نامور — کہدیجے ان سے کاٹ کے لیجائیں میرا سر

یہ "بولا" دہلی کے محاورے کے مطابق ہے۔ اس میں کوئی نزاع اہل دہلی کا نہیں، اور جیساکہ خود صاحب قاموس الاغلاط نے لکھا ہے۔ اہل دہلی و حضرات لکھنؤ کے مابین متفق علیہ ہے۔ اثر صاحب "بولا" کے بعد جملہ (یہ کہ چچی تم سے کہوں کیا" اور کہدیجے ان سے الخ" دیکھ کر سمجھے کہ "بولا" کا مفعول ہے۔ یہ غلط ہے۔ "بولا" کے بعد جو جملہ آتا ہے وہ مفعول نہیں۔ مقولہ ہوتا ہے۔ اثر صاحب نے لفظ "جملہ" کو جو میری عبارت میں بمعنی مرکب نام کے معنی میں لیا اور جھٹ اوپر کے دو شعر نقل کر دئے؛

پڑھا اور سوچا کے بارے میں بھی اثر صاحب سے سہو ہوا۔ "سوچا" اور "پڑھا" اردو میں ماضی بھی ہیں اور اسم مفعول بھی۔ "سوچا" "سوچا ہوا" کا اختصار ہے۔ اور "پڑھا" "پڑھا ہوا" کا (دریائے لطافت ص۱۸۱) جیسے کھلا غالب کے اس شعر میں :۔

ہم پکاریں اور کھلے یوں کون جائے — یار کا دروازہ پائیں گر کھلا

یعنی کھلا ہوا۔ سوچا اور پڑھا بطور اسم مفعول ہوں تو اس کے ساتھ "نے" نہیں آتا۔ مولانا نذیر احمد کا مصرع ہے ؎

ہاں یہ سبق کوئی متنفس پڑھا نہیں

یعنی کوئی متنفس یہ سبق پڑھا ہوا نہیں۔ یا میر انیس کا شعر ہے ؎

کیا جانے دل میں سوچے تھے کیا شاہ کربلا — مقتل میں کھینچ کر انھیں لے آئی ہے قضا

"دل میں سوچے تھے" یعنی دل میں سوچے ہوئے تھے۔

صاحب قاموس الاغلاط نے اشتباہ کے تحت خود لکھ دیا تھا کہ پڑھنا۔ سیکھنا اور سوچنا ایسے افعال ہیں کہ اہل لکھنؤ ان کے ساتھ "نے" نہیں لاتے۔ اثر صاحب کا اس کے بعد اس اقتباس کو پیش کرنا ایسا ہے جیسے کسی نے ایک شاعر پر اعتراض کیا کہ فلاں محاورہ آپ نے غلط باندھا ہے۔ اس نے جواب دیا واہ صاحب یا محاورہ بالکل صحیح ہے۔ دیکھئے میرے ایک دوسرے شعر میں یہ اسی طرح بندھا ہے

اثر صاحب نے بطور جملہ معترضہ لکھا ہے کہ پروفیسر صاحب کے علی الرغم ہم پارکھ کی جگہ پرکھیا بولتے ہیں۔ اردو میں پارکھ (اس کی ایک صورت پارس ہے) وہ ہے جو صحیح اور غلط میں تمیز کر سکے اور پرکھیا کھوٹے اور کھرے سکہ کا پرکھنے والا۔ جب اثر صاحب ان لفظوں میں فرق نہ کر سکے تو پھر ع

کیوں کسی کا گلہ کرے کوئی

"ہی" یا "ہیں"

سب جانتے ہیں کہ اردو میں کلمہ حصر "ہی" ہے۔ اہل لکھنؤ نے ان اور تم کے ساتھ "ہی" کو "ہیں" بنایا اور انھی، ہمی اور تمھی کو انھیں، ہمیں، اور تمھیں کہنے لگے۔ میں نے لکھا کہ اردو میں یہ غلط ہے۔ اہل لکھنؤ نے پورب والوں سے لیا ہے۔ اثر صاحب یہ تو بتا نہ سکے کہ "ہی" خاص ان ضمیروں کے ساتھ مل کر "ہیں" کیسے ہوا۔ انھوں نے صرف اتنا لکھا کہ دہلوی شعراء میں سے میر مہدی مجروح اور بہادر شاہ ظفر نے بھی یوں ہی لکھا ہے۔ اس لیئے اہل لکھنؤ کو الزام نہیں دیا جاسکتا۔ میں نے عرض کیا کہ یہ شعراء اس زمانے کے ہیں، جب بقول آپ کے شاعری کے قلمرو میں لکھنؤ کا سکہ جاری ہو چکا تھا۔ ان کے استعمال پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔ جب تک متقدمین شعراء دہلی کے یہاں

اس کا صاف اور واضح استعمال نہ دکھایا جائے۔ اس کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ آج اہل قلم ان تاکیدی ضمیروں کو نون غنہ کے ساتھ لکھتے ہیں۔ اس لئے یقیناً کسی قریبی زمانے سے اس استعمال کو عمومیت اور شہرت حاصل ہوئی۔ اور جب ہم ٹھیک ٹھیک یہ زمانہ نہیں بتا سکتے تو احتیاط اس میں ہے کہ دیکھ بھال کر سند پیش کریں۔ اور متاخرین شعراء کے کلام اور ان کے استعمال کو شبہ کی نگاہ سے دیکھیں یہ شعراء دہلی کے ہوں یا لکھنؤ کے۔ میر انشاء اللہ خاں کے دریائے لطافت سنہ ۱۸۰۲ء میں تصنیف ہوئی۔ اس میں انھوں نے لکھا ہے کہ "انھیں سے" کی اصل "انھی سے" ہے۔ لیکن آج نقل (انھیں سے) اصل (انھی سے) سے زیادہ فصیح ہے۔ ان کی عبارت یہ ہے۔

"انھیں سے، در اصل انھی سے، باشد لیکن حالا استعمال نقل نیکوتر از اصل باشد (ص۱۲۷)

میں سمجھتا ہوں کہ شجاع الدولہ کے عہد سے فیض آباد میں "انھی" کے آخر میں 'ن' غنہ اضافہ ہوا اور پورب جانے والے شعراء "انھیں" "ہمیں" لکھنے لگے۔

حضرت اثر نے بڑی تلاش کے بعد نعیم دہلوی کا شعر ڈھونڈ نکالا۔

آفت کی نشانی ہی رہے ہم تو زمیں پر   جو سنگ بلا چرخ سے ٹوٹا وہ ہمیں پہ

اور لکھا کہ۔ "لطف کے تذکرے میں ہے کہ نعیم حاتم کے معاصر تھے۔ انھوں نے دہلی سے قدم باہر نہیں نکالا۔ وہ وہیں رہے اور وہیں وفات پائی۔"

مصحفی اور نعیم خواجہ تاش تھے۔ ان کا اکثر ساتھ رہا۔ مصحفی کا بیان ہے کہ وہ حاتم کے شاگرد تھے۔ یہ غلط ہے کہ انھوں نے دہلی سے باہر قدم نہیں رکھا اول اول مصحفی نے نعیم کو آنولہ میں دیکھا، کچھ عرصہ بعد وہ ٹانڈے چلے آئے اور نواب محمد یار خاں امیر کے ملازم ہو گئے۔ مصحفی بھی اس زمانے میں امیر کے ملازم تمنا دربار میں تھے۔ اس لئے ان سے اور نعیم سے اکثر ملاقاتیں رہتیں۔ یہ

صحبت ۱۱۸۵ھ تک رہی۔ اس کے بعد بساط ایسی الٹی کہ مصحفی لکھنؤ چلے آئے اور نعیم عطر جہدی (کوئی جگہ ہے) چلے گئے اور وہیں استسقا کی بیماری میں ان کا انتقال ہوا۔ اس بیان سے دو باتیں معلوم ہوئیں۔ نعیم کی زندگی کا اکثر حصہ آنولے اور ٹانڈے (پورب) میں گذرا اور ۱۱۸۵ھ یعنی شجاع الدولہ کے زمانے تک وہ زندہ تھے۔ مصحفی نے نعیم کے متعلق لکھا ہے

"وہ بہت کہتے تھے اور ان کا کلام رطب ویابس سے بھرا پڑا ہے"

(تذکرہ ہندی ذکر نعیم)

اس تفصیل سے ذیل کے نتیجے برآمد ہوتے ہیں :۔

(۱) نعیم پورب میں رہے اور شجاع الدولہ کے عہد تک بقید حیات تھے دریائے لطافت کی تصنیف سے پہلے پورب میں "انھیں" فصیح اور صحیح سمجھا جاتا تھا۔ اس لئے نعیم نے یہ استعمال پورب آکر سیکھا۔

(۲) نعیم پرگو شعراء میں سے تھے اور کہنے کی دھن میں زبان کی صحت و صفائی کا خیال نہیں رکھتے تھے۔ 'انھی'، 'کو رانھیں' باندھ گئے۔

اٹھارہویں صدی کے ربع آخر تک عام شعرا دہلی وزن اور قافیہ کی سخت پابندیوں سے مجبور ہو کر غلط اور خلاف محاورہ الفاظ نظم کر جاتے تھے۔ اور اسے کوئی عیب نہیں سمجھا جاتا تھا۔ مرزا جان طپش نعیم کے معاصر اور دہلی کے رہنے والے ہیں۔ ان کی ایک غزل "یہیں ہیں" اور "نہیں ہیں" کی زمین میں ہے۔ اس میں انھوں نے سہیں (سہی) بہیں (بہی) رہیں (رہی) کہیں (کہی) قافیے لکھے ہیں جن کے غلط ہونے میں شبہہ نہیں۔ یہ اسی سہل انگاری کا اثر ہے۔

فرقت میں جن کی ہم نے یہ حالتیں سہیں ہیں
خوں ناب دل کی پھر تو جوئیں کئی بہیں ہیں

باتیں ابھی تو تم سے کہنی بہت رہی ہیں

آخر میں یہ بھی عرض کردوں کہ فارسی میں "زمی" بھی صحیح ہے۔ نعیم نے شاید "زمی" اور "ہمی" لکھا۔ کاتب نے دونوں جگہ "ن" اضافہ کردیا۔

علامت مصدر "نا"

"نا" اردو میں دو ہیں۔ مصدری اور استقبالی۔ استقبالی "نا" کو گردانا جاتا تھا۔ اس کی تقلید میں متقدمین شعرا، اور انشار پرداز "نا" مصدری کو بھی گردانے لگے۔ کسی مصدر کا مفعول مونث ہوتا تو "نا" کو "نی" بنا لیتے۔ اور یوں کہتے "بات کرنی مشکل ہے"۔ متاخرین نے اسے نار وا سمجھا اور "نا" مصدری کو ہر حال میں "نا" بولنا اور لکھنا شروع کیا۔ جلال مرحوم نے قواعد المنتخب میں جہاں اس استعمال کا ذکر کیا ہے وہاں لکھا ہے: "مؤلف ہیچمداں بھی اسی طرف ہے کہ کسی حال میں علامت مصدری کو تغیر نہ دینا چاہیے اور جلال خود ہی رکھنا چاہیے۔" (ص ۲)

جلال نے یہ "نا" مصدری کی بابت لکھا تھا۔ یار لوگوں نے استقبالی کو بھی اس میں شامل کرلیا۔ اور "مجھے روٹی کھانی تھی" کو (اس میں "نا" استقبالی ہے) "مجھے روٹی کھانا تھا" بولنے لگے۔

اثر صاحب نے سب سے پہلے شاعر اکتوبر ۱۹۵۱ء میں نورالحسن ہاشمی کے ایک مضمون کا جواب دیتے ہوئے لکھا کہ یہ جلال کی اپج ہے۔ حضرات لکھنؤ سب اس کے پابند نہیں۔ اور میں نے بھی لکھنوی ہوتے کبھی سختی سے پابندی نہیں کی۔ اس کے بعد "معارف" میں اس کو دہرایا۔ بات بظاہر ختم ہوگئی تھی۔ اور میں نے یہ لکھ کر بڑی خوشی کی بات ہے اثر صاحب اہل لکھنؤ کی غلطی مان گئے اس بحث کو ختم کردیا تھا۔ لیکن ایک تو اثر صاحب کا یہ فرمانا صحیح نہ تھا کہ یہ جلال کی

اپچ ہے۔ دوسرے ان کی یہ تصریح کہ میں نے سختی سے اس قاعدے کی پابندی نہیں کی، حقیقت کے خلاف تھی۔ تیسرے جلال مرحوم نے "نا" مصدری کی بابت لکھا تھا کہ اس کو بحال خود رکھنا چاہیئے۔ لیکن حضرت اثرؔ اور ان کے رفقار "نا" استقبالی کو بھی بصورت تانیث "نا" لکھنے لگے۔ اس لئے میں نے ایک طرف "نا" کی دونوں قسموں کا فرق بتایا۔ دوسری طرف اس کی وضاحت کی، کہ جلال مرحوم نے "نا" مصدری کی بابت لکھا ہے کہ اس کو نہ بدلا جائے اور یہ ان کی اپچ نہیں۔ .... ان کا بیان ہے کہ فصحار متاخرین لکھنؤ کسی حال میں علامت مصدری کو تغیر نہیں دیتے۔ تیسرے اثرؔ صاحب کے ایک پرانے مضمون سے جب "نا" اور "نی" کی بحث ان کے سامنے نہ تھی، متعدد عبارات نقل کر کے دکھایا کہ وہ دب کر فرما رہے ہیں کہ میں سختی سے پابند نہیں۔ وہ کٹر لکھنوی ہیں ایک جگہ بھی انھوں نے "نی" نہیں لکھا۔

اثرؔ صاحب نے پہلے میری بات کو بگاڑ کر لکھا "لیجئے صاحب میں آج زچ ہوا اور عمل ۳۲ء میں نہیں کیا" میں نے عرض کیا۔ آج آپ یہ فرما رہے ہیں کہ میں سختی سے اس قاعدے پر عامل نہیں جب بحث روشنی میں آچکی ہے۔ اس کا فیصلہ آپ کی سابقہ تحریر سے ہوگا کہ آپ سچ مچ اس پر عامل ہیں یا دب کر فرما رہے ہیں۔ اس کے بعد مزید توڑ مروڑ کی گنجائش نہ تھی اس لئے ایک نئی راہ نکال لی گئی ارشاد ہوا ہے۔

"میرے ۳۲ء کے مضمون کی ورق گردانی کیا ضرور تھی۔ شاعر بابت اکتوبر ۳۰ء دیکھ لیا ہوتا۔ میں کس سے دب کر فرما رہا تھا۔ اور کس سے زچ ہو کر اپنی غلطی کا اعتراف کر رہا تھا۔"

شاعر سالنامہ ۳۵ء سے اس بحث کا آغاز ہوا۔ اور پہلے پہل ڈاکٹر ہاشمی

کا مضمون دیکھ کر اثرؔ صاحب کو اپنی اور اپنے رفقار کی کمزور پوزیشن کا احساس ہوا۔ چنانچہ اکتوبر ۱۹۵۱ء کے شاعر میں انھوں نے اہل لکھنؤ کے اس بے جا تصرف کا کھلے دل کے ساتھ اعتراف کیا اور لکھا میں نے اس قاعدے کے علم کے باوجود سختی سے پابندی نہیں کی۔ اب میں انہی سے پوچھتا ہوں کہ کیا اس صورت میں جب آپ شاعر بابت اکتوبر ۱۹۵۱ء میں لکھ رہے ہیں کہ میں نے کبھی سختی سے اس قاعدے کی پابندی نہیں کی۔ آپ کے اس قول کی تصدیق اس پرچے کو دیکھ کر کی جائے گی یا آپ کی اس سے پہلے کی تحریروں سے ؟

اثرؔ صاحب فرماتے ہیں جب " نا " اور " نی " دونوں صورتیں جائز ہیں جہاں مذاق سلیم جیسی رہبری کرے وہ صورت اختیار کیجئے۔ سوال یہ ہے کہ " نی " کے مقام پر " نا " بولنا جائز بھی ہے۔ اہل دہلی اسے ناجائز بتاتے ہیں اور فصحا، متاخرین لکھنؤ بقول مرزا جلال ہر حال میں " نا " لکھتے ہیں اور بقول نواب اثرؔ کہیں " نا " اور کہیں " نی " میں ان بزرگوں کی اس ناہمواری کا سبب تذکیر و تانیث کے صحیح، سچّے اور فطری شعور کا فقدان یا نقصان سمجھتا ہوں " مجھے روٹی کھانا ہے " میں بقول حضرت اثرؔ " اودھی کی طرف نفس کے غیر شعوری رجحان کا ارتفاعی مظاہرہ " اسی درجہ کا ہے جو ڈھاکے کے محلہ " پرانا پلٹن " کے نام میں ہے

پاکستان کی قومی زبان

پاکستان کی قومی زبان کے مسئلے پر زیادہ تر سیاسی نقطۂ نگاہ سے غور کیا گیا ہے، اور آج کل سیاست کی بنیاد خود غرضی، تنگ نظری اور ذاتی مفاد پر ہے۔ اس لئے یہ مسئلہ، جو پاکستان کے بقا، ترقی اور آئندہ خوش حالی سے بہت ہی گہرا تعلق رکھتا تھا، خود غرضیوں، غلط فہمیوں اور سیاسی تعصبات کی نذر ہو گیا۔ اور کسی نے ٹھنڈے دل و دماغ سے لسانی اور تاریخی پس منظر میں رکھ کر اس پر غور نہیں کیا۔

اردو نے غیر منقسم ہندوستان کے مسلمانوں کی قومی تعمیر میں جو حصہ لیا اس کی داستان بڑی طویل ہے جسے میں یہاں چھیڑنا نہیں چاہتا۔ مسلمانوں کی یہ خصوصیت رہی ہے کہ وہ جہاں بھی گئے انھوں نے اپنی انفرادی ہستی برقرار رکھی اور ہمسایہ غیر مسلم اقوام کے ساتھ تال میل کے باوجود ان سے الگ تھلگ رہے اور ان میں جذب نہ ہوئے۔ اس کے بہت سے اسباب ہیں۔ لیکن میرے خیال میں سب سے بڑی وجہ خود کلام الٰہی ہے جو مسلمانوں کے لئے دینی رہنما ہی نہیں ان کی قومی وحدت، یکجہتی اور ملی اتحاد کا ضامن بھی ہے۔ عام طور سے اہل علم قرآن شریف کی جامع دینی حیثیت

پر زور دیتے ہیں لیکن میرے نزدیک وہ سب سے بڑا جامع قومی ہے۔ دین یا عقیدے کے لحاظ سے روئے زمین کے مسلمانوں میں اختلافات ہیں معمولی اور فروعی سہی اور ہر فرقے نے اپنی صوابدید کے مطابق اس ہدایت ربانی کی آیات کے معنی دوسرے فرقے سے کچھ مختلف بتائے ہیں جس سے دینی جامعیت کو صدمہ پہنچا۔ لیکن قرآن کی جامع قومی حیثیت بڑی مکمل چیز ہے۔ اس نے مشرق و مغرب اور شمال و جنوب ہر گوشہ کے مسلمانوں کو ایک رشتہ وحدت میں منسلک رکھا اور بعد مسافت یا جغرافیائی دوری کے غیریت پھیلانے والے تمام اثرات کو بے کار کر دیا۔

قرآن شریف عربی زبان میں ہے۔ اس کے حروف (رسم خط) عربی ہیں۔ مسلمانوں نے ابتدا ہی سے قرآن کی اصل زبان (عربی) اور اس کے حروف کو برقرار رکھا۔ اگرچہ انھوں نے سمجھنے سمجھانے کے لئے قرآن شریف کے دوسری زبانوں میں ترجمے بھی کیے لیکن عیسائیوں کی طرح ان ترجموں پر انھوں نے تکیہ نہیں کیا۔ وہ نمازوں میں اصل عربی قرآن شریف پڑھتے رہے اور اپنے بچوں کو عربی قرآن پڑھاتے رہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمان اپنے دینی مرکز یعنی بیت اللہ سے، جسے خود قرآن نے مثابۃً للناس (مسلمانوں کا مرکز) بتایا تھا۔ دور ہونے کے باوجود اس سے وابستہ رہے۔ اور ان کا عرب کی زبان اور اس کے رسم تحریر سے تعلق منقطع نہ ہوا۔ جو قرآن شریف کے ترجموں پر تکیہ کرنے کے بعد ہرگز قائم نہیں رہتا۔ مسلمان دنیا کے جس گوشے میں بھی ہوں عربی کو اپنی قومی زبان اور عربی حروف کو اپنے ملی اور قومی حروف سمجھتے ہیں۔ اُن کا ناتا اپنے مرکز یعنی بیت اللہ سے عربی زبان اور عربی حروف ہی کی وجہ سے قائم ہے۔

وحدتِ قومی

عربی دنیا کے مسلمانوں کی قومی زبان اور عربی حروف قومی حروف ہیں دنیا کے مسلمانوں کی قومی زندگی میں عربی زبان و حروف کو وہی درجہ حاصل ہے جو یہود کی زندگی میں عبرانی زبان و حروف کو ہے اور ہنود کی زندگی میں سنسکرت زبان اور دیوناگری حروف کو۔ حال ہی میں ان دو قوموں نے گمنامی اور پستی سے ابھر کر جس میں وہ ایک عرصہ سے پڑی ہوئی تھیں، عرب و ہند میں اپنی اپنی مستحکم حکومتیں قائم کی ہیں۔ اس میں ان کے مذہبی عقائد کو اتنا دخل نہیں جتنا قومی شعور کو ہے جس کی بنیاد زبان و حروف پر ہے۔ ہندو تو کبھی ہندوستان سے باہر نہیں گئے اس لئے شاید لوگ یہ سمجھیں کہ ان میں اتحاد اور قومی یک جہتی جغرافیائی حدود میں محصور ہونے کی وجہ سے ہے۔ لیکن یہود دنیا کے ہر حصہ میں ہیں ان میں اتحاد کہاں سے آیا؟ صدیوں کی غلامی، پستی، ذلت، مسکنت کے باوجود وہ کس طرح فلسطین میں ایک نئی حکومت کی مستحکم بنیاد ڈالنے میں کامیاب ہوئے؟ ہندو ہر چند ہندوستان میں محصور تھے لیکن ان میں مذہبی اتحاد نہ تھا۔ جین، بدھ، براہمن، رام مارگ اہم مذہبی بنیادی مسائل میں ایک دوسرے سے اختلاف رکھتے ہیں۔ ہندوستان کے ہر صوبے کی زبان دوسرے صوبے سے الگ ہے۔ یہود اگرچہ مذہبی عقائد میں متحد ہیں لیکن دنیا کے چپے چپے پر پھیلے ہوئے ہیں اور جس علاقے میں بھی ہیں وہیں کی زبان بولتے ہیں۔ ہندوؤں میں عقائد، خیالات اور اختلاف زبان کے باوجود کس چیز نے رشتۂ اتحاد مضبوط رکھا۔ اور اختلاف زبان و مکان کے ہوتے ہوئے بھی یہود کو کس چیز نے ایک مستحکم حکومت کے قیام پر ابھارا؟ ان سوالوں کا جواب ایک ہے۔ ہندوؤں کو سنسکرت زبان اور دیوناگری حروف نے اور یہودیوں کو

عبرانی زبان اور عبرانی حروف نے۔ براؤن نے ایک مقام پر رسم خط کی مذہبی اہمیت جتاتے ہوئے لکھا ہے کہ یہودیوں کا اتحاد و یک جہتی عبرانی حروف کی وجہ سے ہے۔ یہودی ایران کا ہو یا ترکستان کا، عرب کا ہو یا افغانستان کا وہ اپنی مادری زبان کو عبرانی حروف میں لکھنا پسند کرتا ہے[۵]

عربی زبان کی دنیا کے مسلمانوں کی زندگی میں کیا اہمیت ہے؟ اس پر لسانی حیثیت سے بہت کم غور کیا گیا ہے۔ عربی مسلمانوں کی مقدس مذہبی زبان ہے اس لئے لوگ کہتے ہیں، عربی پڑھو۔ عربی ضرور پڑھنی چاہیے اور اگر ممکن ہو تو نصاب میں اس کو لازمی قرار دے دیا جائے۔ مجھے اس سے اختلاف نہیں اختلاف اس سے ہے کہ عربی کو ہم اپنی روزانہ زبان سے الگ رکھیں اور ایک کو دوسرے سے قریب نہ آنے دیں۔ جس طرح مذہب کو بد قسمتی سے ہم نے اپنی روزانہ زندگی سے الگ رکھا ہے اور زندگی و مذہب کے درمیان خط فاصل کھینچ دیا ہے۔ عربی اگر ہماری مقدس مذہبی زبان ہے تو وہ ہماری قومی یک جہتی اور اتحاد کی ضامن ہے۔ اس نے ہر خطے کے مسلمان کی زبان اور روزمرہ کو اپنی ہمہ گیر شخصیت سے متاثر کیا ہے۔ دنیا کے مسلمانوں کی بول چال کی زبان کی کم مائگی کو اپنے بے شمار الفاظ دے کر دور کیا ہے وہ ایک خطے کے مسلمان کا دوسرے خطے کے مسلمان سے رشتۂ اخوت قائم و مستحکم رکھنے کا سب سے بہتر ذریعہ ہے۔

ایران۔ افغانستان، ترکستان، پاکستان ان سب علاقوں کی زبانیں مختلف ہیں اور ہر علاقے کے مسلمان اپنی علاقے کی زبان بولتے ہیں۔ پاکستان کے کئی صوبے ہیں اور ہر صوبے کی بولی جدا ہے۔ عربی نے ان تمام

---

[۵] تاریخ ادبیات ایران جلد اول مقدمہ

علاقوں، خطوں اور صوبوں میں اتحاد قائم رکھا ہے۔ ایرانی، افغانی، ترکی اردو ہر چند جدا جدا زبانیں ہیں۔ لیکن ان سب نے عربی سے فیض حاصل کیا ہے ان میں بے شمار عربی الفاظ ہیں۔ ان کے ثقافتی الفاظ کا سرمایہ اور علمی و فنی اصطلاحیں عربی کے ذخیرے سے لی گئی ہیں۔ اس لئے ایرانی افغانی سے اور ترکی اردو سے مختلف ہوتے ہوئے بھی مختلف نہیں۔ ان میں یک گونہ رشتۂ اخوت قائم ہے۔ عربی عنصر نے انھیں ایک دوسرے سے قریب تر کر دیا ہے۔

اردو کے ارتقا میں عربی کا حصہ

اُردو ان تمام زبانوں سے جن پر عربی زبان کی چھاپ ہے زیادہ پختہ مسلمانی زبان ہے۔ وہ کسی زمانے میں ہندوستان کی دوسری صوبائی زبانوں کی طرح بول چال کی زبان تھی۔ مسلمانوں نے اسے پستی سے اُٹھا کر علمی و ادبی زبان کے درجے پر پہنچایا اور ثقافتی الفاظ و علمی اصطلاحات سے مالا مال کر کے اس قابل بنایا کہ اس میں اعلیٰ شاعری کی جا سکے اور علمی کتابیں لکھی جا سکیں۔ اُردو کی ارتقائی تاریخ سب جانتے ہیں۔ اس کے دُھرانے کی چنداں ضرورت نہیں۔ یہ زبان مسلمانوں کی فتوحات کے ساتھ غیر منقسم ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں پہنچی، پھولی، پھلی اور پھیلی۔ اٹھارہویں صدی عیسوی سے پہلے وہ ہندوستان کی عام زبان کی حیثیت اختیار کر چکی تھی۔ ڈاکٹر سنیتی کمار چٹرجی بنگال کے مشہور ماہر لسانیات ہیں۔ انھوں نے اردو کی بابت لکھا ہے:۔

"ہندوستانی ایک باعظمت زبان ہے جو اُردو اور ہندی کی شکل میں پندرہ کروڑ سے زیادہ لوگوں کے لئے ادب کی ایک معیاری حیثیت رکھتی ہے اور دنیا کی بڑی زبانوں میں (چینی اور انگریزی کے بعد) سب سے زیادہ عام اور کثیر الاستعمال شمار کی جاتی ہے[۱]۔"

---

[۱] انڈو ایرین اینڈ ہندی۔ صفحہ ۱۳۶ - ۱۳۷

میں اُردو ہندی نزاع میں پڑنا نہیں چاہتا۔ اس میں شبہ نہیں کہ اردو کی پرورش مسلمانوں نے کی اور اسے اپنے قومی مزاج کے مطابق ڈھالا۔ اُردو میں بیشتر عام الفاظ عربی (نیز فارسی) کے ہیں۔ اور یہ الفاظ وہ ہیں جو بول چال کی اردو میں نہ تھے اور اس وقت زبان میں داخل ہوئے جب مسلمانوں نے اس میں تصنیف وتالیف کا سلسلہ شروع کیا۔ اردو زبان کی ترقی کی منزلوں کے لئے یہ عربی الفاظ علامات ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُردو کن کن منزلوں سے گزری اور کس طرح مسلمانوں نے قدم قدم پر اسے سہارا دیا۔ اس کے علاوہ اردو کا تمام تہذیبی سرمایہ، علمی، ادبی اور فنی اصطلاحیں، بیان کے پیرائے ایرانی، ترکی، اور افغانی بولیوں کی طرح عربی کے وسیع اور شاندار ذخیرے سے لئے گئے ہیں۔ اس لئے اُردو اپنے مزاج ومنہاج اور فطرت وجبلت کے لحاظ سے غیر منقسم ہندوستان میں خالص اسلامی زبان سمجھی گئی۔ ہندو کو اس کے وجود پر ایسا ہی اعتراض تھا جیسا پاکستان کے قیام پر۔ اور اردو کی ترقی اور وسعت کو دیکھ کر ہندو اسی طرح بھڑکتا تھا جس طرح قیام پاکستان کے اعلان پر اس نے خود پاکستان کی دستورساز مجلس میں اپنے دلی رنج وملال کا اظہار کیا[۱]۔

ہندو کی فرقہ پرستی

عام طور سے ہندو مسلمانوں کو تنگ نظر اور فرقہ پرست بتاتے ہیں اور ان پر الزام لگاتے ہیں کہ انھوں نے مذہب کی بنیاد پر جداگانہ ریاست کا مطالبہ

۱؎ ملاحظہ فرمائیے پاک دستور ساز اسمبلی کی روداد ۱۱ راگست ۱۹۴۷ء۔ کانگریس پارٹی کے لیڈر مسٹر کرن شنکر رائے نے قائد اعظم کے مجلس کے صدر منتخب ہونے پر کہا تھا۔ "جناب! سچی بات یہ ہے کہ ہم ہرگز خوش نہیں۔ ہندوستان کی تقسیم پر ہم بہت دکھی ہیں۔"

کر کے ہندوستان کو، جو ہندو مسلمان دونوں کا متحدہ وطن تھا، تقسیم کرایا۔ لیکن ہندو پاکستان کے مطالبے سے بہت پہلے اپنی فرقہ دارانہ ذہنیت کا مظاہرہ کر چکے تھے۔ انھوں نے اردو کو، جو ہندو اور مسلمانوں کے لئے مشترک سرمایہ کی حیثیت رکھتی تھی، جس کے افعال و حروف اور روزانہ زندگی سے متعلق بیشتر الفاظ ہندی الاصل تھے اور تہذیبی، علمی، ادبی الفاظ و اصطلاحات عربی، جسے غیر منقسم ہندوستان کے ہندو و مسلمان یکساں طور سے بولتے تھے۔ محض زبان کے عربی عنصر اور عربی حروف کی بنا پر مسلمانی زبان ٹھہرایا۔ مسلمان نے مذہب یا مذہبی ثقافت کی بنیاد پر ملک کی سیاسی تقسیم کرائی یہ درست ہے۔ لیکن ہندو اس سے پہلے تہذیبی بنیادوں پر زبان کا لسانی بٹوارا کرا چکا تھا۔ اول اول اس نے اُردو کے خلاف یہ آواز اُٹھائی کہ وہ مسلمان کی زبان ہے جو قرآنی حروف میں لکھی جاتی ہے اور اس کے تمام تہذیبی الفاظ کا سرمایہ قرآنی ہے۔ اور آخر آخر قرآن کے الفاظ کو زبان کے خزانہ سے نکال کر دیوناگری حروف میں اُردو کو لکھنا شروع کیا۔ اس طرح ایک بے میل ہندوانہ زبان کی داغ بیل پڑی جس کا نام "ہندی ہندستانی" رکھا گیا۔ ذیل میں ایک ذمہ دار ہندو فاضل کے دو اقتباس دے رہا ہوں۔ انھیں غور سے پڑھیئے ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُردو کی مخالفت ہندوؤں نے اس کے عربی عناصر کی بنیاد پر کی:۔

۱۔ "اُردو کی جڑیں عربی (فارسی) کی زمین میں پیوست ہیں اور وہ ایک مختلف تہذیب (اسلامی تہذیب) کے اظہار کا آلہ ہے[1]"

۲۔ "اُردو اور پشتو کے سوا ہندستان کی تمام صوبائی زبانوں نے سنسکرت کی تہذیبی فضا میں نشوو نما پایا ہے[2]"

---

[1] آر۔ ایس شکلا آل انڈیا ریڈیو کی لسانی پالیسی صفحہ ۸۲
[2] آر۔ ایس شکلا آل انڈیا ریڈیو کی لسانی پالیسی صفحہ ۱۱۰

اُردو کا اسلامی مزاج

ڈاکٹر چٹرجی کا ذکر میں اس سے پہلے کر چکا ہوں۔ انھوں نے اپنی کتاب "انڈو ایرین اینڈ ہندی" میں اردو زبان اور اسکے اسلامی مزاج کے متعلق کچھ ایسی باتیں کہی ہیں جن کو عام طور سے ہندو دلوں میں رکھتے ہیں اور زبان سے ان کا اظہار نہیں کرتے۔ ذیل کے اقتباسات ذرا غور سے پڑھیے۔

۱۔ یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ ہند ہندوستانی (ہندی) سے جو مشرقی یوپی، بہار، نیپال، بنگال، آسام، اڑیسہ، اندھرا۔ ٹامل ناڈو۔ کرناٹ۔ کرالا۔ مہاراشٹر، گجرات، راجستھان کے لوگوں کو دلچسپی ہے وہ دو وجہ سے ہے ایک اس وجہ سے کہ وہ دیوناگری حروف میں لکھی جاتی ہے۔ دوسرے اس وجہ سے کہ اس کے الفاظ سنسکرت سے لیے گئے ہیں[۱]"

۲۔ "اگر ہندی سے سنسکرت الفاظ کم کر کے سنسکرت کو ثانوی حیثیت دی گئی تو ہم اسے ہندی روایات اور ہندی کلچر پر براہ راست حملہ تصور کریں گے۔ اگر عربی و فارسی ذخیروں سے ہندی میں الفاظ مستعار لئے گئے تو یہ اس بات کا کھلا ہوا اعلان ہو گا کہ ہندوستان تہذیبی معاملات میں مفلس ہے اور سنسکرت بے جان زبان ہے۔ وہ کونسا سچا ہندوستانی ہے۔ خصوصیت کے ساتھ اگر وہ ہندو بھی ہے جو سنسکرت لفظ گنزٹ کو چھوڑ کر عربی لفظ ہندسہ[۲] اختیار کرے گا۔ کیا ہم ترکون کی جگہ "مثلث" استعمال کریں؟ کیا قومی عزت نفس کا شعور رکھنے کے باوجود کوئی ہندوستانی یہ پسند کر سکتا ہے کہ وہ سائنس، ادب، اور فلسفہ کی اصطلاحیں عربی سے لے حالانکہ ان کی جگہ سنسکرت اصطلاحیں موجود ہیں جو کم سے کم ہندوستان میں مستعمل بھی ہیں[۳]"

---

[۱] انڈو ایرین اینڈ ہندی صفحہ ۳۲۲ [۲] گنزٹ ہندسہ نہیں حساب ہے ہندسہ جیومیٹری کو کہتے ہیں [۳] انڈو ایرین اینڈ ہندی صفحہ ۲۲۴۔

ہندو نے اُردو کو اس کے عربی عناصر کی بنا پر مسلمانوں کی قومی زبان ٹھہرایا اور ہندوستان کی تقسیم سے پہلے اس کی مخالفت میں ایڑی چوٹی کا زور لگایا۔ وہ ہندوستان کے مسلمانوں کے قومی اتحاد اور قومی شعور کی تربیت برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ ہندو کو معلوم تھا ہندوستان میں عربی زبان کتنی ہی کیوں نہ پڑھی جائے اور اس کی تعلیم کو کیسا ہی عام کیوں نہ کیا جائے وہ مسلمانوں کی عام زبان نہیں بن سکتی اور اس کے رواج سے ہندو کے بلا شرکت غیرے ہندوستان پر حکومت کرنے کے منصوبوں پر کوئی برا اثر نہیں پڑتا۔ اُسے خطرہ اردو سے تھا۔ اس لئے اس نے ہندوؤں کے مذہبی جذبات اور قومی تعصبات کو اُردو کے خلاف اُبھارا اور اس پر عرب دوستی کا الزام لگایا۔ چٹرجی کے مندرجہ ذیل اقتباس سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ یہ فقرہ انھوں نے اردو کے عربی عنصر کی بابت لکھا ہے۔

"مسلمانوں کی تالیف قلوب کے باوجود کوئی سچا ہندوستانی ہرگز یہ گوارا نہیں کرے گا کہ وہ سنسکرت کو عربی کی قربان گاہ پر چڑھا دے[1]"

اردو اور بنگال

ویسے تو اردو کے خلاف ہنگامہ آرائی غیر منقسم ہندوستان کے ہر صوبے میں ہوئی اور مادرِ ہند کے ہر سپوت نے اس کی کمر توڑنے کی کوشش کی۔ لیکن بنگال نے اس کی مخالفت میں دوسرے صوبے کے ہندوؤں سے زیادہ حصہ لیا اور صحیح یا غلط طور پر یہ پروپیگنڈا کیا کہ اُردو کا رواج اور اسکی اشاعت بنگلا زبان کے لئے زہر قاتل کا حکم رکھتی ہے۔ اگر اُردو، جو عربی حروف میں لکھی جاتی ہے غیر منقسم ہندوستان کی قومی زبان مان لی گئی تو اس سے بنگلا کا تار و پود

---

[1] انڈو ایرین اینڈ ہندی صفحہ ۲۲۴

بکھر جائے گا۔ بنگال کے بھولے بھالے مسلمانوں کی آنکھوں پر پٹیاں باندھ کر انھوں نے بنگلا کو سنسکرت سے گراں بار بنانے میں جو کامیابی حاصل کی ہو اُردو کے رواج سے اس پر پانی پھر جائے گا۔ اُردو کو دیکھ کر بنگالی مسلمان کی آنکھیں کھلیں گی اور وہ بھی اردو بولنے والے مسلمان بھائیوں کی طرح بنگلا میں عربی کے تہذیبی الفاظ بھرنے کی کوشش کریں گے۔ اور اس کا مطالبہ کریں گے کہ اردو اور پنجابی کی طرح بنگلا کو بھی عربی حروف میں لکھا جائے۔ یہ میرا قیاس نہیں حقیقت ہے اور خود ڈاکٹر چٹرجی نے اس کا اعتراف ذیل کے الفاظ میں کیا ہے:۔

"وہ ہندوستانی زبان جس میں سنسکرت کے ساتھ سرد مہری برتی گئی ہے ہندستان کی دوسری جدید آریائی زبانوں پر بھی اثر انداز ہو سکتی ہے۔ چنانچہ بنگال میں پہلے ہی سے اس قسم کی ہندستانی زبان کی مخالفت ظہر کرتی جا رہی ہے بنگال ہی ایک ایسا صوبہ ہے جس نے ہندستانی (اردو) کو کبھی خوش آمدید نہیں کہا اور محدود طور سے کثر قسم کی سنسکرت آمیز ہندی کی تائید کی۔ ہندستانی (اردو) کی مخالفت کی وجہ یہ ہے کہ اگر فارسی آمیز ہندستانی (جس میں عربی الفاظ کی بھرمار ہے) ملک میں رواج پا گئی تو اس بات کا خطرہ ہے کہ اس کے زیر اثر بنگلا کا تار و پود بکھر جائے اور اردو کی دیکھا دیکھی یہ مطالبہ کیا جائے (شاید بنگالی مسلمان کی طرف سے) کہ ایک ایسی بنگلا زبان کا ڈول ڈالو جس میں تہذیبی الفاظ سنسکرت کے بجائے عربی سے لئے گئے ہوں[1]۔"

ڈاکٹر چٹرجی نے یہ الفاظ اکتوبر سنہ ۱۹۴۰ء میں پاکستان کے قیام سے پورے سات سال پہلے لکھے تھے۔ ان سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ بنگال میں

---

[1] انڈو ایرین اینڈ ہندی صفحہ ۲۲۸۔

قیام پاکستان سے بہت پہلے اردو کے خلاف پروپیگنڈا شروع ہو گیا تھا۔ اور بنگال کے ہندو بنگلا زبان کو سنسکریت کی بنیادوں پر مستحکم کر کے اس کو ہندوانہ سنسکرتی (تہذیب) میں اچھی طرح رنگ چکے تھے۔ بنگال کے مسلمان بڑے بدھے اور بھولے تھے۔ انھیں ہندوؤں کی شاطرانہ چالوں کا احساس نہ ہوا۔ ہندو نے بنگلا زبان، بنگلا تہذیب، بنگلا قومیت کا منتر پھونک کر کلمہ گو کو غفلت کی میٹھی نیند سلا دیا۔

بنگالی مسلمان اور اردو

قومی احساس بڑی چیز ہے۔ یوپی، بہار وغیرہ صوبوں کے ہندو عام طور سے اُردو لکھتے پڑھتے تھے۔ ان کی مادری زبان اردو تھی جو ان کے گھروں میں بولی جاتی تھی۔ لیکن جب انھیں یہ احساس دلایا گیا کہ وہ ہندو ہیں۔ اردو کے تمام تہذیبی الفاظ اور علمی اصطلاحیں عربی سے لی گئی ہیں۔ اور وہ عربی حروف میں لکھی جاتی ہے تو وہ چونک پڑے۔ ان کی قومی عصبیت بیدار ہو گئی انھوں نے آہستہ آہستہ عربی الفاظ نکال کر اُن کی جگہ خالص سنسکرت الفاظ بھر دیئے۔ عربی کی زندہ اور جاندار اصطلاحیں چھوڑ کر سنسکرت کی مردہ اصطلاحیں گھڑ لیں۔ اور اس طرح ایک بالکل نئی اور مصنوعی زبان کا ڈول ڈالا۔ اور اسے دیوناگری حروف میں ڈھال کر یہ دعوے کیا کہ یہ "ہندی ہندستھانی" ہے جو ہماری قومی زبان ہے۔ اردو مسلمان کی تہذیب کی آئینہ دار ہے۔ وہ ہندو کی قومی زبان نہیں ہو سکتی۔ یہ سلوک انھوں نے اس اُردو کے ساتھ کیا جو اصلیت کے لحاظ سے ہندوستان کی پیداوار تھی۔ جس کی بڑی پرانی شاندار تاریخ تھی، جو ان کے گھروں میں پلی، بڑھی اور پروان چڑھی تھی۔ جس نے انھیں بولنا سکھایا تھا۔ جس میں انھوں نے اپنے اعلیٰ خیالات کا اظہار

کیا تھا اور پنڈت برج نرائن چکبست و دیا شنکر نسیم جیسے شاعر پریم چند و سرشار جیسے نثر نگار پیدا کئے تھے۔ محض ہندو قومیت اور ہندو تہذیب کے نام پر انھوں نے اپنی زبان سے ایک ہزار برس پرانا ناتا توڑ کر ایک مصنوعی زبان سے رشتہ جوڑ لیا۔ اور اپنے شاندار کارناموں پر خاک ڈال دی۔

بنگال کے مسلمان کی آنکھ نہ کھلنی تھی نہ کھلی۔ پاکستان کے قیام کے بعد بھی وہ بنگلا زبان اور بنگلا تہذیب کے خواب دیکھتا رہا۔ اسے یوپی کے ہندو سے سبق لینا چاہیے تھا۔ بنگلا کے سنسکرت عناصر اور ہندوانہ حروف سے اسے نفرت کرنی چاہیے تھی۔ بنگالی ہندو نے "اردو میں سنسکرت عنصر کی ثانوی حیثیت کو ہندی روایات اور ہندی کلچر پر براہ راست حملہ تصور کیا تھا" بنگالی مسلمان کو بنگلا میں عربی عنصر کی ثانوی حیثیت کو اسلامی روایات اور پاکستانی کلچر کے خلاف چیلنج سمجھنا چاہیے تھا۔ ہندو نے اردو میں فارسی و عربی الفاظ کے شمول کو اس امر کا اعلان خیال کیا تھا کہ ہندوستان تہذیبی معاملات میں مفلس ہے اور سنسکرت مردہ۔ بنگالی مسلمان کو بنگلا میں سنسکرت لفظوں کی بھرمار پاکستانی تہذیب کا افلاس اور عربی زبان کی موت نظر آنی چاہیے تھی۔ اگر بنگالی مسلمان کے جذبات اس قسم کے ہوتے تو آج پاکستان کی قومی زبان کا مسئلہ پاکستان کے لئے دردِ سر نہ بنتا اور جس طرح قائد نے اس کا حل کرنا چاہا تھا اسی طرح حل ہو جاتا۔

بنگلا اور اردو کا فرق

بنگلا اور اردو کا اختلاف اگر غور سے دیکھا جائے تو لسانی نہیں تہذیبی ہے۔ اردو ہندوستان کے مسلمان کی زندہ تہذیب کی پیداوار ہے اور اس کی فضا اسلامی ہے۔ اس کا مزاج اسلامی ہے۔ اس کی روح میں اسلامی معاشرت

رس بس گئی ہے۔ اس کے برعکس بنگلا کا مزاج اور اس کی جبلت تمام تر ہندوانہ سنسکرت تہذیب میں رچی ہوئی ہے۔ اردو اور بنگلا کسی زمانے میں صرف بول، چال میں کام آتی تھیں۔ وہ نری بولیاں تھیں۔ ان کے پاس عام الفاظ کی کمی تھی۔ ان کے ذخیرے تہذیبی الفاظ اور علمی اصطلاحوں سے خالی تھے۔ ان میں سنجیدہ اور ٹھوس موضوعات پر تصنیف و تالیف کا سلسلہ شروع نہیں ہوا تھا۔ اس لیے ان میں بیان کے طریقے اور بات کہنے کے انداز ناقص تھے۔ اوّل اوّل اردو اور بنگلا دونوں کو مسلمانوں نے اپنایا۔ اردو تو برابر مسلمانوں کے دامن سے وابستہ رہی اور وہ اس کو اپنے قومی مزاج کے مطابق ڈھالنے میں کامیاب ہو گئے لیکن بنگلہ کچھ عرصہ کے بعد مسلمانوں سے کٹ کر ہندوؤں کی گود میں جا بیٹھی جس نے سنسکرت کے منہاج پر ڈھال کر اسے بالکل ہندوانہ زبان بنا دیا۔

یہاں زبان اور بولی کا فرق ذہن نشین کر لینا چاہیے۔ بولی، جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے، روزانہ بات چیت کا ذریعہ اور عام کاروباری ضروریات کے اظہار کا آلہ ہے۔ روزمرہ کا لین دین بولی کے ذریعہ ہوتا ہے زبان بولی کی کسی قدر ترقی یافتہ صورت ہے۔ وہ اعلیٰ خیالات کے اظہار کے لیے ہے۔ اس میں بلند پایہ ادبی و علمی کتابیں لکھی جاتی ہیں۔ کسی ترقی یافتہ ملک کی ریاستی زبان ترقی یافتہ زبان ہی ہو سکتی ہے۔ معمولی بول چال کی زبان یا بولی سے یہ کام نہیں لیا جا سکتا۔ اردو اور بنگلا دونوں ترقی یافتہ زبانیں ہیں۔ دونوں نے بول چال کے ابتدائی درجے سے ترقی پائی۔ اردو نے یہ مقام عربی سے بیش از بیش استفادے کے بعد حاصل کیا اور بنگلا نے سنسکرت سے فیض حاصل کرنے کے بعد اردو نے تہذیبی الفاظ، علمی اصطلاحیں، بیان کے اسالیب، عربی یا فارسی سے لیے اور بنگلا نے سنسکرت سے۔ اردو کا رنگ

روپ عربی ہے اور بنگلا کا روپ سنسکرتی۔ اردو عربی لباس میں جلوہ آرا ہوئی اور بنگلا سنسکرت بھیس میں۔ اس لئے اردو کے ساتھ بنگلا کو پاکستان کی قومی زبان بنانا ایسا ہے جیسے عربی کے ساتھ سنسکرت کو شریک کرنا۔ یہ اسلامی قومیت کے منافی ہے۔ یہ ہندستان کی نام نہاد متحدہ قومیت ہے جس کے خلاف جنگ کر کے ہم نے پاکستان بنوایا۔

بنگلا یا سنسکرت

روزانہ بات چیت کی بنگلا پاکستان کی قومی زبان نہیں ہو سکتی۔ وہ سنسکرت آمیز علمی زبان ہی ہو سکتی ہے جس میں مشہور ماہر لسانیات ڈاکٹر گریرسن کے بقول ۸۸ فی صدی سے زیادہ سنسکرت الفاظ ہیں۔ جس کے تمام تہذیبی الفاظ سنسکرت کے ہیں۔ جس کی تمام علمی اصطلاحیں سنسکرت سے لی گئی ہیں۔ سوال اردو اور بنگلا کا نہیں عربی اور سنسکرت کا ہے۔ اردو کو پاکستان کی قومی زبان قرار دینا عربی کی جیت ہے اور بنگلا کو قومی زبان بنانا سنسکرت کی۔ اردو کو قومی زبان ٹھہرانا عربی حروف کی فتح ہے اور بنگلا کو اس کے ساتھ شریک کرنا دیوناگری حروف کی کامیابی۔ زبانیں دو قسم کی ہیں۔ تعمیری اور استفادی۔ اردو اور بنگلا استفادی زبانیں ہیں جو اصلی اور تعمیری زبان سے فیض حاصل کرنے کے بعد اس درجے کو پہنچی ہیں۔ اردو عربی سے استفادہ کرتی رہی اور عربی سے غذا حاصل کرتے کرتے اس کا مزاج عربی ہو گیا۔ اس کے مقابلے میں بنگلا نے سب کچھ سنسکرت سے لیا۔ اس لئے اس میں سنسکرت کی ساری خصوصیات موجود ہیں۔ بنگلا اگر پاکستان کی قومی زبان بنی تو اس میں عربی کے حسب ذیل الفاظ کی جگہ جو ہندوستانی مسلمانوں کی قومی ترقی کی بہترین علامات ہیں۔۔

سلطنت - وزیر - جماعت وزرا - مکتبہ - تعلیم - معلم - تقریر - عدلیہ - تعلیم نسواں - ایوان عام - قومی - ترقی - انقلاب - عالم -

ذیل کے سنسکرت الفاظ استعمال کرنے پڑیں گے :-

راشٹریہ - شچپ - منتری گنتر - کاریالیہ - شکشا - اُدھیاپک - بھاشنتر بچار بھاگ - مہلا - شکشا - لوک شبھا - جاتیہ - انتی - کرانتی - بدھبان -

بنگلا میں حساب، ہیئت، تاریخ، جغرافیہ، نباتات، معاشیات، ادب، قواعد، لسانیات اور فلسفہ وغیرہ علوم و فنون کے نام بھی سنسکرت کے ہیں اور ان کی اصطلاحیں بھی۔ یہ تمام نامانوس نام اور بے جان اصطلاحیں پاکستان کے بچّوں کو سکھائی جائیں گی اور ہندو کی دو ہزار سالہ کہنہ تہذیب کو جواب مردہ ہو چکی ہے پاکستان کی مقدس سرزمین میں قم باذن اللہ کہہ کر زندہ کیا جائے گا۔ کیا پاکستان اسی مقصد کے لئے بنایا گیا تھا؟

چٹرجی نے جو سوال ہندوؤں سے کیا تھا وہی سوال میں اپنے بنگالی مسلمان بھائیوں سے کرتا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ میرے بھائی مجھ سے زیادہ پکے مسلمان ہیں۔ دیکھوں وہ اس کا کیا جواب دیتے ہیں۔

کیا کوئی مسلمان یہ گوارا کر سکتا ہے کہ وہ عربی لفظ ریاضی کو چھوڑ کر سنسکرت لفظ گنتر استعمال کرے۔ کیا خودداری کے شعور کے باوجود کوئی مسلمان (یا پاکستانی) یہ پسند کر سکتا ہے کہ وہ فلسفہ، سائنس اور ادب کی اصطلاحیں مردہ زبان سنسکرت سے لے۔ (جو بھارتی ہندو کی مقدس قومی زبان ہے) جب کہ ان کی جگہ عربی کی اصطلاحیں موجود ہیں جو مغربی پاکستان اور سارے اسلامی دنیا میں مستعمل ہیں۔ اگر ہندو "ترکون" کی موجودگی میں "مثلث" استعمال نہیں کرتا تو بنگال کے مسلمانوں کو کیا مجبوری ہے کہ وہ "ترکون" کی

رٹے لگائے ؟ -

زبان اور ادب کا فرق

اس بحث میں زبان اور ادب کے فرق کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے اور بعض بنگالی اہل علم یہ کہتے سُنے جاتے ہیں کہ ہم بنگلا میں اسلامی ادب پیدا کریں گے۔ بنگلا پر دو اعتراض ہیں۔ ایک یہ کہ بنگلا روح اور رسم (spirit and script) کے اعتبار سے ہندوانی زبان ہے جس پر سنسکرتی تہذیب کی بڑی گہری چھاپ ہے۔ دوسرے یہ کہ بنگلا کی تربیت ہندوؤں اور پنڈتوں کے آغوش میں ہوئی اس لئے اس کا ادب (جسے خود بنگالی ادب کہتے ہیں اور اس پر فخر کرتے ہیں۔ اور جو یونیورسٹی میں پڑھایا جا رہا ہے) ہندو ذہن کی پیداوار ہے۔ اس پر ہندو دیو مالا، ہندی افکار و نظریات کا دھندلکا چھایا ہوا ہے۔ پوتھی ادب صندوقوں میں بند عجائب گھروں میں پڑا ہے اور نیا اسلامی ادب لکھنے والوں کے دماغوں میں! ابراہیم خاں صاحب دستور ساز مجلس کے ایک رکن ہیں۔ انھوں نے اپنے ایک مضمون میں ان دو اعتراضوں کا جواب دینے کی کوشش کی ہے لیکن انھوں نے بنگلا زبان کی بابت کچھ نہیں لکھا۔ صرف بنگلا ادب کے بارے میں اتنا لکھا ہے کہ بنگلا میں مسلمانی ادب بھی ہے اور آئندہ اور لکھا جائے گا۔ بنگلا کے مسلمانی ادب کی کیا حیثیت ہے۔ یہ میں اوپر لکھ آیا ہوں۔ اسے کوئی بنگالی ہاتھ نہیں لگاتا۔ صرف علاول کو پڑھا جاتا ہے جس کی بابت چٹرجی نے لکھا ہے "ان کی کتاب پدماوتی ایسی ہی ثقیل سنسکرتی زبان میں ہے جیسے اُن کے ہم عصر ہندوؤں کی کتابیں[1]" آئندہ اسلامی ادب کا پروگرام بھی کامیاب ہوتا نظر نہیں آتا۔ یہ صرف اسی صورت میں کامیاب ہو سکتا ہے،

---

[1] مقدمہ بنگالی کا آغاز و ارتقا ص۱ ۔

جب ابراہیم خاں صاحب اپنی زبان کا مزاج بدلنے کو تیار ہوں۔ وہ خود فرماتے ہیں کہ ہمارے نبیؐ نے عربی زبان کا مزاج بدلا اور اس مشرکانہ زبان کو اسلامی قالب میں ڈھال کر اسلامی بنایا۔ کیا ابراہیم خاں صاحب اس کے لئے تیار ہیں کہ بنگلا کا مزاج بدلیں۔ جب تک بنگلا کا ہندوانہ مزاج قائم ہے وہ اسلامی ادب بنگلا میں پیدا نہیں کر سکتے۔ میں اوپر کی سطروں میں تفصیل کے ساتھ لکھ آیا ہوں کہ بنگلا کے ہندوانی مزاج سے کیا مراد ہے۔ اور وہ کونسی خصوصیات ہیں جن کی بنا پر بنگلا کو ہندوانی زبان کہا جاتا ہے۔ اس کے بعد کسی مزید سند کی ضرورت نہ تھی۔ لیکن میں اپنے دوست ابراہیم خاں صاحب کے اطمینانِ خاطر کے لئے بنگلا کے مشہور عالم اور زبان کے ماہر ڈاکٹر چیٹرجی کی کتاب سے ایک اقتباس دے رہا ہوں جس میں اس عالم نے بنگلا کی سنسکرتی اسپرٹ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس کے اثر سے بنگال کے نوجوان مسلمان بنگلا میں ہندوانہ ادب کی تخلیق کر رہے ہیں۔

"جو مسلمان اسکولوں اور کالجوں کے تربیت یافتہ ہیں وہ بنگلا اسالیب کے استعمال میں اپنے کو اپنے ہندو عزیزوں (Kinmen) سے ممتاز نہیں سمجھتے۔ بنگلا کے ہندو مصنفین کے پہلو بہ پہلو مسلمان مصنفوں کی ایک بڑی تعداد ہے جن میں سے بعض نے قومی ادب میں قابل قدر اضافہ کیا ہے۔ مسلمان شعراء اور نثر نگاروں کی نئی نسل قدیم ادبی بنگلا کو سنسکرت کی بنیاد پر ایک قدرتی زبان بنانے اور سنسکرتی زبان کی حیثیت سے اس کی اصل اسپرٹ برقرار رکھنے میں بیش از بیش حصہ لے رہی ہے"[1]

---

[1] بنگالی کا آغاز و ارتقا مقدمہ ضمیمہ "د"، صفحہ ۲۱۰۔

کالج اور اسکول کے تربیت یافتہ مسلمان نوجوان جن کا ذکر ڈاکٹر چٹرجی نے کیا ہے قیام پاکستان کے بعد مشرقی پاکستان کی پوری سیاست پر چھا گئے ہیں عام مسلمانوں کی قیادت کی باگ انہی کے ہاتھ میں ہے۔ یہ مستقبل کے رہنما آج کے قائد ہیں۔ اور چٹرجی نے ان کی بابت صاف صاف لکھا ہے کہ وہ بنگالی "سنسکرتی اسپرٹ" قائم رکھنے میں اپنے ہندو بھائیوں کا ہاتھ بٹا رہے ہیں۔ کیا اس سے بڑھ کر کسی شہادت کی ضرورت ہے؟

مشرقی پاکستان کے ہندو اور اُردو

پاکستان کے قیام سے پہلے ہندو نے پوری کوشش کی کہ عربی حروف میں لکھی جانے والی اُردو غیر منقسم ہندوستان کی قومی زبان بننے نہ پائے۔ پاکستان کے وجود میں آنے کے بعد بظاہر اُن کی یہ کوششیں ختم ہو جانی چاہیے تھیں۔ پاکستان ہندوستانی مسلمان کے کلچر اور مذہب کے تحفظ کے لئے قائم ہوا تھا۔ اور اُردو اس کلچر کی صحیح نمائندہ تھی اس لئے اُردو کے سوا پاکستان کی علاقائی بولیوں میں سے کسی میں بھی پاکستان کی قومی زبان بننے کی صلاحیت نہ تھی۔ اس کے علاوہ وہ پاکستان کی سب سے زیادہ بولی جانے والی اور سمجھی جانے والی زبان تھی اس کا کسی ایک صوبے سے خصوصی تعلق نہ تھا۔ پاکستان کے تمام صوبوں سے وہ یکساں تہذیبی تعلق رکھتی تھی۔ پنجاب کے مسلمان کو بھی وہ ایسی ہی عزیز تھی جیسے بہار اور بنگال کے مسلمانوں کو۔ ڈاکٹر چٹرجی لکھتے ہیں :-

"اُردو بہار۔ مشرقی یوپی۔ پنجاب۔ بنگال۔ آسام۔ اُڑیسہ۔ مہاراشٹر گجرات۔ سندھ اور جنوبی ہند کے دراوڑ زبانیں بولنے والے مسلمانوں کے لئے یکساں طور پر ایک بڑی ثقافتی زبان ......

(Great Culture Language) کی حیثیت رکھتی ہے[1]"

لیکن پاکستان کے قیام کے بعد اردو کی مخالفت میں ہندو کی سرگرمیاں گھٹنے کی بجائے اور بڑھیں اور ابھی پاکستان کو قائم ہوئے چھ ماہ بھی نہ گزرے تھے کہ مشرقی پاکستان کے ایک ممتاز ہندو لیڈر دی۔ این دتا نے مجلس دستورساز کے اجلاس فروری ۱۹۴۸ء میں ایک قاعدے کی ترمیم کے سلسلے میں یہ اعلان کردیا کہ بنگلا اور صرف بنگلا پاکستان کی قومی زبان بن سکتی ہے۔ اسلئے کہ:-

• پاکستان کے چھ کروڑ اور نوے لاکھ باشندوں میں سے چار کروڑ چالیس لاکھ بنگلا زبان بولتے ہیں۔ وہ پاکستان کی اکثریت کی زبان ہے۔ اس لئے جناب صدر! میرا خیال ہے کہ بنگالی ہماری ریاست کی (Linguafranca) ہے[2]"

کالج اور اسکول کے بنگالی مسلمان طلبہ۔ جو ہندوؤں کے تربیت یافتہ تھے شیر بنگال دتا کی اس گرج کے بعد بنگلا کی حمایت میں اٹھ کھڑے ہوئے۔ میں اس وقت بنگال میں نہ تھا لیکن مجھے معتبر ذرائع سے پتا چلا ہے کہ ۱۹۴۸ء کی اس شورش میں اردو کے خلاف نوجوان طلبہ کے جذبات اس قدر مشتعل کردیے گئے تھے کہ اردو بولنے پر تہدید کی جاتی تھی۔ اردو بولنے والے چپراسیوں اور دربانوں کو مجبور کیا جاتا تھا کہ وہ اپنی زبان میں عربی لفظ استعمال نہ کریں، آخر قائداعظم مارچ ۱۹۴۸ء میں بنگال تشریف لائے۔ اور انھوں نے ایک بڑے مجمع کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ پاکستان کی قومی زبان اردو ہے۔ جو اس کے

---

[1] انڈو ایرین اینڈ ہندی صفحہ ۱۴۸

[2] ملاحظہ فرمایئے روداد مجلس دستورساز جلد ۲ نمبر ۲ صفحہ ۱۲

خلاف آواز اٹھاتا ہے وہ ملک کا دشمن اور قوم کا غدار ہے۔

ایک غلط استدلال

یہ بہت ہی غلط اور گمراہ کن استدلال ہے کہ بنگلا پاکستان کی اکثریت کی زبان ہے اس لئے اسے قومی زبان بنایا جائے یا اردو کی مساوی اس کو درجہ دیا جائے۔ جس ملک میں ایک سے زیادہ زبانیں بولی جاتی ہیں وہاں ریاستی زبان کا درجہ اس زبان کو دیا جاتا ہے جو اس ملک کے کلچر کی نمائندگی کرتی ہے جیسے ہندستان میں ہندی اور روس کی اشتراکی ریاستوں میں روسی۔ یا جس کے جاننے اور سمجھنے والوں کی تعداد سب سے زیادہ ہوتی ہے۔ جو کسی ایک علاقہ میں محدود نہیں ہوتی بلکہ ملک کے ایک گوشہ سے دوسرے گوشہ تک چپہ چپہ پر بولی جاتی ہے۔ اس قسم کی زبان "لنگوا فرینکا" کہلاتی ہے۔ اور کثیر الاستعمال اور عام ہونے کے باعث اسے ملک کی قومی زبان بھی کہتے ہیں۔ اس کے لئے ضروری نہیں کہ وہ مادری زبان کی حیثیت سے بولی جاتی ہو۔ چینی زبان بولنے والوں کی تعداد سب سے زیادہ ہے لیکن وہ دنیا کی عام زبان نہیں۔ انگریزی بول چال کی زبان کی حیثیت سے صرف برطانیہ اور امریکہ آسٹریلیا کے ایک حصہ میں رائج ہے۔ لیکن پھر بھی وہ "لنگوا فرینکا" ہے۔ اور دنیا کے ہر گوشے میں اس کے جاننے والے موجود ہیں۔ اردو کا بھی یہی حال ہے۔ وہ پاکستان کی سب سے زیادہ سمجھی جانے والی اور عام زبان ہے۔ وہ تہذیبی زبان بھی ہے اور کاروباری بھی۔ جغرافیائی عمومیت بھی اسے حاصل ہے اور عددی وسعت بھی۔ پاکستان کے ہر علاقے میں اس کے بولنے اور سمجھنے والے ہیں، اور ان کی تعداد صرف بنگلا بولنے والوں سے کہیں زیادہ ہے۔ یہ آج کی بات نہیں۔ ہندستان کی تقسیم سے پہلے بھی وہ براعظم کی عام اور کثیر الاستعمال زبان

کی حیثیت رکھتی تھی ۔ یہ میں نہیں کہتا بلکہ بنگال ہی کا ایک سپوت کہتا ہے جو شری دتا اور مہاشے شہید اللہ سے کہیں زیادہ ان باتوں کو جانتا ہے ۔

"ہندستانی (ایک طرف) افغانستان سے برما اور ہمالیہ سے دکن تک (دوسری طرف) کراچی و پشاور سے ڈبرو گڑھ و چاٹ گام تک اور سری نگر و بدری ناتھ سے حیدر آباد و بنگلور تک بولی اور سمجھی جاتی ہے[1]"

بنگالی مسلمان بنگلا کو پاکستان کی اکثریت کی زبان بتاتے وقت یہ بھول جاتے ہیں کہ غیر بنگالی مسلمان جو ملک کے مغربی حصے میں بستے ہیں بنگلا بالکل نہیں جانتے ۔ مشرقی بنگال کے بنگالی و غیر بنگالی ہندو اور مسلمانوں کی ایک ..... بڑی تعداد اردو سے واقف ہے ۔ اور "بنگال و آسام میں آسان قسم کی اردو عام طور سے (Universally) سمجھی جاتی ہے" (چٹرجی صفحہ ۱۳۶) بلکہ ڈھاکہ اور سلہٹ وغیرہ شہروں کی زبان اُردو ہے ۔

بھودیو مکرجی بنگال کا مشہور مصنف ہے ۔ اس نے ۱۸۹۲ء سے کچھ پہلے اپنی ایک کتاب میں، ہندستانی کو غیر منقسم ہندوستان کی ممتاز ترین اور برعظیم کی عام زبان بتایا تھا اور لکھا تھا کہ ہم سب کو مسلمان کا شکر گزار ہونا چاہیے۔ ہندستان کی لسانی وحدت اس کی مبارک کوششوں کا نتیجہ ہے ۔ میں مکرجی کے الفاظ اصل بنگلا زبان میں نقل کر رہا ہوں ۔

"بھارت باشیر چلت بھاشا گلر مدھیے ہندی ۔ ہندستھانی ای پردھان ۔ ایوم مسلمان دگیر کلیانے اُہا شمشت مہا دیش بیا پک اتہ ایو انومان کرا جائتے پارے ۔ جے اُہا کے اوبلمبن کریا ۔ ای

---

[1] انڈو ایرین اینڈ ہندی صفحہ ۱۴۰ ۔

کونو دور درتی بھو شیہ کالے شمشرت بھارت بر شیر بھاشا سمّلت تھا کپے" [1]

ترجمہ:- ہندستان میں جو زبانیں رائج ہیں۔ ہندی - ہندستھانی ان میں ممتاز ہے۔ مسلمانوں کی عنایت سے وہ برصغیر کے ہر حصے میں پھیل گئی ہے۔ اس لئے قیاس کیا جاتا ہے کہ مستقبل قریب میں سارے ہندستان کی بولیاں اس زبان کو بنیاد قرار دے کر ہی متحد رہ سکیں گی۔

مگر جی ہندستانی کی بابت پیشین گوئی کرتے ہیں کہ وہ غیر منقسم ہندستان کی تمام جدید بولیوں کا منبع قرار پائے گی۔ ہندستان میں ان کی یہ پیشین گوئی پوری ہو رہی ہے لیکن ہماری بدقسمتی سے پاکستان کے بنگالی مسلمان بھائی ہندوؤں کے بھرے میں آکر اس پیشین گوئی کو غلط ثابت کرنے کی فکر میں ہیں

ایک قوم ایک زبان

اُردو اور بنگلا کا جو مختصر تقابلی مطالعہ اوپر کی سطروں میں پیش کیا گیا اس سے دو نتیجے برآمد ہوتے ہیں۔

الف۔ اُردو اور صرف اُردو پاکستان کی قومی زبان ہو سکتی ہے۔

ب۔ بنگلا سنسکرت آمیز ہندوانہ زبان اور خالص ہندو معاشرت کی ترجمان ہونے کے باعث پاکستان کی مسلمانی ریاست کی قومی زبان ہرگز نہیں ہو سکتی

اُردو کے ساتھ بنگلا کو قومی زبان کی حیثیت دینا نتیجہ (ا ب) کی رو سے پاکستان کی توانا اور پختہ اسلامی قومیت کی تعمیر کے لئے جو پاکستان کے قیام کا واحد مقصد ہے، سخت مضر ہے۔ دوسرے اس وجہ سے بھی نامناسب ہے کہ پاکستانی ایک قوم ہے اور ایک قوم کی ایک ہی زبان (قومی زبان) ہو سکتی

---

[1] اچر پر بندھ صفحہ ۱۹۰ -

ہے۔ وحدت لسان وحدت قومی کا سب سے بڑا اہم عنصر ہے مشہور جرمن ماہر اجتماعیات فخٹے نے لکھا ہے "یہ قومی وحدت دیکانگت کا سب سے بڑا اور مضبوط رشتہ وحدت لسان ہے[1]۔" جن ملکوں میں ایک سے زیادہ زبانوں کو ریاستی زبان قرار دیا گیا وہاں کسی ایک زبان کو قومی حیثیت حاصل نہ تھی سب زبانیں ایک درجے کی تھیں۔ مثلاً فرانسیسی اور انگریزی کنیڈا میں، اور فرانسیسی اطالوی جرمن وغیرہ سوئیزرلینڈ میں۔ یہ زبانیں ان ممالک میں مساوی درجے کی ہیں۔ اور ان میں سے کسی کو بھی ان ملکوں کے تمام باشندوں سے کوئی تہذیبی نظریاتی، تاریخی تعلق نہیں جیسا کہ اردو کا پاکستان کے باشندوں سے ہے۔ وہ بنگال کی تہذیبی زبان ہے جسے بنگال کا دیہاتی مسلمان "بنی جی کا بھاشا" کے نام سے یاد کرتا ہے۔

کنیڈا اور سوئٹزرلینڈ وغیرہ ممالک کی کوئی ایک قومی زبان نہیں اس لئے یہاں کے مختلف زبانیں بولنے والوں کے درمیان رشتہ اتحاد کمزور ہے۔ سیاسیات کے ماہروں نے ان ممالک کے باشندوں کو کئی قوموں کی ترکیب کا نتیجہ بتایا ہے اور ان کے لئے مرکب یا ملتف (Compound or Complex) قومیت کی نئی اصطلاح وضع کی ہے[2]۔

اس کے علاوہ اُردو اور بنگلا کے حروف بھی مختلف ہیں۔ حروف کی وحدت زبان کی وحدت سے زیادہ ضروری ہے۔ زبان کے مزاج اور اس کی سرشت بنانے میں کم سے کم زبان کے لفظی سرمایہ سے حروف کو زیادہ دخل ہے۔ شروع

---

[1] گریرسن :- ہندوستانی قومیت صفحہ ۱۱

[2] گریرسن :- ہندوستانی قومیت صفحہ ۲۲۹

شروع میں جب اُردو کے خلاف بنارس کے ہندوؤں نے ایک محاذ بنایا اور ہندی کے پرچار کے لئے ایک انجمن کی بنا ڈالی تو اس کا نام "ناگری پرچارنی سبھا" رکھا۔ اس لئے کہ بقول ڈاکٹر چٹرجی وہ جانتے تھے کہ :-

"عربی آمیز زبان اگر دیونا گری حروف میں لکھی جاتی ہے۔ تو سب ٹھیک ہے[1]"

جن ممالک میں ایک سے زیادہ زبانیں ہیں وہاں ان زبانوں کا رسم خط واحد ہے۔ پاکستان نے عربی حروف کے ساتھ بنگلا رسم خط کو رواج دے کر ایک بالکل نئی مثال قائم کی ہے۔

---

[1] انڈو ایرین اینڈ ہندی صفحہ ۲۱۵

اردو کے پچیس سال

(۱۹۲۵ ـــــ ۱۹۵۰)

ممکن ہے آپ کو یہ عنوان پڑھ کر تعجب ہو اور آپ تابڑ توڑ سوال کرنے لگیں۔ "کیوں صاحب! کیا زبان کی بھی کوئی زندگی ہے جس کا جائزہ لیا جا سکے؟ کیا اس پر موت بھی طاری ہوتی ہے؟ کیا وہ مردہ اور بے جان بھی ہو سکتی ہے؟" سو میں آپکو پہلے ہی بتائے دیتا ہوں کہ زبان ایک زندہ شے ہے جس کی زندگی اس کے نمو سے ہے۔ جب تک زبان بڑھتی اور پھیلتی ہے۔ تراش خراش، ردوبدل، ترک و اختیار کا عمل اس میں جاری رہتا ہے وہ زندہ رہتی ہے۔ جب اس کی ترقی رک جاتی ہے۔ وہ کسی ایک منزل پر پہنچ کر ٹھہر جاتی ہے تو مر جاتی ہے۔ سنسکرت، لاطینی، سریانی، کلدانی وغیرہ زبانیں کسی زمانے میں زندہ تھیں۔ آج مردہ ہیں اس لئے کہ ان کا ارتقا رک چکا ہے۔ آج سے پہلے وہ جہاں تھیں آج بھی وہیں ہیں۔ ان میں جمود آگیا ہے۔

لیکن زبان کی زندگی ایک عام حیوان کی زندگی سے ذرا مختلف ہے۔ ایک عام

حیوان کی زندگی محدود ہوتی ہے۔ زبان کی زندگی نامحدود ہے۔ حیوان ضعیف اور کمزور ہو کر مر جاتا ہے۔ زبان اگر معالی وروان ہے تو ہر دم جوان ہے۔ حیوان کی زندگی میں مہینوں کی اہمیت بھی ہے۔ زبان کی زندگی میں سال اور کبھی کبھی صدیاں تک ہیچ ہیں۔ حیوان میں جلد جلد تغیرات ہوتے ہیں۔ زبان کہیں صدیوں کے بعد جا کر بدلتی ہے۔ اسلئے کسی زبان کی پچیس سال کی زندگی کا جائزہ لینا ایسا ہے جیسے یہ دیکھنا کہ ایک بچے نے پچیس دن میں کیا ترقی کی اور اس کے اعضا میں کیا کیا تبدیلیاں ہوئیں۔ یہ اور بات ہے کہ سب زبانیں ایک جیسی نہیں کچھ تیز گام ہیں اور کچھ سست رفتار۔ زبان کا سماج سے گہرا رشتہ ہے۔ معاشرے میں جو سیاسی ادبی اور معاشی تبدیلیاں ہوتی ہیں ان کا زبان پر اثر پڑتا ہے اور وہ بھی معاشرے کے ساتھ ساتھ روپ بدل لیتی ہے۔ گذشتہ تین سو سال میں انگریزی زبان جن ہنگامہ آفریں دوروں سے گزری عربی کو ان کا سامنا کرنا نہیں پڑا اس لیے اس عرصہ میں انگریزی کچھ سے کچھ ہو گئی عربی اسی منزل میں ہے۔

اردو اگرچہ قدیم زبان ہے اور اس نے لیل و نہار کی بہت سی گردشیں دیکھی ہیں۔ لیکن ادبی اور تحریری زبان کی حیثیت اختیار کئے اسے ابھی زیادہ زمانہ نہیں گزرا۔ وہ مسلمان فاتحین کی سرپرستی سے پہلے دہلی اور اس کے نواح میں صرف بول چال کی زبان تھی۔ روزانہ بات چیت اور کاروبار اس کے ذریعہ ہوتا تھا اس کے الفاظ کا سرمایہ محدود تھا۔ بات کہنے کے انداز سادہ اور اسی قسم کے تھے۔ اول اول وہ شعر و ادب کی ترجمان بنی اس وقت فارسی اور ہندی بھاکا شاعری کے دو نمونے اس کے سامنے تھے۔ اس نے دونوں سے استفادہ کیا۔ الفاظ، محاورات، کنائے، اشارے، اسالیب لے کر اپنی تہی دامنی کا عیب مٹایا ہنسنا، بولنا، لکھنا۔ چھیڑ چھاڑ کے طریقے۔ دلربائی کے انداز، عشق و الفت کے

چونچلے اختیار کئے۔ اس سے آگے اس نے ایک قدم نہ رکھا۔ ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے ساتھ اردو زبان میں بھی انقلاب آیا۔ سرسید نے سب سے پہلے محسوس کیا کہ اردو ابھی بچہ ہے۔ بچوں کی طرح کلکاریاں بھرتی ہے۔ کٹی پھٹی باتیں کرتی ہے۔ سرسید کی ادبی اور اصلاحی تحریک کے ساتھ ساتھ اردو نے عہد بلوغ میں قدم رکھا۔ اس میں پختگی سنجیدگی، شائستگی اور متانت آئی۔ سرسید اور ان کے رفقا نے سنجیدہ علمی اور ادبی تصانیف اور مقالات کی مدد سے اردو کو مرتب، مسلسل منطقی انداز میں گفتگو کرنا سکھایا۔

سرسید کے دور کا آغاز ۱۸۵۷ء کے بعد سے ہوا اور پہلی بڑی لڑائی تک ختم ہو گیا حالی اور شبلی جنھوں نے سرسید کی ڈالی ہوئی بنیاد کو بلند کیا پہلی بڑی لڑائی سے پہلے ہی انتقال کر چکے تھے ۱۹۱۴ء سے ۱۹۲۰ء تک کا زمانہ اردو کی زندگی کا عبوری دور ہے۔ اس کے بعد اردو کی نئی زندگی کا آغاز ہوا۔ سرسید نذیر احمد حالی اور شبلی نے اردو کو جس ڈگر پر ڈالا تھا۔ اس پر تیزی سے چلتی رہی منزلوں پر منزلیں مارتی رہی ۱۹۳۵ء تک اس کی یہ کیفیت رہی اس کے بعد اس کے راستے میں ایک نیا موڑ آیا جس نے اس کی ترقی کا رخ پھیر دیا۔ اب وہ اسی رخ آگے کی طرف بڑھ رہی ہے۔

سرسید نے اردو کو جو نئی راہ دکھائی یہاں اس کی وضاحت ضروری ہے۔ سرسید انگریز دوستی میں بہت بدنام ہیں اور اس میں شک نہیں کہ انگریزی تمدن کے وہ دلدادہ تھے۔ لیکن انھیں اپنا مذہب ادبی روایات اور زبان بھی اتنی ہی عزیز تھی۔ سرسید اردو کو انگریزی کا ہمسر دیکھنا چاہتے تھے۔ انھوں نے انگریزی تمدن اختیار کرنے کا مشورہ قوم کو بلا سے دیا ہو لیکن اس میں شبہ نہیں کہ انگریزی زبان اپنانے کا انھوں نے ہرگز مشورہ نہیں دیا۔ سرسید کے زمانے میں بہت سے انگریزی الفاظ اردو میں منتقل ہوئے۔ انگریزی سے ترجمہ کرتے وقت انگریزی اسالیب کو اردو کے مزاج کے مطابق نئے قالب میں ڈھالا گیا۔ اس سے

زبان میں وسعت آئی۔ الفاظ کا ذخیرہ بڑھا۔ ترکیبوں میں اضافہ ہوا۔ اگرچہ نئے الفاظ کے ساتھ کچھ انگریزی الفاظ بھی اردو میں در آئے جو حالی، نذیر احمد اور مہدی افادی کی زبان قلم پر استعمال ہوتے رہے۔ لیکن سرسید اردو کو انگریزی کا خادم اور دست نگر دیکھنا نہیں چاہتے تھے سرسید اور ان کے رفقاء کار سب عربی داں تھے ان کا مزاج خالص مشرقی تھا۔ انگریزی سے استفادہ ان کے نزدیک اردو کی تنگی داماں کا علاج تھا۔ وہ ہرگز یہ نہیں چاہتے تھے کہ اردو ہر بات میں انگریزی کا منھ تکا کرے۔ انگریزی کی انگلی پکڑ کر چلنے میں انھیں اعتراض نہ تھا تاکہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا اور چلنا سیکھ لے۔ لیکن وہ یہ کیسے گوارہ کرتے کہ اردو انگریزی کی گود میں چڑھی چڑھی پھرے اور اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے قابل نہ ہو۔

بہرحال سرسید احمد اور ان کے رفقاء نے اردو کو انگریزی کا دودھ پلا کر بڑا کیا لیکن اس کی خوبو اور مزاج مشرقی رہا۔ یہ ضرور ہے کہ انگریزی کے اثر سے کتابی اردو روزانہ بول چال کی اردو سے دور جا پڑی۔ سرسیّد کے رفقا میں سے مولوی نذیر احمد نے سر توڑ کوشش کی کہ روزانہ بول چال کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹے اور بقول شخصے داماں کے چاک اور گریباں کے چاک میں فاصلہ نہ رہے لیکن انھیں اس میں کامیابی نہ ہوئی۔ یا یوں کہیے کہ خاطر خواہ کامیابی نہ ہوئی۔ تحریری اردو اور بول چال کی اردو کا درمیانی فاصلہ قائم رہا۔ نذیر احمد کا سلیس روزمرہ صرف ہلکے پھلکے موضوعات تک محدود سمجھا گیا۔ علمی کتابیں اسی بھاری بھرکم مصنوعی زبان میں لکھی گئیں۔

اردو میں فارسی کی طرح مفرد الفاظ کا توڑا ہے جسے اس نے کنایات اور اصطلاحات کی مدد سے پورا کیا۔ سرسید کے زمانے میں جو انگریزی الفاظ اردو میں منتقل ہوئے ان سے جیسا کہ میں نے اوپر عرض کیا زبان میں ایک طرح کی توانائی آئی۔ لیکن روزمرہ اور محاورات کا چلن کم ہو جانے سے جو اردو بازار کے رائج الوقت سکے

تھے۔ اُردو کو خاصا نقصان پہنچا۔ پہلی بڑی لڑائی کے خاتمے پر پرانی مجلس برہم ہوئی اس کی جگہ نئی محفل جمی اس کا ٹھاٹ سراسر مغربی تھا۔ پرانے بزرگ اُردو کے مبدأ فیض یعنی عربی و فارسی کا علم رکھتے تھے۔ انھوں نے انگریزی الفاظ و محاورات نیز ترکیبوں کے ترجموں میں عربی و فارسی کی تہذیبی فضا اور سماجی پس منظر کا خیال رکھا۔ نو وارد جن کا کوئی مشرقی پس منظر نہ تھا محض بول چال کی زبان کے بل پر اردو کو نئے قالب میں ڈھالنے پر تل گئے۔

انگریزی تغلب کی میں صرف ایک مثال دوں گا۔ "معافی چاہنا" اُردو روزمرہ ہے انگریزی میں "معافی مانگنا" ہے۔ آج اردو میں معافی مانگنا عام ہے جو اردو کے اچھے اور مستند ادیبوں کی زبان بھی ہے۔ آج سے بیس سال پہلے اہل زبان کو یہ محاورہ کھٹکتا تھا اور بے دھڑک ٹوک دیا کرتے تھے۔ شاہد صاحب نے میر ناصر علی خاں مرحوم کا یہ لطیفہ کہیں لکھا ہے کہ آگرے کے کوئی ادیب میر صاحب سے ملنے دہلی آئے اور دیر تک بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ جب رخصت ہونے لگے تو انھوں نے فرمایا۔ میں نے آپ کا وقت بہت ضائع کیا۔ اس کی معافی مانگتا ہوں میر صاحب "معافی مانگنا" غلط اردو روزمرہ سن کر بگڑ گئے اور کہنے لگے۔ میاں معافی کیا مانگتے ہو! بھیک مانگو بھیک!" وہ بیچارے اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔

میں نے اوپر عرض کیا تھا کہ زبان معاشرے کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتی اور اس کے قدم بہ قدم ترقی کی راہ طے کرتی ہے۔ ادھر پہلی بڑی جنگ ختم ہوئی ادھر خلافت تحریک اُبھری، اور اس کے ساتھ کانگریس نے زور پکڑا اور ان تحریکوں کی سرگرمیوں کا اثر اردو زبان پر پڑا۔ کانگریس اور خلافت کے زیر اہتمام جلسے ہوتے تھے جلوس نکالے جاتے تھے۔ کانفرنسیں منعقد کی جاتی تھیں جن میں صدارتی خطبے اور سپاسنامے پڑھے جاتے تھے۔ ٹھوس سیاسی مسائل پر بحثیں ہوتی تھیں۔ تجویزیں پاس

کی جاتی تھیں۔ اخبار رسالے پمفلٹ چھپتے تھے۔ پورے سماج میں ادھر سے اُدھر تک بیداری کی لہر دوڑ گئی تھی۔ قومی شعور اُبھر رہا تھا۔ اس زمانے میں بیشمار سیاسی الفاظ و مصطلحات اردو میں ترجمہ ہوئیں۔ مثلاً خطبہ صدارت۔ استقبالیہ۔ سپاسنامہ تجویز یا قرارداد۔ عدم تعاون اشتراک عمل۔ ترک موالات۔ جلوس۔ موتمر۔ نمایندہ (یہ لفظ غالباً سب سے پہلے مولانا وحیدالدین سلیم نے استعمال کیا)

کانگریس اور خلافت کمیٹی کے ماتحت ہندو مسلمان کے اشتراکِ عمل سے اردو کی خاصی اشاعت و ترقی ہوئی۔ اس میں نئے سیاسی الفاظ و اصطلاحات آئیں۔ تحریک ترکِ موالات میں مسلمان پیش پیش تھے۔ سارا کام اُردو میں ہوتا تھا پلیٹ فارموں سے تقریریں اردو میں کی جاتی تھیں۔ صدارتی و استقبالیہ خطبے اردو میں پڑھے جاتے تھے اس کے علاوہ انگریزی الفاظ کا اُردو ترجمہ عربی و فارسی کی مدد سے آسان تھا۔ یہ زندہ زبانیں ہیں جو مصر و ایران میں ملکی زبانوں کی حیثیت سے کافی ترقی کر چکی ہیں۔ چنانچہ مصر و ایران سے بہت سے الفاظ اردو میں درآمد کئے گئے اور دیکھتے ہی دیکھتے اردو کہیں سے کہیں پہنچ گئی۔ اُردو ہندی نزاع یوں تو سرسید کے سامنے ہی اُٹھ کھڑا ہوا تھا لیکن اس وقت وہ ہندی حروف یعنی دیوناگری رسمِ خط تک محدود تھا۔ ہندوؤں کا مطالبہ تھا کہ اردو کو دیوناگری حروف میں لکھا جائے۔ چنانچہ ہندی کی اشاعت کے لئے جو انجمن بنارس میں قائم ہوئی اس کا نام انھوں نے دیوناگری پرچارنی سبھا (انجمن اشاعت دیوناگری) رکھا لیکن خلافت تحریک کے بعد ہندی کے نام پر جو طوفان اُٹھا وہ زیادہ شدید تھا۔ یہ اردو کے فارسی و عربی رجحان کے خلاف ایک طرح کا ردِ عمل تھا۔ میں اس نزاع کے لسانی پہلو کا تجزیہ کرنا چاہتا ہوں۔ اردو اپنی ساخت کے لحاظ سے بڑی صُلح جُو اور مرنجان مرنج زبان ہے۔ اسے کسی زبان سے بیر یا عداوت نہیں۔

اوّل اوّل اس نے عربی و فارسی سے فیض حاصل کیا اور اس کا مزاج اسلامی بن گیا۔ لیکن اس کی رواداری میں مطلق فرق نہ آیا۔ سرسید کے زمانے میں اس نے مغربی زبانوں سے خوشہ چینی کی۔ سنسکرت اس کا اپنا خاندان تھا اس سے چھوت چھات وہ کیسے برت سکتی تھی۔ ہندی تحریک کے اثر سے اس نے سنسکرت سلیلے کے ان رسیلے اور لچکیلے الفاظ کے لئے اپنی آغوش کھول دی جو پراکرت سے ہو کر آئے تھے اور ڈھل ڈھلا کر سڈول اور ہموار ہو گئے تھے۔ مولانا وحید الدین سلیم کی کتاب وضع اصطلاحات ۱۹۲۲ء میں شائع ہوئی اس میں اردو کے آریائی مزاج پر زور دیکر بتایا گیا تھا کہ تمام اصطلاحات آریائی ذخیرے سے اخذ کی جائیں اور مرکبات کو ہند آریائی مزاج کے مطابق ڈھالا جائے۔ اگرچہ مولانا سلیم کی یہ کوشش بارور نہیں ہوئی اور وضع اصطلاحات کے سلسلے میں پنڈت کیفی دہلوی کے علاوہ ان کے مشورے پر کسی نے عمل نہیں کیا۔ لیکن ہندی تحریک اردو پر ایک اچھا اور خوشگوار اثر چھوڑ گئی۔ اردو میں عربی و فارسی الفاظ کے پہلو بہ پہلو ہندی الفاظ استعمال ہونے لگے۔ عربی کی مشکل اور نامانوس ترکیبوں پر ہندی مرکبات کو ترجیح جانے لگی مشکل پسندی سے ہٹ کر زبان کا میلان سادگی اور آسانی کی طرف ہوا۔ ذیل کے الفاظ و مرکبات اس رجحان کی پیداوار اور اس دور کی یادگار ہیں۔

اُجاگر۔ بھرپور۔ رس جس۔ کس بل۔ تال میل۔ ریل پیل۔ دیس نکالا۔ جھلکیاں۔ اَن گنت۔ بٹوارا۔ سمجھوتا۔ چناؤ۔ آدرش۔ سُدھار۔

ہندی اُردو نزاع کم کرنے اور ان کے درمیان کی خلیج پاٹنے کے لئے کانگریس نے ہندوستانی یا "ہندستھانی" کی رٹ لگانی شروع کی۔ ان اُردو کا چرچا ہوا۔ اردو دانوں نے 'آسان زبان' کے نام سے ایک طرح کی مصنوعی ہندی نما اردو لکھنی شروع کی۔ ثقافتی الفاظ علمی اصطلاحات کو عام فہم

زبان میں منتقل کیا گیا اور عام فہم زبان کا معیار یہ قرار پایا کہ اس میں عربی و فارسی الفاظ کی کم سے کم آمیزش ہو۔ لیکن عام فہم الفاظ اور قریب الماخذ ترکیبیں اردو میں قریب قریب نایاب تھیں اس لئے عربی و فارسی کی خالی کردہ جگہ عام فہم الفاظ سے پر نہ کی جا سکی اور زبان اس تپتے کی طرح سوکھتی چلی گئی جس کا سوت اَٹ گیا ہو۔

دلی اور لکھنؤ کی زبان میں کوئی اہم اور بنیادی فرق نہ تھا۔ چند مقامی الفاظ محاورات، استعمالات میں کچھ اختلاف نظر آتا تھا جو دوسری بڑی جنگ کے بعد کی سیاسی تحریکات اور رسائل و اخبارات کی اشاعت سے مٹ گیا۔ اور ان قدیم مرکزوں کی زبانیں ایک دوسرے کے قریب آگئیں اور لسانی وحدت میں ڈھل گئیں بہت سے الفاظ جو صرف لکھنؤ میں استعمال ہوتے تھے دہلی میں بھی استعمال ہونے لگے اور اس کے برعکس دہلی والوں کے الفاظ اور استعمالات لکھنؤ میں رواج پا گئے مثلاً "جھلکی" (جھلک کی جگہ) اب ہر شخص کی زبان پر ہے۔ "تھم" اور "کھم" دونوں پہلو بہ پہلو رائج ہیں۔ "چیں بول جانا" اور "چیں بول جانا" میں اب کوئی فرق نہیں کیا جاتا۔ اور "شرابور" "شور بور سے زیادہ عام ہے۔ یہ صرف چند مثالیں ہیں

پچھلے پچیس سال کی علمی اور ادبی تحریکوں میں سے جامعہ عثمانیہ، دارالترجمہ (حیدر آباد) اور انجمن ترقی اردو کا اردو کی ترقی میں بہت بڑا حصہ ہے۔ مرحوم دہلی کالج کے بعد جامعہ عثمانیہ ہی ایک ایسا ادارہ ہے جہاں مختلف علوم و فنون کی تعلیم اردو کے ذریعے دی گئی اور جس طرح دہلی کالج کے ماتحت ایک سوسائٹی انگریزی زبان کی نصابی کتابوں کو اردو میں منتقل کرنے کے لئے قائم ہوئی تھی۔ جامعہ عثمانیہ کے زیر اہتمام اسی نوعیت کا ایک ادارہ دارالترجمہ کے نام سے قائم ہوا جس نے بے شمار علمی، فنی، ادبی کتابوں کے اردو میں ترجمے کئے۔ علمی اصطلاحات کو اردو قالب میں ڈھالا جس سے زبان میں نئے الفاظ آئے۔ اظہار و بیان کی

راہیں کھلیں۔ تہی مائگی کی جگہ گراں مائگی نے لی اور وہ اس قابل بنی کہ دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں سے آنکھ ملا سکے۔ سرسید کی علی گڑھ تحریک کے بعد حیدرآباد کی تحریک اس قابل ہے کہ اردو کی ترقی کے سلسلے میں اس کا ذکر کیا جائے۔ علی گڑھ تحریک کے اثر سے اردو میں سنجیدگی اور پختگی آئی۔ حیدرآباد تحریک نے اردو کو وسعت اور گراں مائگی بخشی اور یہ عجیب اتفاق ہے کہ اردو کی اشاعت و ترقی کی سب سے بڑی تحریک یعنی انجمن ترقی اردو کی سرگرمیوں کا آغاز بھی حیدرآباد ہی سے ہوا۔ اس کی زندگی کی چونتیس بہاریں حیدرآباد میں گزریں۔ اس لیے انجمن کی ان کارگزاریوں کو جو اس نے مولانا عبدالحق (مرحوم) کی رہنمائی میں ۱۹۱۳ء کے بعد انجام دیں۔ حیدرآباد کی اردو تحریک سے الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔ مولوی عبدالحق صحیح معنی میں بابائے اردو ہیں۔ برصغیر کے مسلمان کی ذہنی بیداری، ثقافت کے احیا و تجدید، زبان کی اشاعت و ترقی کے سلسلے میں ان کا وہی درجہ ہے جو انیسویں صدی کے آخر میں سرسید احمد کا تھا۔ دارالترجمہ کو انجمن سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ دارالترجمہ کا ناظم اول انجمن ترقی اردو کا آخری معتمد بنا۔ دونوں اداروں نے اپنے ناظم کی بے چین روح جذب کر کے اردو کی ترقی میں بیش از بیش حصہ لیا۔

یہ اردو کی پچیس سال کی زندگی کا ایک سرسری جائزہ ہے۔ اس میں تفصیل کی گنجائش نہیں۔ ورنہ دارالترجمہ اور انجمن ترقی اردو نے جو کتابیں ترجمہ یا تصنیف کیں ان کو سامنے رکھ کر یہ بتایا جا سکتا تھا کہ ان تراجم اور تصانیف کے ذریعے کتنے نئے الفاظ، نئی اصطلاحیں، نئی ترکیبیں، نئے اسالیب اردو میں اضافہ ہوئے جو اس سے پہلے نہ تھے۔ سرسید کی تحریک کے سلسلے میں یہ میں پہلے عرض کر آیا تھا کہ سرسید اور ان کے رفقا کار سب عربی کے ماہر تھے انھوں نے انگریزی سے تاثر کے باوجود اردو کی ترقی و توسیع میں اس کے مشرقی مزاج کا پورا پورا خیال

رکھا۔ دارالترجمہ اور انجمن ترقی اُردو نے سرسید کی اس روایت کو آگے بڑھانے میں بڑی کوشش کی۔ ان اداروں نے عربی و فارسی ذخیروں سے بیش از بیش استفادہ کیا۔ خصوصیت کے ساتھ دارالترجمہ نے اصطلاحات سب عربی سے ہیں یا عربی الفاظ سے ڈھال کر بنائیں اور اسالیب بھی زیادہ تر عربی ہی سے اخذ کئے۔ اس لئے عام طور سے دارالترجمہ کی شائع کردہ کتابوں کو مشکل بتایا جاتا ہے۔ انجمن نے درمیان کی راہ اختیار کی۔ اس نے آسان لیکن معیاری اردو میں جس میں غیر ضروری طور سے عربی الفاظ اور فارسی کی پیچیدہ ترکیبوں کی بھرمار نہ تھی کتابیں لکھوا کر یا دوسری زبانوں سے ترجمے کرا کے شائع کیں۔ دارالترجمہ نے ٹھوس علمی مواد کو موضوع بنایا۔ انجمن نے ادبی، تاریخی، عمرانی، لغوی اور عام دلچسپی کی کتابوں پر زیادہ توجہ مرکوز رکھی۔ دارالترجمہ نے زبان کو الفاظ و اصطلاحات سے مالا مال کیا۔ انجمن نے زبان کو رواں دواں اور سلیس بنایا۔ دارالترجمہ نے زبان کے لفظی سرمایہ کی توسیع کی۔ انجمن نے اسالیب اور بیان کے طریقوں کو سنوارا۔

۱۹۳۶ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین کا قیام عمل میں آیا اس کے ایک سال بعد ۱۹۳۵ء کے جدید آئین اصلاحات کے ماتحت ملک میں عام انتخابات ہوئے۔ اور چھ صوبوں میں کانگریس کی مطلق العنان وزارتیں قائم ہوگئیں۔ بظاہر یہ واقعات لسانی اعتبار سے کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ لیکن انجمن ترقی پسند مصنفین کے قیام اور چھ صوبوں میں کانگریس کے سیاسی اقتدار کا اردو زبان پر بہت گہرا اور دور رس اثر پڑا۔ ترقی پسندوں میں غالب تعداد ان لوگوں کی تھی جو انگریزی درس گاہوں کے تعلیم یافتہ تھے جنھوں نے مختلف علوم و فنون کا مطالعہ انگریزی کے ذریعہ کیا تھا۔ ان کا مشرقی پس منظر نہ تھا۔ اس لئے وہ انگریزی ادب و انشا کے رنگ میں رنگ گئے۔ ادب ان کے نزدیک سماجی اور معاشی نظریات کی تبلیغ کا

ذریعہ اور زبان ایک مخصوص طرزِ فکر کا آلہ بنی۔ انھوں نے زبان کے مزاج کو جس کا خمیر صدیوں کے بعد تیار ہوا تھا نظر انداز کر دیا۔ وہ انگریزی میں جو کچھ سوچتے تھے اپنی ٹوٹی پھوٹی زبان میں اس کا ترجمہ کر دیتے تھے۔ ان کی تحریروں سے اردو کی اشاعت تو ہوئی لیکن اس کی ترقی رک گئی۔ زبان کے مزاج کے خلاف ناگوار اور بھدّی ترکیبوں سے زبان گرانبار بنی۔ جن ثقیل الفاظ کی زبان متحمل نہیں ہو سکتی تھی وہ زبردستی اس میں ٹھونسے گئے۔ اس پر حسب ذیل تین اثرات مرتب ہوئے

الف۔ بعض انگریزی اصطلاحات کے نئے ترجمے کئے گئے۔ حالانکہ اردو میں ان کے ہم معنی مصطلحات پہلے سے موجود تھیں اور ان میں سے کچھ ایسی تھیں جنھیں خود اہل مغرب نے عربوں کے سیاسی اقتدار کے زمانے میں اپنی زبان میں منتقل کیا تھا۔ انگریزی داں نئے ادیب عربی زبان و ادب سے نا واقف تھے اس لئے حسبِ ذیل قسم کی اصطلاحیں وضع کرنے پر مجبور ہوئے۔

موضوعی (ذہنی) معروضی (خارجی) عینی (تصوری) عقبی (زمین، (پس منظر) وغیرہ۔

(ب) انگریزی الفاظ و مرکبات کو اپنائے بغیر اُردو میں منتقل کیا گیا۔ اس کی صرف دو مثالیں اُردو کے مشہور مصنفین کے شائع شدہ مضامین سے درج کی جاتی ہیں۔

"اس کا یہ قول اس کے ورڈسورتھ پر مضمون میں ہے۔" "وقتاً فوقتاً لکھے گئے سنگیت شاستر"

(ج) انگریزی اسالیب کی بھدّی نقل کی گئی۔

ہندوستانی ہندی کی اشاعت کا پردہ تھا جو چھ بڑے صوبوں میں کانگریسی اقتدار قائم ہوتے ہی سامنے سے ہٹا دیا گیا اور کھلم کھلا ہندی کا چرچا ہونے لگا

"ہندی سمیلن" اور "ساہتیہ پرشد" کی سرگرمیاں تیز ہوگئیں۔ گاندھی جی ہندی کی حمایت میں کمربستہ ہوکر باہر نکل آئے اور ہندی کا پرچار کرنے لگے۔ ودیا مندر اسکیم کا ہمرنگ زمین جال بچھایا گیا تاکہ بھولے بھالے مسلمان آسانی کے ساتھ پھنس سکیں۔ کانگریس کی یہ سرگرمیاں دیکھ کر مولانا عبدالحق انجمن کو دہلی لانے کے لئے مجبور ہوئے۔ ۱۹۳۸ء میں دہلی آکر مولانا عبدالحق صاحب نے گاندھی جی اور ان کے ہندی نواز چیلی چانٹوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ اس کے بعد اردو ہندستانی کے فریب سے آزاد ہوئی اور اردو نواز ہندوؤں کے جال سے۔ برصغیر کے مسلمانوں کو پاکستان کی سیدھی اور روشن راہ اردو ہی نے دکھائی۔

اس زمانے میں سیاسی تحریکوں کا زور رہا۔ تبلیغ و اشاعت کے جہاں اور ذریعے تھے وہاں ادب نے بھی سیاسی عقائد و نظریات کی اشاعت کا کام کیا۔ اردو ملک کے گوشے گوشے میں پہنچی۔ چپے چپے پر اس نے ڈیرا جمایا۔ کسی صوبے کا کوئی بڑا شہر نہ تھا جہاں سے اردو اخبار یا رسالہ نہ نکلتا ہو۔ اور جہاں سیاسی ادبی یا نیم سیاسی نیم ادبی انجمنیں سرگرم کار نہ ہوں۔ اس سے پہلے اردو کے دو مرکز تھے ایک دلی دوسرے لکھنؤ۔ اب قریب قریب ہر صوبے سے اردو کی آواز اٹھی اور ہر بڑی جگہ اردو کا مرکز بنی۔ جہاں اردو کے ساتھ کوئی دوسری مقامی زبان بولی جاتی تھی اردو اس کے زیر اثر آئی۔ اور مقامی بولی کے بہت سے الفاظ اور محاورے نامعلوم طور ہی سے سہی، اردو میں در آئے۔ اس سے پہلے مختلف صوبوں کی بول چال کی اردو میں اختلاف تھا۔ تحریر کی زبان ایک تھی۔ اس زمانے میں یہ اختلاف بول چال سے تحریر میں پہنچا اور قیام پاکستان کے بعد سے یہ برابر بڑھتا جارہا ہے۔

اردو اب اپنے مرکز سے دور جا پڑی ہے۔ اب اس کا دہلی اور لکھنؤ سے کوئی تعلق نہیں رہا۔ زبان عوام سے غذا حاصل کرتی ہے بول چال کی زبان سے نشوونما

پاتی ہے۔ پاکستان کے بڑے بڑے صوبوں کی عوامی زبان سے اردو نے غذا حاصل کرنی شروع کر دی ہے۔ اگر یہ سلسلہ یونہی جاری رہا اور زبان کا کوئی معیار نہ بنا تو مجھے ڈر ہے اُردو کی لسانی وحدت قائم نہ رہ سکے گی اور آگے بڑھ کر وہ بہت سی ضمنی بولیوں میں تقسیم ہو جائے گی۔ اس خطرے سے بچنے کی تدابیر اختیار کرنی چاہئیں اور ان پر ابھی سے عمل ہونا چاہئے۔ ہمیں اردو کو مستند اور معیاری زبان بنانا ہے۔ آج خاصے اچھے پڑھے لکھے لوگ غیر ذمہ دارانہ باتیں کر رہے ہیں۔ ڈھاکا اسکول، لاہور اسکول اور کراچی اسکول کے قیام کا خواب دیکھا جا رہا ہے۔ گھٹیا قسم کی صوبائی عصبیت کی یہ کہہ کر پرورش کی جارہی ہے کہ اردو کو مقامی رنگ میں ڈبو کر ہی اپنایا جا سکتا ہے۔ یہ اُردو کے لئے نیک فال نہیں۔ اردو برصغیر کے مسلمانوں کا ثقافتی اور ادبی ورثہ ہے اس کا سارے پاکستان سے تعلق ہے۔ اس کی لسانی وحدت قائم نہ رہی تو پاکستانیوں کا رشتہ اخوت قائم نہ رہ سکے گا۔ مختلف صوبوں کے مقامی رنگ میں رنگ جانے کے بعد اردو کا بھی وہی حشر ہوگا جو اس سے پہلے اس کی رشتہ دار دوسری زبانوں کا ہوا۔

شورسینی اپ بھرنش پانچویں اور دسویں صدی عیسوی کے درمیان پنجاب، سندھ، یوپی اور راجستھان کے بعض اضلاع میں بولی جاتی تھی۔ آج اسکی جانشیں بولیاں اتنی مختلف ہیں کہ وہ ایک دوسرے کو پہچانتی تک نہیں اور انھیں یہ یاد نہیں رہا کہ انھوں نے کبھی ایک ماں کی چھاتی کا دودھ پیا تھا۔ اردو پر صوبائی زبانوں کی یورش کئی طرف سے ہے الفاظ، محاورات اور روزمرہ پر بھی وہ چھاپا مار رہی ہیں اور زبان کی ساخت کو بھی متاثر کر رہی ہیں۔ دوسری صورت کو میں اردو کے لئے بہت خطرناک سمجھتا ہوں۔ وضاحت کے لئے دو چار مثالیں کافی ہوں گی۔

میں کہا اب چار بجا ہے۔" "وہ میدان میں لکڑیاں ڈال دو۔" "وہ نہ آنے سے

میں چلا جاؤں گا۔" میں نے اس کو کہا کہ میں نے آج ہی جانا ہے۔"

رسالہ "ساقی" نے ان پچیس ۲۵ سال میں اُردو کی بڑی اچھی خدمت کی۔ اسے تمام بیرونی آفات اور اجنبی اثرات سے بچایا۔ "ساقی" نے کم سے کم تحریر اور تقریر کی زبان میں فرق پیدا کیا۔ اس کے مضمون نگاروں نے علمی، ادبی اور تنقیدی مضامین اسی روزانہ کی سلیس اور کھلی ڈھلی زبان میں لکھے جو افسانوں اور کہانیوں کے ساتھ مخصوص سمجھی جاتی تھی اور جس سے ایک طبقے کے نزدیک علمی مباحث کی ثقاہت اور متانت پر حرف آتا تھا۔ ساقی نے اردو کو انگریزی، سنسکرت اور فارسی کی تابعداری سے بچانے اور اس کی اپنی شان برقرار رکھنے کے لئے سبھی کچھ کیا۔ اس کے لئے اسے قلمی جہاد کرنا پڑا۔ اس میں اس نے اہل قلم سے مدد لی جو بقول میر امن دلی کے روڑے تھے۔ جن کی زبان سے نکلا ہوا ہر لفظ سند ہوتا تھا۔ مثلاً میر ناصر علی خاں، میر باقر علی داستان گو، میر ناصر نذیر فراق، مولانا راشد الخیری، قاری سرفراز حسین۔ مولوی ...... احتشام الدین حقی، مولوی عنایت اللہ خاں۔ انھوں نے اپنے قلم کی گلکاریاں دکھائیں اور ساقی کے صفحات پر بہاریں کھلائیں۔ اب یہ بزرگ مرحوم ہو چکے ہیں۔ ان کی جگہ خالی ہے اور جو دو چار ہیں بھی وہ خاموش ہیں۔ داغ فراق صحبت شب کی جلی ہوئی شمع کی طرح

آج پاکستان میں "افسانہ دوش" دُہرانے سے زیادہ بہتر اُردو کی خدمت نہیں ہو سکتی۔

اُردو کا رسم الخط

زبان کا رسم الخط سے کتنا قریب کا تعلق ہے اس کا تصور کرنا آسان نہیں۔ مثال کے طور پر کہا جا سکتا ہے کہ زبان روح ہے تو رسم الخط اس کا جسم ہے جس طرح جسم و روح کے مجموعے کو زندہ انسان کہتے ہیں اسی طرح زبان اور رسم الخط کا مکمل اور مناسب اجتماع و امتزاج زبان کو زندہ اور پایندہ بناتا ہے۔ اس لئے کسی زبان کو اس کے رسم الخط سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ زبان کا ذکر آتے ہی ہر شخص کا ذہن ان حروف، خطوط اور اشکال کی طرف منتقل ہو جاتا ہے جو اس زبان کے لئے مخصوص ہیں اور جن کے مجموعے کو خط کہا جاتا ہے۔ اس سے بڑھ کر ہماری بدقسمتی اور کیا ہو سکتی ہے کہ اردو اور اس کے رسم الخط کا مسئلہ ملک کے پیچیدہ سیاسی مسائل کے ساتھ الجھا دیا جائے اور اس کو علمی و ثقافتی نقطۂ نگاہ سے نہ دیکھا جائے۔

اردو زبان کے لئے یوں تو کئی رسم الخط تجویز کئے جاتے ہیں مگر ان میں سے فارسی لاطینی اور دیوناگری کو زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ ہماری قومی زبان جسے اُردو کہا جاتا ہے، دہلی اور اس کے نواح میں پیدا ہوئی اور مدتوں محض روزانہ بول چال کی زبان

رہی جو بازاروں گلی کوچوں اور میلوں ٹھیلوں میں ہر جگہ کام دیتی تھی۔ میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ اس زبان کو وجود میں لانے کا کام مسلمانوں نے سرانجام دیا۔ لیکن اس سے انکار ممکن نہیں کہ اس کو سنوارنے اور سدھارنے میں مسلمانوں کا بڑا ہاتھ ہے۔ مسلمانوں کے عہد اقتدار میں یہ زبان پروان چڑھی، بازاروں یا شاہراہوں سے ایوانوں اور عدالتوں تک پہنچی۔ مسلمان انشا پردازوں نے اس میں کتابیں لکھیں، اور شعر کہے۔ مسلمان فارسی رسم الخط استعمال کرتے تھے۔ اس لئے انھوں نے اردو کو بھی فارسی رسم الخط کا جامہ پہنایا۔ گویا سب سے پہلے ہماری زبان جس خط سے آشنا ہوئی وہ فارسی خط ہے۔ ہماری زبان کی قدیم سے قدیم کتاب اسی رسم خط میں ہے۔ اور شاید ۱۸۰۰ء سے پہلے جس طرح اس زبان کی صرف ایک شکل وصورت تھی اسی طرح اس کا خط بھی ایک ہی تھا۔ اسی میں خطوط لکھے جاتے تھے اور اسی میں کتابیں چھپتی تھیں۔ اس کے سوا اردو کا کوئی اور خط نہ تھا۔ ہرچند اودھی اور برج بھاشا وغیرہ زبانیں دیوناگری میں بھی لکھی جاتی تھیں مگر اردو کے لئے فارسی خط ہی استعمال ہوتا تھا اور ہندو مسلمان سب اسی خط کو استعمال کرتے تھے۔

فارسی رسم الخط پر بہت سے اعتراض کئے جاتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ وہ اجنبی یا غیر ملکی ہے، نامکمل یا ادھورا ہے، مبہم اور دشوار ہے۔ اس کے مقابلے میں دیوناگری کو اس طرح سراہا جاتا ہے کہ وہ ہندوستان کا قدیم رسم الخط ہے جو مکمل بھی ہے اور جامع بھی۔ ان میں سے پہلا اعتراض کہ فارسی رسم الخط غیر ملکی ہے سب سے زیادہ گھناؤنا ہے اس لئے کہ اس سے ان حضرات کی فرقہ وارانہ ذہنیت بے نقاب ہوتی ہے جو یہ اعتراض کرتے ہیں کسی ایسے ملک میں جہاں کسی ایک فرقہ کی حکومت نہ ہو اور جسکی بنیاد غیر مذہبی جمہوری اصولوں پر ہو یہ کہنا کہ فارسی خط اختیار نہ کیا جائے اس لئے کہ وہ غیر ملکی ہے اور فارسی وعربی الفاظ قومی زبان سے خارج کر دئے جائیں اسلئے

کہ وہ اجنبی ہیں انتہائی درجہ کی فرقہ پرستی اور رجعت پسندی ہے۔ میں اس قماش کے لوگوں کو اس قابل نہیں سمجھتا کہ ان سے خطاب کیا جائے۔ یہ لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ دیوناگری ہندوستان کی پیداوار ہے حالانکہ دیوناگری کی اصل براہمی ہے اور براہمی کی سامی ہے یہ رسم الخط محققین کی رائے کے مطابق چوتھی صدی عیسوی میں ہندوستان پہنچا۔

دوسرے اعتراض پر میں تفصیل کے ساتھ بحث کرنا چاہتا ہوں۔ میں نہیں سمجھ سکا کہ کس اعتبار سے فارسی خط کو نامکمل اور ناقص بتایا جاتا ہے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ فارسی خط اس لئے ناقص ہے کہ دیوناگری کی طرح اس میں حرکات کا وجود نہیں۔ شاید اسی لئے اسے مبہم اور دشوار بتایا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ اردو میں ایک لفظ کو کئی طرح پڑھ سکتے ہیں۔ اولاً یہ کہنا صحیح نہیں کہ فارسی خط میں حرکات کا وجود نہیں۔ فارسی خط میں حرکات ہیں، یہ دوسری بات ہے کہ ان کا استعمال نہیں۔ فارسی رسم الخط کی حرکات جو عربی سے لی گئی ہیں، نہایت مختصر، جامع اور ضروری ہیں۔ یہ تین ہیں، زبر، زیر، پیش۔ ماہرین لسانیات جانتے ہیں کہ قدیم آریائی زبانوں میں بھی حرکات تین ہی تھیں۔ دیوناگری سَوَر یا ماتراؤں کا موجودہ نظام کسی قدر بعد کے زمانے کی پیداوار ہے اور حکمیاتی نقطۂ نگاہ سے وہ اس قابل نہیں کہ اس کو اہمیت دی جائے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ صوتیات Phonology کے اصول کے مطابق آوازیں دو طرح کی ہیں۔

(۱) وہ آوازیں جو آلات صوت یعنی زبان، تالو، ہونٹ وغیرہ کی مدد سے پیدا ہوتی ہیں۔

(۲) وہ آوازیں جو زبان اور تالو کے درمیانی خلا میں محض ہوا کی سرسراہٹ سے وجود میں آتی ہیں۔

پہلی قسم کی آوازوں کو سنسکرت میں व्यंजन اور عربی میں صحیح یا مصمت کہتے ہیں۔ مثلاً بَ۔ جَ۔ لَ وغیرہ۔ دوسری قسم کی بسیط آوازیں سنسکرت میں स्वर اور عربی میں حرکت یا مصوت کہلاتی ہیں۔ اس قسم کی آوازیں ٹھوس نہ ہونے کی وجہ سے از خود ادا نہیں کی جاسکتیں جب تک پہلی قسم کی آوازوں کا سہارا نہ لیں۔ اس لحاظ سے گویا یہ ضعیف و بیمار (علیل) آوازیں ہیں۔ عربی میں یہ آوازیں مرکب بھی ہوسکتی ہیں اور اس صورت میں کسی قدر توانائی حاصل کر کے وہ مستقل حرف بن جاتی ہیں۔ مثلاً ــَـ جسے زبر کہتے ہیں۔ اسی قسم کی دوسری آواز سے ترکیب پاکر کھنچ جاتی ہے۔ کھنچی ہوئی مرکب آواز کو الف کہتے ہیں۔ اسی طرح دوسری آوازیں بھی کھینچی جاتی ہیں اور ان سے 'ی' اور 'و' وجود میں آتے ہیں۔ عربی میں بسیط آوازوں یعنی ــَـ ــِـ ــُـ کو حرکات اور ترکیب یافتہ آوازوں یعنی 'ا، ی، و، کو حروف علت کہتے ہیں۔ سنسکرت میں حرکت اور علت کا فرق نہیں کیا جاتا۔ اس میں بسیط اور مرکب دونوں قسم کی آوازوں کا ایک ہی نام (یعنی سْوَرَ) ہے۔ یہ بات اس فن کے اصول و قواعد کے خلاف ہے۔ مرکب حرکات یعنی حروف علت بھی مختلف حرکات کے حامل ہوتے ہیں۔ مثلاً فارسی 'ا' کو لیجئے۔ اس پر تینوں حرکتیں ہوسکتی ہیں۔ 'اَ' (زبر) 'اِ' (زیر) 'اُ' (پیش) فارسی خط میں الف پر مختلف علامات لگا کر مختلف حرکات کا اظہار کیا جاتا ہے۔ لیکن سنسکرت میں تینوں حرکتوں کے لئے جدا جدا تین صورتیں رکھی گئی ہیں अ، इ، उ۔ میں سمجھتا ہوں یہ بات فن اور حکمت کے خلاف ہی نہیں بلکہ غیر ضروری بھی ہے۔ زمانۂ حال کے ہندی داں بھی اس کو غیر ضروری سمجھتے ہیں۔ حال ہی میں ہندوستان ٹائمز" میں مسٹر مدن گوپال کا ایک مقالہ شائع ہوا ہے اس میں انھوں نے لکھا ہے کہ دیوناگری کا उ غیر ضروری ہے۔ ہوسکتا ہے کہ अ پر उ کی ماترا لگا کر अु لکھا جائے۔ میں

کہتا ہوں ऋ بھی غیر ضروری ہے اس کی جگہ रि لکھ سکتے ہیں۔ اس صورت میں فارسی اور دیوناگری میں کوئی فرق نہیں رہتا۔

دو حروف علت کو بھی ترکیب دیا جا سکتا ہے۔ عربی میں اس کی بہت سی صورتیں ہیں۔ سنسکرت میں "سُوَر" زیادہ تر अ کی ترکیب سے بنے ہیں، مثلاً आ (آ)، ओ (اَو)، औ (اَوُ)، ई (اِی) ऊ (اُو) ए (اے) ऐ (اَے) ان میں سے ई اور ऊ تو इ اور उ کی دراز اور کھینچی ہوئی صورتیں ہیں اور جب ان کی اصل صورتیں غیر ضروری ہیں تو ان کا غیر ضروری ہونا ظاہر ہے ए اور ऐ بھی بیکار رہیں اس لئے کہ یہ صورتیں بھی अ سے حاصل کی جا سکتی تھیں۔ فارسی خط میں یہ تمام مرکب حروف علت موجود ہیں وہاں ان کو ایک قاعدے کے مطابق بنایا گیا ہے اور حرکات کے ذریعہ ان کے باہمی فرق کو نمایاں کر دیا گیا ہے۔

ایک اور بات بھی غور کے قابل ہے۔ دیوناگری میں زبر کی کوئی علامت نہیں حالانکہ اصول کے مطابق وہ بھی ایک حرکت ہے اور ہر حرف صحیح تنہا اپنے تلفظ میں اس کا محتاج ہے جس طرح دوسری حرکات کا۔ کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی کہ اس کے لیے کوئی علامت یا ماترا مقرر نہ کی جائے اس کے علاوہ अ، इ اور उ تینوں بسیط حرکات نہیں بلکہ مستقل حروف ہیں جو دوسرے حروف صحیح کی طرح اپنے تلفظ میں حرکات کے محتاج ہیں۔ مثلاً ब 'ب' کو لیجئے۔ یہ حرف صحیح ہے۔ تنہا اس کا تلفظ نہیں کیا جا سکتا جب تک اس پر زبر، زیر یا پیش نہ ہو۔ ٹھیک اسی طرح اَ، اِ، اُ (अ، इ، उ) بھی بَ، بِ، بُ کی طرح مستقل حروف ہی ہیں جن کو تلفظ کی آسانی کے لئے حرکات سے مخلوط کر دیا گیا ہے۔ دیوناگری والے یہ باریک فرق نہیں کرتے۔ وہ "سُوَر" کے باب میں حروف اور حرکا

میں خلط ملط کر دیتے ہیں۔ علمی نقطۂ نگاہ سے سنسکرت کے تمام سُور یعنی حروف
علت بسیط حروف و حرکات نہیں مرکبات ہیں اور علامتیں بسیط حروف کے لئے
ہوتی ہیں نہ کہ مرکبات کے لئے۔ اس لئے کہ مرکبات نامحدود ہیں اور مرکب کے لئے
جداگانہ علامت مقرر کرنا دشوار کام ہے۔ فارسی خط جسے دشوار بتایا جاتا ہے خاص
اس باب میں دیوناگری سے زیادہ آسان اور زیادہ واضح اور زیادہ باقاعدہ ہے
اس میں ضروری حرکات کے لئے علامتیں رکھی گئی ہیں اور ان علامتوں کی مدد سے
وہ تمام مرکب حروف علت بڑی آسانی کے ساتھ حاصل کر لئے جاتے ہیں
جن کے لئے دیوناگری میں کئی غیر ضروری اور قطعی بیکار شکلیں وضع کی گئی ہیں۔
اگر دیوناگری میں بھی ضروری حرکات استعمال کی جائیں تو اس سے ذیل کا سہل
ترین اور آسان نظام حروف علت حاصل ہو سکتا ہے۔ अ ، आ ، अि ،
अी ، अु ، अू ، अे ، अै ، अो ، अौ یہ نظام فارسی خط کے
مندرجہ ذیل نظام کے مطابق ہے اَ، آ، اِ، اِی، اِے، اَے، اُو،
اَو، اُ، اَو۔

اس تفصیل سے ظاہر ہے کہ فارسی خط میں بھی ماترے یا حرکات ہیں جن کا اگر
استعمال کیا جائے تو وہ دقتیں دور ہو سکتی ہیں جن کا ذکر مخالفین کی زبان پر ہے
لیکن ان حرکات کے استعمال نہ کرنے میں فائدے بھی ہیں اور انہی فوائد کے پیش نظر
اردو میں ان کو ترک کر دیا گیا ہے۔ ان میں سے پہلا اور اہم فائدہ تو یہ ہے کہ اردو
تحریر میں حرکات ترک کر دینے کی وجہ سے روانی آگئی اور اس کے لکھنے میں وقت
کم صرف ہوا۔ آپ دو شخصوں سے املا لکھایئے ایک سے اُردو میں دوسرے سے
سے دیوناگری میں۔ اردو لکھنے والا بہت جلد فارغ ہو جائے گا اور دیوناگری
والا کھیاں مارتا رہ جائے گا۔ اس کی وجہ ظاہر ہے۔ دیوناگری میں ماترے

لگانے کی وجہ سے بہت وقت ضایع ہو جاتا ہے۔ دیوناگری تحریر میں ایک اور عیب بھی ہے جس کی وجہ سے کم سے کم عدالتوں اور دفتروں میں اس کا رواج مناسب نہیں۔ اور وہ ہے دیوناگری حروف، الفاظ اور عبارات پر لکیر کھینچنا جسے ہندی والے ڈنڈا کہتے ہیں۔ لکھنے والے کا اچھا خاصا وقت اس بے معنی کام میں صرف ہو جاتا ہے کہ وہ عبارتوں پر (ہندی اصول کے مطابق) ڈنڈے لگاتا رہے۔

دیوناگری تحریر میں جو سستی، ٹھہراؤ، اور سکونی کیفیت پائی جاتی ہے وہ ان دو بے معنی کاموں کی وجہ سے ہے۔ رہی دقت سو وہ چنداں اہم نہیں۔ زبان اور تحریر کا ساتھ چولی اور دامن کا ساتھ ہے۔ زبان جاننے والا اس رسم الخط کا استعمال کرتا ہے اور پڑھنے والا بھی زبان داں ہی ہوتا ہے۔ اس لئے میں نہیں سمجھتا کہ ایک زبان داں جو بولتا ہے اس کے پڑھنے میں غلطی کر سکتا ہے۔ اردو تحریر میں تو حرکات تو کجا نقطوں کا بھی بہت کم استعمال ہوا ہے۔ فارسی کا مشہور مصرعہ ہے:۔ "عاقلاں پیرو نقطہ نہ شوند" لیکن ہمارے دوست شاید یہ سمجھتے ہیں کہ پڑھنے والے نرے احمق ہوتے ہیں۔ جب تک حروف پر حرکات نہ ہوں وہ صحیح پڑھ ہی نہیں سکتے۔ اور اگر مان بھی لیا جائے کہ اردو تحریر پڑھنے میں دقت ہوتی ہے تو اس کے ترک کر دینے کی یہ کوئی معقول وجہ نہیں۔ سنسکرت زبان اور اس کی گرامر کی دقتیں تو مشہور ہیں۔ اس کے اسماء و افعال کی گردان بہت کٹھن بتائی جاتی ہے۔ تو کیا یہ بھی سنسکرت کا کوئی عیب ہے اور کیا اس وقت کی بناء پر ہمیں یہ مشورہ دینے کا حق حاصل ہے کہ ہندی میں سنسکرت الفاظ استعمال نہ کئے جائیں اس لئے کہ ان کے بناتے اور جمع کرنے میں دقتیں پیش آتی ہیں۔

دراصل اردو رسم الخط کی دقتیں حرکات یا اعراب کی وجہ سے نہیں۔ تحریر میں اس حکیمانہ نظام کی وجہ سے ہیں جس کی اس میں پابندی کی گئی ہے۔ دیوناگری

رسم الخط اس لحاظ سے سراسر غیر حکمیاتی ہے کیونکہ اس میں ہر حرف دوسرے سے جدا اور پورا لکھا جاتا ہے۔ مثلاً اگر کتاب لکھنا ہو تو دیوناگری میں ک، ت، ا، ب وغیرہ حروف سب پورے اور جدا جدا لکھے جائیں گے اور اردو کی طرح نہ ان کو ملایا جائے گا ورنہ کسی حرف کو کاٹ کر مختصر کیا جائے گا۔ پھر اس وجہ سے بھی دیوناگری تحریر میں طوالت ہوتی ہے اور جہاں اس کے لکھنے میں زیادہ وقت صرف ہوتا ہے وہاں وہ جگہ بھی زیادہ لیتا ہے۔ دیوناگری کی تین خصوصیات ہیں،

(۱) اس میں ماتراؤں کا استعمال ہوتا ہے (۲) اس کا ہر حرف دوسرے سے جدا لکھا جاتا ہے (۳) ہر حرف پورا لکھا جاتا ہے۔

یہ تینوں خصوصیتیں کاروباری لحاظ سے ایسی ہیں جو دیوناگری کو اردو کے مقابلے میں ناکارہ بنا دیتی ہیں۔ اس لئے کہ موجودہ کاروبار کی ترقی کا دارومدار زود نویسی پر ہے۔ جس طرز میں زود نویسی نہیں وہ موجودہ کاروباری ہنگامہ زائیوں کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ اس کے علاوہ کائنات و آفاق کا مطالعہ کیجئے۔ آپ کو کون و فساد کا ایک لامتناہی سلسلہ نظر آئے گا۔ کائنات میں کچھ بسائط ہیں جو ترکیب پاکر رنگا رنگ شکلوں میں جلوہ افروزی کرتے ہیں۔ ترکیب کی حالت میں بسیط کی شکل بہت کچھ بدل جاتی ہے۔ کائنات کی جملہ رنگینیاں اور رعنائیاں اسی ترکیب و تالیف کی شرمندہ احسان ہیں۔ یہی حال صفر و حروف کا ہے۔ بسیط آوازوں کی صفر علامات ہیں۔ جس طرح آوازوں کے مجرد ترکیب سے الفاظ وجود میں آتے ہیں اسی طرح ان علامات کی تالیف سے عبارت کا وجود ہوتا ہے۔ اور یقیناً وہی طرز تحریر حکیمانہ اور سائنٹفک ہے جس میں وصل و فصل کے قاعدے فطرت اور کائنات میں عامل ترکیب و تالیف کے قوانین پر مبنی اور ان کے مطابق ہوں۔ پھر ظاہر ہے کہ اردو رسم الخط میں چونکہ حرف کو ایک دوسرے کے ساتھ جوڑ دیا جاتا ہے اور جوڑ کے وقت اس کی پوری شکل قائم نہیں رہتی اس لئے اس کا پڑھنا

دشوار ہوتا ہے۔ یہ دشواری کائنات کے مظاہر و مناظر کی دشواری ہے۔

سہل راجستن دریں دیر کہن   ایں دلیل آں کہ جاں رفت از بدن

یہ بھی ممکن ہے کہ دیوناگری کو اس لئے مکمل کہا جائے کہ اس میں حروف صحیح کی تعداد فارسی حروف صحیح سے زیادہ ہے۔ میں خیال کرتا ہوں کہ یہ بھی دیوناگری کے مکمل اور جامع رسم الخط ہونے کی دلیل نہیں ہو سکتی۔ دیوناگری حروف ہجا میں بہت سے حروف ایسے ہیں جو عملی اعتبار سے قطعی بیکار ہیں۔ یہ میں نہیں کہتا بلکہ ہندی زبان اور رسم الخط کے عالم کہتے ہیں۔ مثلاً ष اور श تلفظ کے اعتبار سے ایک جیسے ہیں۔ ہماری زبان میں ان دونوں میں سے کوئی ایک استعمال ہو سکتا ہے۔ اس لئے دیوناگری کی اصلاح کے سلسلہ میں یہ تجویز پیش کی جا رہی ہے کہ ان میں سے صرف ایک کو باقی رکھا جائے۔ انوناسک یعنی نون غنہ حروف دیوناگری میں پانچ ہیں جن میں سے صرف تین یعنی ण ، न اور म کارآمد ہیں باقی بیکار ہیں۔ جہاں تک آواز کا تعلق ہے ان میں اور न میں کوئی فرق نہیں۔ دیوناگری حروف تہجی میں سے سپرش جو ۲۵ ہیں پانچ گروہوں (ورگ) میں منقسم ہیں۔ ہر ورگ میں دو حرف مخلوط ہیں جنھیں ہا کے ساتھ خلط کر دیا گیا ہے۔ ان میں سے ہر ایک کے لئے جداگانہ شکل رکھی گئی ہے۔ آسان تو یہ تھا۔ جیسا کہ فارسی میں ہے کہ ہائے مخلوط کی تنہا ایک شکل رکھی جاتی اور ہر حرف کے ساتھ اس کو ملا کر لکھا جاتا۔ اس طرح یہ کھ، گھ، چھ، تھ، ٹھ وغیرہ۔ اس طرح حروف کی تعداد بھی کم ہو جاتی اور تحریر میں بھی ہمواری آ جاتی۔ دوسرے حرف یہ در اصل مفرد آوازیں ہیں۔ مفرد آوازوں کے لئے علامات ہونی چاہئیں۔ ہائے مخلوط خود ایک جداگانہ آواز ہے۔ اس کے لئے دیوناگری میں کوئی علامت نہیں رکھی گئی اور اس کی جگہ ان حروف کے لئے الگ الگ علامات مقرر کر دی گئیں۔ جو ہائے مخلوط کے ساتھ ترکیب پاتے ہیں۔ یہ سراسر بے قاعدگی ہے۔ یہ بے قاعدگی

اور مقامات میں بھی برتی گئی ہے۔ مثلاً ک اور ش دو مختلف آوازوں کے لیے ایک حرف رکھا گیا ہے क्ष اور اسی طرح گ اور ی کی مخلوط صورت ہے ज्ञ۔ ان کو حروف ہجا میں شمار نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے کہ یہ الگ الگ دو آوازوں سے مرکب ہیں اور اگر مرکب آوازوں کے لیے بھی علامات مقرر کی جائیں تو پھر اس کی کوئی حد نہ رہ سکے گی۔ یہ حال ہے ان حروف کا جو ناگری میں زیادہ ہیں اور جن کی بنیاد پر اس رسم الخط کی جامعیت کا دعویٰ کیا جاتا ہے۔

اس کے علاوہ بہت سی آوازیں ہماری زبان میں ایسی ہیں جن پر دلالت کرنے کے لیے دیوناگری میں کوئی علامت نہیں۔ مثلاً ف۔ ق۔ عین۔ غین۔ ث۔ ص۔ ط۔ ظ۔ ژ وغیرہ حروف اردو میں کثرت کے ساتھ استعمال ہوتے ہیں۔ ان حروف کو دیوناگری میں لکھنا دشوار ہے۔ ڑ۔ ڈ کے لیے بھی دیوناگری میں کوئی حرف نہیں۔ ان میں سے چند حروف ضرور ایسے ہیں جن کی کمی دیوناگری میں اس طرح پوری کر لی گئی ہے کہ ان کے ہم مخرج حروف پر نقطے لگا دیے گئے ہیں پھر بھی ع۔ ح اور ط وغیرہ حروف ایسے ہیں۔ جن کی کمی پوری کرنا مشکل ہے۔ فارسی ژ اور خ کے لیے بھی دیوناگری میں کوئی حرف نہیں۔ ان کمیوں کے باوجود سمجھ میں نہیں آتا دیوناگری رسم الخط کی جامعیت اور تکمیل کا دعویٰ کیسے کیا جا سکتا ہے۔

ایک اور عجیب و غریب اعتراض فارسی حروف تہجی پر کیا گیا ہے جس کی بنیاد تمام تر سوء فہم پر ہے۔ وہ اعتراض یہ ہے کہ فارسی حروف میں سے ہر حرف ایک خیالی تصویر ہے جس کا تلفظ اس کی صورت سے مطابقت نہیں رکھتا۔ مطلب غالباً یہ ہے کہ ترکیب کی حالت میں حرف کی جو آواز ہوتی ہے۔ مفرد حالت میں وہ آواز نہیں ہوتی۔ مثلاً ع کو عین اور ش کو شین کہتے ہیں۔ یہ دونوں حرف جب دوسرے حروف سے ترکیب پاتے ہیں تو اس وقت ان کی پوری آواز ادا نہیں ہوجاتی

علم اور شرارت میں عین اور شین موجود ہیں لیکن ان کو عینلم اور شنیارت کوئی نہیں پڑھتا۔ یہ اعتراض دو وجہ سے بے معنی ہے۔ اول اس وجہ سے کہ یہ حروف تہجی سے متعلق نہیں بلکہ ان کے ناموں سے متعلق ہے۔ حروف کی آوازیں بہرحال متعین ہیں اور وہی آوازیں ترکیب کی حالت میں ان سے پیدا ہوتی ہیں۔ فارسی خط میں ان آوازوں کے نام بھی رکھ دیے گئے ہیں۔ ان ناموں کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ بسیط آوازوں سے مطابقت نہیں رکھتے۔ دوسرے وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ ان ناموں کا پہلا حرف وہی ہے جس کا وہ نام ہے۔ اور اس سے اس حروف کی آواز نکلتی ہے گرامر میں اس کو زبر کہتے ہیں اور زبر حروف کی آواز پر دلالت کرتا ہے۔ اب سوال یہ ہے ہر حرف کا نام کیوں رکھا گیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ تنہا حرف کا تلفظ نہیں ہو سکتا جب تک یا تو اس کو متحرک نہ کیا جائے یا چند اور حروف ملا کر اس کو نام نہ دیا جائے فارسی میں کچھ حروف متحرک کر کے پڑھے جاتے ہیں جیسے ب۔ ت وغیرہ۔ یہ ملفوظی کہلاتے ہیں اور کچھ کے نام رکھ دیے گئے ہیں۔ انھیں مکتوبی کہتے ہیں۔ یہ گرامر کی باریکیوں کی حد تک ہے ورنہ بچوں کو یہ حروف اس طرح پڑھائے جاتے ہیں۔ اَ۔ بَ۔ تَ۔ ثَ۔ اور اس میں شک نہیں کہ اس طرح پڑھانے اور تلفظ کرانے میں بڑی آسانیاں ہیں۔

باورچی یعنی چہ؟

مسلمان عام طور سے کھانا پکانے والے کو باورچی کہتے ہیں۔ مطبخی بھی وہی ہے لیکن اردو میں نہیں بولا جاتا۔ ہندو باورچی کو نہیں جانتے۔ ان کے یہاں "رسوئیا" ہوتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ باورچی قدیم اردو یعنی کھڑی بولی میں نہ تھا۔ یہ فارسی بولنے والے مسلمانوں کے ساتھ ہندستان آیا اور ہماری زبان میں گھل مل گیا۔ مسلمان کے باورچی خانے میں سب کچھ پکتا تھا۔ قیمہ، کباب، کوفتے، قورمہ وغیرہ تمام انواع واقسام کے کھانے جو گوشت سے تیار کئے جاتے تھے مسلمان کے مطبخ میں باورچی پکاتا تھا۔ ہندو کی رسوئی میں دال بھات، پوری کچوری، ترکاری اور بھاجی کے سوا کچھ نہ ہوتا تھا، اس لئے باورچی ہندو کی رسوئی میں بار نہ پاسکا۔ دو قوموں کی تہذیب و معاشرت کے اختلاف نے ان دو لفظوں کا تبادلہ نہ ہونے دیا۔ باورچی ہندوؤں کے لئے اچھوت بنا رہا۔ رسوئیا کو مسلمان نہ اپنا سکے۔

باورچی نے ملک ملک کی سیر کی ہے اور در در کی خاک چھانی ہے۔

اس نے ایران بھی دیکھا ہے اور روسی ترکستان بھی۔ اس پر ان دونوں ملکوں کی چھاپ ہے۔ لیکن یہ بتانا آسان نہیں کہ اس کی پیدائش کب اور کہاں ہوئی۔ اس میں تین لفظ ہیں اور تینوں قدیم ہیں۔ با، ور، چی۔ "با" ان میں زیادہ قدیم معلوم ہوتا ہے اور یہی بنیادی لفظ ہے۔ اسے ریڑھ کی ہڈی کہنا چاہیے۔ ڈاکٹر عبدالستار صاحب صدیقی کی تحقیق ہے کہ یہ اصل میں "پاک" تھا جس کے معنی ہیں پکا ہوا یا پکایا ہوا۔ اوستا میں اس کا مادہ "پک" ہے اور سنسکرت میں "پچ"۔ اردو "پکنا" بھی اسی سے ہے۔ "بازار" کے شروع میں اور "شوربا" کے آخر میں جو "با" ہے وہ یہی ہے۔ "پاک" کی اصل "پکو" ہے۔ یہ مادہ "پچ" سے اسم مفعول ہے۔ پراکرت میں اس نے "پک" کی صورت اختیار کی۔ اردو میں پہنچ کر یہ "پاک" ہوگیا "پک" پکا کی شکل میں آج بھی ہے۔ جیسے پکا مکان، پکی سڑک، بمعنی پختہ مکان پختہ سڑک۔ موتی پاک میں "پاک" کے معنی ہیں پکا ہوا۔ پگی ہوئی کھیلیں ہم سب بولتے ہیں اور اس کے معنی پکائی ہوئی یا بھنی ہوئی لیتے ہیں۔ اس میں "ک" صورت بدل کر "گ" ہوگیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں سنسکرت "پچ" فارسی "پخ" (پختن میں) اور "پز" (پزد میں) ایک اصل کی شاخیں ہیں۔ چ۔ خ ز۔ یہ آوازیں کسی ایک آواز کے قائم مقام ہیں۔

"ور" کے بارے میں ڈاکٹر صاحب کی رائے ہے کہ وہ فاعلی کلمہ ہے جو زخمہ ور۔ سخنور وغیرہ کلمات میں بھی ہے "باور" کھانا پکانے کے فن کا ماہر یا استاد یعنی کھانا پکانے والا "ور" ڈاکٹر صاحب کے نزدیک "گر" کا بدل ہے۔ سخن ور یعنی سخن گر شعر بنانے والا یا شعر کہنے والا۔ سوداگر کو فارسی میں سوداور بھی کہتے ہیں۔ میرا خیال ہے "ور" وار کا مخفف ہے۔

فارسی "وار" اور اردو "والا" دونوں کا ماخذ سنسکرت پالک، (محافظ) ہے۔ 'و' اور 'پ' میں تبادل تو ہوتا ہی ہے 'ر' اور 'ل' بھی کبھی کبھی ایک دوسرے کے لئے جگہ خالی کر دیتے ہیں۔ پیشہ ور۔ ہنر ور، زخمہ ور اور سخن ور وغیرہ کلمات ہیں "ور" کے معنی محافظ اور مالک کے ہیں۔ اس لحاظ سے "باور" کے معنی کھانا پکانے والا صحیح نہیں۔ ایک بات اور بھی سوچنے کے قابل ہے۔ "با" اگر "پاک" سے تراشا گیا ہے تو اس کے صاف اور سیدھے معنی ہیں "پکی ہوئی چیز" فارسی میں جہاں یہ لفظ استعمال ہوا ہے اس کے یہی معنی ہیں ملاحظہ فرمائیں۔

انگشت با = کوئلے کی آگ پر پکایا ہوا۔
شوربا = پکے ہوئے گوشت کا پانی۔
آردبا = پکا ہوا آٹا۔ اردو میں یہ ارداوا ہے۔
خشک وا = چپاتی یا فطیری روٹی۔

ان مثالوں میں "با" یا "وا" کے معنی پکے ہوئے کے ہیں۔ اس قیاس پر "باور" کے معنی ہوئے پکے ہوئے کھانے والا۔ نہ کہ کھانا پکانے والا۔

اس سلسلے میں یہ بات بھی اہم ہے کہ فارسی میں "باور" بمعنی باورچی دیکھنے میں نہیں آیا۔ کم سے کم میری نظر سے نہیں گزرا۔ اگر "باور" فارسی ہے، اور نسلاً ایرانی ہے تو کسی نہ کسی زمانے میں یہ لفظ ایران میں استعمال ہونا چاہیے ایران میں تنہا "باور" بمعنی باورچی استعمال نہ ہونا اس لفظ کی ایرانی اصلیت کو بہت کچھ مشتبہ کر دیتا ہے۔

"باور" روسی زبان میں ہے اور اس کے معنی "پکانے والا" ہیں۔ یہ روسی الاصل بھی ہو سکتا ہے اور تاتاری یا ترکستانی بھی۔ یہ "پا" (فارسی با۔ فا۔ وا)

اور "ور" سے مرکب ہے۔ "ور" کے متعلق شاہد سہروردی کہتے ہیں کہ یہ روسی مادہ Vareet سے لیا گیا ہے جس کے معنی روسی زبان میں اُبالنے یا پکانے کے ہیں۔ "باور" کھانا اُبالنے والا یا پکانے والا۔ اس اشتقاق کی تائید ایک اور لفظ "سماور" یا "سماوار" سے ہوتی ہے جو اتفاق سے اُردو میں بھی ہے۔ "سماوار" اصل میں "سوماور" تھا۔ "سوم" کے معنی ہیں خود۔ یہ سنسکرت میں "سویم" ہے "سوتہ" بھی اسی سے ہے۔ جو فارسی خود کی اصل ہے۔ "ور" کے معنی ہیں اُبالنے والا۔ سماوار کے نچلے حصے میں آگ روشن ہوتی ہے جس کی وجہ سے پانی یا چائے جو چیز بھی سماوار میں ہو برابر گرم رہتی ہے اس لئے اس کو سماوار یعنی خود پز یا خود جوش کہتے ہیں۔

"چی" ترکی الاصل ہے جس کے معنی ہیں کام یا پیشہ۔ یہ لاحقہ "پاور" یا "باور" میں ترکوں نے اضافہ کیا اور اسے "باورچی" بنا لیا۔ یعنی وہ شخص جس کا پیشہ کھانا پکانا ہو۔ "باور" ترکوں کا اپنا لفظ نہ تھا۔ وہ اس کی بناوٹ سے پوری طرح باخبر نہ تھے۔ انھوں نے شاید اس کے معنی کھانا پکانا سمجھے اور اس پر "چی" بڑھا کر صفت کا صیغہ ڈھال لیا۔ روسی ترکستان سے یہ لفظ اسی شکل و صورت میں ایران آیا اور پھر ایرانی سپاہ کے ساتھ ہندستان چلا آیا۔ اس لئے ایران اور ہندستان میں تنہا "باور" ہے نہ "پاور"۔

خودی میں خدائی

اقبال کا مشہور مصرع ہے۔

تعمیر خودی میں ہے خدائی

"خودی" اور "خدا" سے اقبال نے ان کا مفہوم مراد لیا ہے یعنی ذات مقید (انسان) اور ذات مطلق (باری تعالیٰ) یا اس کی صفت حکمرانی و فرمانفرمائی۔ میری مراد خود لفظ "خودی" اور "خدائی" سے ہے۔ اگر علامہ اقبال کا یہ فرمانا درست تھا کہ تعمیر ذات میں خدائی صفات کے جلوے نہاں ہیں تو میرا یہ کہنا بھی صحیح ہے کہ لفظ "خودی" میں "خدائی" پنہاں ہے۔ ان دو لفظوں کا ماخذ ایک ہے اور ان کی تعمیر ایک مادہ سے ہوئی ہے۔

اقبال کی ہمپائی دشوار ہے اس لئے میری ہمقدمی میں فارسی زبان کے وسیع ذخیرے کو کھنگالئے اور دیکھئے فارسی کا کوئی لفظ ایسا ہے جسے "خود" اور "خدا" دونوں کا ماخذ ٹھہرایا جاسکے۔ لفظ "خو" دونوں میں مشترک ہے اس لئے ہم بے خوف رد و قدح اس کو ان کی اصل قرار دے سکتے ہیں۔

اور یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان الفاظ کا اہم بنیادی جز "خو" ہے۔ "خود" میں تو وہ جوں کا توں موجود ہے۔ خدا سے اس کا "د" تحریر کی حد تک حذف ہو گیا ہے تحریر کی حد تک کا مطلب یہ ہے کہ اس کا تلفظ نہ "خود" میں ہوتا ہے نہ "خدا" میں، "خود" میں صرف لکھا جاتا ہے۔ خدا میں لکھتے بھی نہیں۔

"خو" فارسی زبان کا عام متداول لفظ ہے۔ اس کے اصلی معنی ہیں فطرت حقیقت، جبلت لیکن فارسی میں زیادہ تر عادت اور خصلت کے معنوں میں مستعمل ہے

سنگدلی خوے تست و مہر مراخوی

یہ لفظ آج کا نہیں بہت قدیم ہے۔ اس کے نشان ہند ایرانی عہد میں ملتے ہیں۔ یعنی اس زمانے میں جب ہند و پاکستان کی قدیم زبان ایراں پاستان سے مختلف نہ تھی۔ دونوں ایک دوسرے سے ہم آغوش تھیں۔ فارسی "خو" ہند و پاکستان کی قدیم زبان پراکرت کا "سو" ہے ہر ہند ایرانی اقوام نے ابھی پاکستان و ایران کا رخ نہیں کیا تھا کہ یہ لفظ ان میں رائج تھا اور "خو" اور "شو" کے درمیان کسی آواز سے اس کا تلفظ ہوتا تھا۔ سندھ کے وادی میں پہنچ کر ہند و پاک کے باشندوں نے واضح طور سے "شو" بولنا شروع کیا۔ ایرانی "خو" کہنے لگے۔

بہر حال یہ بات اب قطعیت کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ فارسی "خو" اور ہند آریائی "شو" دونوں کا ماخذ ایک ہے۔ یا یوں کہئے دونوں ایک ہیں تلفظ میں آج البتہ یہ خفیف سا فرق ہے کہ فارسی میں "خ" پر پیش ہے اور "و" معروف۔ سنسکرت میں "س" ساکن ہے اور "و" مخلوط۔ "س" اور "و" کو گڈ مڈ کر کے سنسکرت میں "شو" بولتے ہیں۔ دو لفظوں کو اس طرح

تلفظ کرنا ایرانیوں کو دشوار تھا اس لئے 'د' کے تعلق سے 'خ' کو پیش دے کر انھوں نے اسے ہلکا کرلیا اور 'خو' کہنے لگے۔ معنی میں بھی تھوڑا سا فرق ہے۔ 'خو' کے معنی ہیں فطرت اور عادت۔ 'سُو' کے معنی ہیں خود آپ، یا روح۔

سنسکرت 'سو' پر 'تس' اضافہ ہوا تو 'سوتس' یا 'سوتۃ' ایک نیا لفظ وجود میں آیا۔ جس کے معنی ہیں خود بخود یا آپ سے آپ قدیم فارسی میں اس کے مزاج کے مطابق یہ لفظ 'خوتُ' ہوا۔ پہلوی میں اس کی یہی شکل ہے قدیم فارسی میں 'خ' ساکن تھی اور 'و' مخلوط۔ درمیانی عہد کی فارسی میں 'خ' کو 'و' سے الگ کر کے پیش دیا گیا۔ جدید فارسی میں پہنچ کر 'ت' نے 'د' کا روپ اختیار کرلیا۔ اس طرح قدیم فارسی 'خوتہ' نے بتدریج 'خود' کی شکل اختیار کی۔ 'خود' اور 'سوتہ' میں وہی رشتہ ہے جو 'خو' اور 'سو' میں ہے۔ 'سوتہ' مرکب ہے 'سو' اور 'تہ' سے اس لئے 'خود' کو جو بظاہر مفرد نظر آتا ہے 'خو' اور 'د' سے مرکب ماننا پڑے گا۔

تعمیرِ خود کے بعد 'خدائی' کی منزل آتی ہے۔ لیکن اس سے پہلے ٹھہر کر یہ دیکھ لینا چاہئے کہ لفظ 'خدا' کی قدیم، قدیم تر اور قدیم ترین شکلیں کیا ہیں ان شکلوں کی تعیین اس کی تعمیر میں معاون ہوگی اور 'خود' و 'خدا' کا رشتہ بھی آسانی کے ساتھ دریافت کیا جا سکے گا۔

خدا کی قدیم شکل خُوذای (پازند) ہے۔ قدیم تر خُوتای (پہلوی ساسانی) یا خُوتاذ (پہلوی اشکانی) اور قدیم ترین خُودھای (قدیم فارسی) یا خُوذای (اوستائی) اگر یہ ترتیب صحیح ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ 'خدا' اصل میں 'خودھائی' تھا۔ اس کے بعد 'خوتائی' ہوا۔ پھر خُودائی اور آخر میں خدائی

(خدا) اس میں سب سے بڑی الجھن یہ ہے کہ ایرانی زبانوں اور بولیوں کے ارتقا اور ان کے مدارج کے گہرے مطالعے کے بعد اہل علم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ایران کی قدیم زبانوں کی 'ت' جدید زبانوں کی 'د' ہے۔ جدید فارسی 'باد' اصل میں 'وات' تھا۔ 'د' بدل ہے 'ت' کا۔ اسی طرح برادر قدیم زبان کا 'براتر' ہے۔ پہلوی 'خوتائی' روپ بدل کر 'خودائی' ہو سکتا ہے۔ یہ فارسی زبان کی فطرت کے مطابق ہے۔ لیکن قدیم خودھائی کے 'دھ' کا 'ت' سے بدل جانا ایرانی زبانوں کے عام ارتقائی رجحان کے خلاف ہے۔ یہ ایک طرح سے الٹی گنگا بہانا یا انسان کو بندر کی اصل ٹھہراتا ہے۔ اس لئے زیادہ سہل اور معقول صورت یہ ہے کہ جدید فارسی "خدا" کو براہ راست قدیم فارسی 'خودھائی' سے ماخوذ مانا جائے اور یہ کہا جائے کہ قدیم 'دھ' (ہائیہ) نے فارسی کے مزاج کے مطابق 'د' (وقفیہ) کی شکل اختیار کر لی۔ قدیم فارسی 'خودھائی' سے پہلے کی شکل دستیاب ہو جائے یا اس کا مقابلہ سنسکرت کے ہم معنی الفاظ سے کیا جائے تو اس الجھن کا حل مل سکتا ہے۔ آئیے اس کا سراغ لگائیں۔

خود کی تعمیر کے سلسلے میں ہم اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ یہ لفظ 'خو' سنسکرت 'سُو' اور 'د' (سنسکرت 'ت') سے مرکب ہے 'خدا' (خودائی) میں 'خود' موجود ہے۔ اس لئے 'خدا' سنسکرت 'سوتہ' اور کسی دوسرے کلمے سے مرکب ہوگا۔ مشہور فارسی داں ڈاکٹر پلیٹس یہ دوسرا کلمہ 'دات'[1] (سنسکرت 'دھات') بتاتے ہیں جس کے معنی ہیں باقی اور پائندہ۔ صاحب فرہنگ نظام کا یہ فرمانا صحیح ہے کہ 'خدا' کا مادہ اوستائی 'خوتو' (سنسکرت 'سُوتو')

---

[1] ملاحظہ فرمائیں گرے کی ایرانی صوتیات نیز راقم کا مقالہ "ذ، معجمہ فارسی میں"

ہے جس کے معنی ہیں بخودی خود یعنی واجب الوجود۔ لیکن، خوتو، خدا کا ایک جز ہے۔ اس کا دوسرا جز ذات، ہے۔ ،خُوتو ذات، اولاً خوتاد (بحذف 'د'، د تبدیل 'ت' بہ 'د') ہوا۔ اس کے بعد خوتائی (بحذف 'د' ایک سلسلہ یہ ہے۔ خوتو ذات = خودای (بحذف ت) = خدای = خدا۔ یہ دوسرا سلسلہ ہے۔ پہلوی ساسانی (خوتائی) اور پہلوی اشکانی (خوتاد) کا تعلق پہلے سلسلے سے ہے اور فارسی کا دونوں سے۔

یہاں یہ عرض کرنا بے جا نہ ہوگا کہ مشہور جرمن شرق داں نولدیکے پہلوی 'خوتائی' کو سنسکرت "سوتہ آئی" (سوتہ + آئی = عمر) سے ماخوذ بتاتے ہیں جس کے معنی ہیں اپنی ذات سے زندہ۔

اس لفظی تحقیق کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ لفظ "خدا" فارسی میں اسم ذات کے طور پر مستعمل ہے۔ قدیم ایرانی ادبیات میں اس کی کیا حیثیت تھی؟ کیا ایرانی بھی اسے بطور اسم ذات استعمال کرتے تھے؟

"خدا" اصلاً اسم صفت ہے۔ اور جیسا کہ میں نے عرض کیا۔ اس کے معنی ہیں اپنی ذات سے موجود۔ اوستائی اور پہلوی اشکانی میں خوتائی، حاکم، مالک، قادر، بادشاہ) کے معنوں میں مستعمل تھا۔ ساسانی عہد میں خالق و مالک کل اہُورمزدہ (ہرمزد) کے لئے استعمال ہوا۔ اس کی تصریح فرہنگ نظام کے فاضل مصنف نے کی ہے اور یہ صحیح ہے۔ میں صرف ایک مثال پر اکتفا کروں گا۔ "گجستک ابالش" پہلوی زبان کی مشہور کتاب ہے۔ اس کا ایک جملہ ہے۔

"نخوار (باز) ول لوین ہی (پیش) اوہرمزد (ہرمزد) خوتائی (خدا) بورو ند (ہبرند)" (بحوالہ دستور پہلوی صفحہ ۱۵۰)

اسلامی عہد میں اس لفظ کی اصل اور اس کے بعد کے استعمال کو دیکھ کر اللہ کے لئے مخصوص کر لیا گیا۔ جدید فارسی اور اردو میں اب یہ صرف ذات اللہ کے لئے مستعمل ہے اور یہ استعمال قدیم زمانے سے ہے۔

خدا کے مشتقات اور توابعات بھی ہیں ان پر بھی ایک نظر ڈالتے چلیں ان میں سے خدیو (فتحہ خ و ے مجہول) تو 'خدا' ہی کی ایک شکل ہے اور قریب قریب اتنا ہی قدیم ہے جتنا لفظ 'خدا' ہے۔ یہ اصل میں 'خوتایو' (= خوت + آیو) تھا۔ اس کے معنی ہیں خدا اور بادشاہ۔ لغت فرس اسدی میں ہے:۔

"خدیو نام ایزد است، وشاہاں را نیز خوانند از ملوک کشور چوں
خدیو عجم و خدیو ہند و خدیو ترک و آنچ بدیں ماند۔ فردوسی گفتہ
بیامد بدست خود ورا دیو۔ تبہ گشت و ماند انجمن بے خدیو"

ذیل کے اشعار سے اردو کے استعمال کا پتا لگے گا۔

ہے بخشش خدیو جہاں پرور آب میں
برج قمر ہے ہر صدف گوہر آب میں
(کلیات منیر، ص ۳۱)

خدیو کشور وحشت ہوں اے شاد
انا المجنوں ہے نقش اپنے نگیں کا
(میخانۂ الہام، ص ۸۰)

"خدیوی" (بضم اول و فتح دوم) اس کا معرب ہے۔ یہ مصر کے بادشاہ کا قدیم لقب تھا۔ ترکی میں وزیر کے معنی میں ہے۔

"خداوند" مرکب ہے "خدا" اور "وند" (= ونت) کلمہ صفت سے اس کے حسب ذیل تین معنی ہیں (۱) صاحب / مالک۔

نہ بینی کہ پیش خداوند جاہ
نیایش کناں دست بر بر نہند
(گلستان سعدی)

(۲) بادشاہ، آقا۔

"سوارے از در آمد و بشارت داد کہ فلاں قلعہ را بدولت خداوند کشادیم"

(گلستان سعدی)

(۳) اللہ، خدا۔

"خداوند تعالیٰ ہماں خلق را بر دگمارد تا دمار از روزگارش برآرد"

(گلستان سعدی)

اُردو میں بھی یہ انہی تین معنوں میں مستعمل ہے ۱۔

صاحب اور مالک (اضافت کے ساتھ)۔

مقدور ہمیں کب ترے وصفوں کے رقم کا حقا کہ خداوند ہے تو لوح و قلم کا

(دیوان درد، ص ۱۹)

آقا یا بادشاہ

عرض کرنے لگے کہ ہماری بی بی اس بات کی امیدوار ہیں کہ خداوند کچھ تناول کریں"

(آرائش محفل حیدری ص)

خدا اور اللہ۔ اس معنی میں اس کا استعمال قدیم سے ہے۔

بندا ہیں غواصی خداوند توں دو دکھی کوں کرنہار خورسند توں

(طوطی نامہ ص ۳)

ولیکن تو ہے غفار اے خداوند کرم میں تجھ نہیں ہے مثل و مانند

(دیوان فائز، ۱۹۰)

وہ دولت تو نے دی مجھ کو کہ ہے سب ہیچ آنکھوں میں

خطا پوشا عطا پاشا کرم سازا خداوندا!

(میخانۂ الہام، ۳)

"خاوند" (فتح و) اور خوند (فتح اول و ثانی معدولہ) "خداوند" کی مخفف

صورتیں ہیں۔ انشا نے خاوند اور خداوند دونوں کو یکجا کر دیا ہے۔

کیا ترے سامنے ہو سکتے ہیں وہ کور نمک　　　اپنے خاوند خداوند کے جو ہیں دشمن

(کلیات، ص ۲۷۱)

"خاوند کی ایک شکل "خاوندہ" ہے لیکن شاذ اور قلیل الاستعمال۔

آں خربود کہ آید در بوستان دنیا　　　خاوندہ را بجوید افتد بژاژ خائی

(مولوی بلخی رومی)

خاوند (کسرۂ 'د') بمعنی شوہر اہل اردو کا تصرف ہے۔

"خداوندگار" (خداوند + گار = فاعلی) مالک حقیقی یعنی خدا کے لئے مخصوص ہے کہ وہ خالق خداوند اور فاعل ہے۔

ہر یک حرف میں جس معانی ہزار　　　نہ کوئی پا سکے جز خداوندگار

(نصرتی گلشن عشق، ص ۴۰)

"خدائگاں" (خدا ے + گاں = کلمہ نسبت) کے معنی اسدی طوسی نے "بادشاہ بزرگ" اور "خدیو خداوند" بتائے ہیں اور سند میں رودکی کا یہ شعر پیش کیا ہے۔

خوہاں ہمہ سپاہند او شاں خدائگانست　　　مرنیک بختیم را بر روے او نشانست

اُردو میں تنہا بھی استعمال ہوا ہے اور اضافت کے ساتھ بھی۔ دونوں صورتوں میں اس کے معنی ہیں آقا اور مالک۔

خیمہ ہائے خدائگان امم　　　بعد مٹنے کے جل رہے ہیں تمام

(دیوان ناظم ص ۲۲۴)

دربار رچا رہی تھی خلقت　　　تھا شور خدائگاں سلامت

(مادر ہند شاد ص ۸۰)

"خواجہ" قدیم ایرانی زبان کے ماہر پورداؤد کے نزدیک اوستائی "خو" (= خود) اور لاحقہ چِت (= سنسکرت "چت") بمعنی نیز سے مرکب ہے۔ دوسرے اہل علم پہلوی خوتائی (= خدا) اور کلمہ تصغیر چک (= فارسی چہ) سے مرکب بتلاتے ہیں۔ فارسی اردو دونوں میں آقا اور مالک کے معنوں میں ہے ۔

من و تو ہر دو خواجہ تاشانیم — بندۂ بارگاہ سلطانیم

(گلستان سعدی)

اردو کی مثالیں ملاحظہ ہوں۔

حبیب خدا خواجۂ کائنات — ہوئے اس سے نابود لات و منات

(طوطی نامہ غواصی ص۵)

ہے خواجہ آج نام کے پیچھے یہ سب خراب — غافل کہ کل نشان بھی پایا نہ جائے گا

(تحائم ص۴) ۔

"خوجا" اختصار ہے خواجہ سرا (محل کا محافظ) کا اور خاص ہندی نژاد ہے ۔

"میں نے ایک خوجے کو بھیجا"

(باغ و بہار ص۳۶)

"جس طرح اب درباروں میں سرکاروں میں خوجے محرم راز ہوتے ہیں اس وقت ایسا نہ تھا" (سخندان فارس، دوم ص۱۲۴)

فرقہ اسماعیلیہ کا لقب "خوجا" اس سے مختلف ہے ۔ وہ "خواجہ" بمعنی آقا کا مخفف ہے ۔

"خوزادہ" مرادف صاحبزادہ "خداوندزادہ" (یا خواجہ زادہ) کی تصحیف ہے غالب نے اس کے بارے میں لکھا تھا ۔

"فارسی نہیں، عربی نہیں ۔ اردو روزمرہ تھا مگر فی زمانا متروک ہے "

میر حسن اور میرزا جان طپش کے علاوہ میر مونس نے بھی اسے استعمال کیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ لفظ انیسویں صدی کے آخر تک زندہ تھا۔

چھڑی لے ہاتھ میں رنگین صادی پھرے ہے ہر طرف سادی خوزادی
(گلزار ارم ص ۱۵۷)

یہ سنتے ہی عیار فطرت بھری خوزادی سے جا اپنی کہنے لگے
(بہار دانش ص ۵۳)

یاں میرا ٹھکانا نہیں لے میرے خوزادو لے جا کے مجھے قبر پہ سید کی بٹھادو
(مونس جلد ۳ ص ۱)

"آخوند" جس کی تخفیفی شکل "اخون" اردو میں بہت عام ہے۔ تیمور کے زمانے سے اتالیق اور استاد کے معنوں میں مستعمل ہے۔ ڈاکٹر معین (ایرانی) اور دائرہ معارف اسلامیہ کے مقالہ نگار اسے آ (سابقہ) اور "خوند" (مخفف خداوند) سے مرکب بتاتے ہیں۔ پور داؤد کا خیال ہے کہ "خوند" مخفف ہے "خواند" (خواندن = پڑھنا) کا اور آخوند کے معنی ہیں مرد با سواد و دانا۔

دیکھو آخوند بھی آپہنچے کرو جھک کے سلام یہ وہ ملا ہیں محلے میں ہے جن کا مکتب
(مرقع لیلی مجنوں ص ۱۶)

اُردو میں "اخوند" (الف مقصور) بھی ہے۔

کسی ملاں اور اخوند سے جا کر پوچھیں
(مضامین تہذیب الاخلاق ص ۱۹۴)

"آخون" کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

خال پشت چشم پر اپنے وہ طفل انگشت رکھ
پوچھے ہے آخون جی یہ صاد ہے یا ضاد ہے
(کلیات انشا ص ۱۴۷)

کتب درسیہ کو نہایت تحقیق و تدقیق سے آخون شیر محمد کی خدمت میں اور کتب طب کو اپنے والد ماجد سے تحصیل کیا۔

(تذکرہ اہل دہلی ص۱۵۱)

روداد میز و میزبانی

اردو میں میز، میزبان، میزبانی تین لفظ مستعمل ہیں۔ میز کے معنی ہیں ٹیبل یعنی لکڑی کا تختہ یا پتھر کی سل جس کے پائے ہوں اور جس پر کھانا کھائیں یا سامان نوشت و خواند رکھ کر لکھیں پڑھیں۔ پہلی کھانے کی میز ہے اور دوسری پڑھنے کی۔ میزبان کے معنی ہیں مہمان نواز جس کے یہاں کوئی مہمان آئے اور وہ اس کی خاطر تواضع کرے اور اسے کھلائے پلائے۔ خاطر تواضع، آؤ بھگت، کھلانا پلانا یعنی مہمانداری میزبانی ہے۔ یہاں تک تو بات صاف ہے۔ ہر شخص اس سے اتفاق کرے گا۔ لیکن اس سے آگے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ 'میز' کس زبان کا لفظ ہے اور اس کا 'میزبان' سے کیا رشتہ ہے؟ اس میں بہت سی اُلجھنیں ہیں، پیچیدگیاں ہیں بعض اہل علم کا خیال ہے کہ میز فارسی لفظ ہے اور اس کے وہی معنی ہیں جو اردو میں ہیں۔ میز کے فارسی الاصل ہونے کا ثبوت میزبان اور میزبانی وغیرہ فارسی ترکیبیں ہیں اگر یہ فارسی زبان کا لفظ نہ ہوتا تو فارسی لاحقہ بان (قدیم 'پان' = محافظ) اس پر داخل نہ ہوتا اور 'بان' پر 'ی'، (لاحقہ اسمی) داخل کر کے میزبان سے میزبانی وضع نہ کیا جاتا۔

اس کے مقابلے میں دوسرے اہلِ علم اس کو پرتگالی بتاتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ لفظ اردو میں اس زمانے سے ہے جب پرتگالیوں نے ہندوستان کے جنوبی علاقے پر قبضہ کیا۔ اس سے پہلے یہ لفظ اردو میں نہ تھا۔ اردو کے علاوہ یہ ہند و پاکستان کی قریب قریب ہر جدید زبان میں ہے۔ ان زبانوں میں بھی جو اردو سے قریب ہیں۔ جیسے سندھی، پنجابی، کاشمیری اور ان زبانوں میں بھی جو اردو سے دور ہیں، جیسے، مرہٹی، گجراتی، نیپالی، اڑیا، بنگالی، آسامی اور ان زبانوں میں بھی جو اردو سے دور ہی نہیں اجنبی بھی ہیں۔ جیسے سنہالی اور کوکنی اگر یہ لفظ فارسی سے اردو میں درآمد ہوا تھا تو ان زبانوں میں کہاں سے آیا؟ ظاہر ہے کہ اردو سے آیا اور اس کا امکان کم ہے کہ اردو نے جس کی خود اس کی تاریخ بڑی حد تک دہلی اور ستہ ہے یہ لفظ ان تمام زبانوں کو دیا ہو۔

فارسی میزبان کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ یہ خالص فارسی نہیں۔ میز فارسی میں پرتگال سے آئی اور بان وبانی وغیرہ اس پر بار کر دئے گئے۔ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی فرماتے ہیں:

> "یہ (میزبان) بالکل نیا لفظ ہے۔ خود میز ہی کا وجود قدیم زبان میں نہیں ہے۔ اور اس زمانے میں میز پر کھانا کھانے کا دستور کبھی ایران یا پڑوس کے ملکوں میں نہ تھا۔"
>
> (نوائے ادب، اپریل ۱۹۶۱ء)

اگر یہ صحیح ہے کہ میزبان نیا لفظ ہے اور قدیم ایران کی زبان میں میز کا وجود نہ تھا تو اس کا فارسی الاصل ہونا ختم ہو جاتا ہے اور پھر اس کے سوا کوئی راہ نہیں رہتی کہ میز کو پرتگالی قرار دیا جائے اور یہ کہا جائے کہ اردو اور برصغیر کی دوسری جدید آریائی زبانوں کی طرح فارسی نے بھی اس لفظ کو پرتگالی سے

درآمد کیا۔

لیکن اس سلسلے میں یہ واضح ہونا چاہیے کہ "میزبان" کس حد تک نیا ہے اور فارسی میں یہ کب سے مستعمل ہے۔ کم سے کم یہ بات کسی قدر وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ یہ لفظ برصغیر ہند و پاک کی پیداوار نہیں اور اگر پرتگالی سے فارسی میں آیا ہے تو ہند و پاک کی راہ سے نہیں آیا براہ راست ایران نے پرتگال سے لیا ہے۔ گیارہویں صدی عیسوی میں یہ لفظ ایران میں عام طور سے زبانوں پر تھا۔ مغربی نیشاپوری (متوفی ۱۱۴۷ء) نے جو دور اول کا شاعر ہے میزبان استعمال کیا ہے۔

ازمہمان سن بدو من میزبان او | جہاں نشست وخوان ببر میزبان بنہاد
رسیے ست خوان وکاسہ نہادن زمیزبان | آں روز خوان وکاسہ ہمی مہمان بنہاد

میز کے عام متعارف معنی یعنی ٹیبل (کھانے کی میز) لے کر ڈاکٹر صدیقی فرماتے ہیں کہ قدیم زمانے میں میز کا وجود نہ تھا اور نہ اس زمانے میں کوئی میز پر کھانا کھاتا تھا لیکن میرا خیال ہے کہ میزبان کی میز عام میز سے مختلف ہے۔ لفظ و معنی کے لحاظ سے بھی اور حسب ونسب کے لحاظ سے بھی۔ عام میز کا قدیم زمانے میں وجود نہ تھا یہ درست ہے لیکن میزبان کی میز قدیم زمانے میں بھی تھی اور وہ مُیزد (برزن نبرد) کی شکل میں تھی۔ فرخی :-

هر یک روز معرکہ شاہا غلام تست | چونانک زہرہ کرد زبردست داہ تو
اے میزد اندروں بزار فریدوں | دے میزد اندروں بزار تہمتن
اندر میزد با ہنرد دانش | دندر نبرد با ہمزد بازو

سنائی :-

گر خردشاں چو در نبرد تو نائے | گاہ نالاں چو در میزد تو چنگ

یہ تو ان کا لفظی اختلاف ہوا۔ معنوی اختلاف یہ ہے کہ عام میز کے معنی ہیں مہمان، سامانِ ضیافت اور ٹیبل یعنی کھانے کی میز۔ اس کے مقابلے میں میزبان کی میز (= میزد) کے معنی ہیں مہمانی شراب یا مجلس مہمانی شراب عام میز کا حسب نسب ہنوز مشتبہ ہے۔ یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ فارسی ہے یا غیر فارسی اور فارسی ہے تو میزد کی پیداوار ہے یا کسی اور لفظ یا مادے کی کوکھ سے پیدا ہوئی ہے۔ اور اگر غیر فارسی ہے تو پرتگال سے درآمد ہوئی یا کسی اور مقام سے۔

لیکن "میزباں" کی میز کا حسب و نسب دن کی طرح روشن ہے۔ اس کا سلسلہ پہلوی سے ہوتا ہوا اوستائی اور سنسکرت تک پہنچتا ہے۔ پہلوی میں یہ میزدُ ہے اوستائی میں مَ یَ زْ دَ (یا م ی ژ دَ) اور سنسکرت میں مےدھ (मेध) اصلاً اس کے معنی ہیں فدیہ و قربانی یا دیوتاؤں کی مہمانی، عام مہمانی، اسبابِ ضیافت، مجلس شراب و ضیافت اور میز جس پر سامانِ ضیافت چنا جائے، یہ سب اس کے مجازی معانی ہیں جو بعد میں اصول ارتقائے زبان کے ماتحت وجود میں آئے۔

اس اعتبار سے میزبان کے معنی ہوئے فدیہ و قربانی کا نگہباں یا شراب و طعام کا محافظ۔ یہ لفظ اوستائی میں "میزدوَن" یا "میژدن" تھا۔ فارسی میں میزبان کے ساتھ میزدان بھی ہے۔ سندھی اور گجراتی میں "بان" کی "ب" کو غالباً مہمان کے تعلق سے "م" سے بدل کر میج بان (گجراتی) اور مزمانو (سندھی) کہتے ہیں۔

فارسی کی عام لغات میں "میز" کے ایک معنی مہمان لکھے ہیں۔ مثلاً برہان قاطع میں ہے۔

"میز باثانی مجہول وسکون زاے نقطہ دار بمعنی مہمان است یعنی شخصے کہ بضیافت کسے رود"

لیکن فرہنگِ نظام کے مؤلف آقائے محمد علی ایرانی اسے صحیح نہیں بتاتے ان کا خیال ہے کہ جو اہل علم سنسکرت اور اوستائی زبان نہیں جانتے وہ اس قسم کے تصرفات کے مرتکب ہوئے ہیں۔

"میز در زبان فارسی بمعنی مہمان نیامدہ۔ میزبان دراصل بمعنی ساقی بودہ" (فرہنگ نظام، ج ۵، ص ۲۸۲)

ہو سکتا ہے کہ مہمانی کو غلطی سے فرہنگ نگاروں نے مہمان لکھ دیا ہو۔ یہ غلطی سب سے پہلے شمس فخری صاحب معیار جمالی نے کی۔ اس کے بعد فرہنگ جہانگیری کے مؤلف نے۔ برہان ان کا متبع ہے۔ موید الفضلا میں جو ۹۲۵ھ کی تصنیف ہے میز کے معنی صرف اسباب مہمانی لکھے ہیں۔

بہرحال اس میں شبہ نہیں کہ میز (کھانے کی میز کے معنی میں) قدیم لفظ نہیں۔ اس میں دونوں صورتیں ممکن ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ یہ فارسی الاصل نہ ہو بعد میں پرتگالی MESA سے لیا گیا ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ فارسی میزد کی تخفیف ہو اور مجازاً ٹیبل کے معنی میں استعمال ہو رہا ہو اور سامان ضیافت و مہمانی (مظروف) کی جگہ ظرف یعنی ٹیبل پر بولا جا رہا ہو۔

'میز' (قدیم میزد) کو آقا محمد علی ایرانی سنسکرت مِہ मिह (= رقیق چیز کو بہانا) سے ماخوذ بتاتے ہیں۔ مجھے اس میں شبہ ہے۔ مَہ मह (قدیم مگھ मघ) بمعنی پرستش کرنا اور دھا धा (= رکھنا، کرنا، انجام دینا) سے ترکیب پاکر "میدھ" بنا۔ مگھ بہت قدیم لفظ ہے یہ لاطینی میں MAGNUS تھا۔

نئی پرانی قدریں

ڈاکٹر شوکت سبزواری

ڈاکٹر شوکت سبزواری عہد حاضر
کے نمایاں اردو نقاد ہیں۔ اِن کی
تنقیدیں قدیم و جدید ادبی روایات
کا بہترین امتزاج ہیں اس مجموعے
میں ان کے چودہ گراں قدر مقالے
شامل ہیں جن میں ادب کی نئی اور
پرانی قدروں پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے

قیمت پانچ روپے صرف

مکتبہ اسلوب
۵۲/۳ مسلم لیگ کوارٹرز ناظم آباد۔ کراچی ۱۸

معیار ادب

ڈاکٹر شوکت سبزواری

یہ بھی ڈاکٹر شوکت سبزواری

کے مقالات کا مجموعہ ہے جس میں تفصیل

سے بحث کی گئی ہے کہ ادب کیا ہے اور

ادبی معیار کیسے رہتے ہیں۔ نظری اور

عملی تنقید کا یہ بلند پایہ گنجینہ ہے

قیمت چار روپے پچاس پیسے

مکتبہ اسلوب

۲-۵ مسلم لیگ کوارٹرز ناظم آباد کراچی

افعالِ مرکبہ

مولانا تمنّا عمادی

مولانا تمنّا عمادی دورِ حاضر کے علمائے ادب میں ممتاز مقام و مرتبہ کے مالک ہیں۔ اردو قواعد پر آپکی نظر بہت گہری ہے۔ وہ اردو عربی اور فارسی زبانوں کے بلند پایہ عالم ہیں۔ اس کتاب میں انہوں نے قواعد کے ایک نازک پہلو یعنی افعال مرکبہ پر جامع بحث کی ہے اردو زبان میں اس موضوع پر یہ پہلی کتاب ہے

قیمت دو روپے پچاس پیسے

مکتبہ اسلوب

۵/۲ مسلم لیگ کوارٹرز ناظم آباد کراچی ۱۸

جام سرشار

رتن ناتھ سرشار

رتن ناتھ سرشار کا نام اردو ناول نگاری کی ابجد ہے۔ سرشار کا سرمایۂ صرف "فسانۂ آزاد" ہی نہیں اس نے اور بھی بہت کچھ لکھا ہے جس میں "جام سرشار" کو نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ اس دلچسپ ناول کو بدر عالم ریسرچ اسکالر ترقی اردو بورڈ نے مرتب کیا ہے۔ شروع میں مفصل مقدمہ اور آخر میں طویل فرہنگ شامل کی گئی ہے۔ سرشار کے متعلق چکبست کا معرکہ آرا مضمون بھی اس میں شامل کیا گیا ہے۔

قیمت: نو روپے

مکتبۂ اسلوب

52/3 مسلم لیگ کوارٹرز ناظم آباد کراچی ۱۸

چند اہم کتابیں

ناول اور ادبی تخلیق (تنقید) ڈاکٹر احسن فاروقی

قریب نظر (تنقیدی مضامین) " " "

مکتوبات عبدالحق مرتبہ جلیل قدوائی

اردو زبان کا ارتقا ڈاکٹر شوکت سبزواری

فلسفہ کلام غالب " " "

مجاہد اندلس (عربی ناول کا ترجمہ) مولانا زکریا مائل

مقدمہ شعر و شاعری کا مطالعہ ممتاز حسین

اردو ادب کی تشکیل نو - (ایک ادبی بحث جس میں پچاس مشاہیر ادب نے حصہ لیا ہے)
مرتبہ بدر عالم

بابائے اردو۔ مرتبہ بدر عالم (بابائے اردو کی زندگی اور فن کے بارے میں مستند ادیبوں کے مقالات کا مجموعہ)

شبلی بحیثیت نقاد بدر عالم

مکتبہ اسلوب
۲/۵ مسلم لیگ کوارٹرز ناظم آباد کراچی ۱۸